اور سو، وہ دن اور آج کا دن، دس برس قید کاٹی۔ پرسوں ہی چھوٹا ہوں۔ اب پھر وہی سڑک کا کنارا ہے وہی صبر کا فرش اور صبر کی چھت، سنتا ہوں، ان دس سالوں میں ایک بہت بڑی لڑائی ہو چکی ہے — ہوئی ہوگی — سنتا ہوں لاکھوں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ مارے گئے اور اس کلکتہ کی سڑکوں پر خون کے دریا بہے — بہے ہوں گے — یہ بھی سنتا ہوں کہ دیش آزاد ہو گیا — ہوا ہوگا۔ مجھے تو پتہ نہیں، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ بھیک پہلے سے کم ملتی ہے اور بہت سے رحمدل بابو بھی جب پاس سے گزرتے ہیں اور پیسے دینے کے لیے جیب کی طرف ہاتھ لیجاتے ہیں تو جیب کو خالی پاتے ہیں۔

پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کم سے کم ایک ٹانگ تو ہے۔ رولدو کی طرح بالکل اپاہج نہیں ہوں — شکر ادا کرتا ہوں کہ بانو اب تک زندہ ہے اور میرے پاس ہے — وہ بڑھیا آپ دیکھتے ہیں نا؟ — سامنے بیٹھی اپنے سفید بالوں میں سے جوئیں نکال کر مار رہی ہے۔ وہی بانو ہے — بانو — جس کی رنگت کبھی ایسی تھی جیسے میدا اور شہد، اور جو کبھی کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل کر مسکرا رہا ہو۔ جس کی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں اور جس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو مست کرنے کو کافی تھی — اب اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں اور سارا بدن پیپ رستے ہوئے پھوڑے پھنسیوں سے پٹا پڑا ہے اور بہت دن ہوتے اس کا دماغ جواب دے چکا ہے۔ اب اسے نہ بچپن کے سکھ یاد ہیں اور نہ جوانی کے دکھ۔ نہ تحصیلدار صاحب، نہ خانم، نہ ممدو۔ دن بھر وہ بیٹھی بیٹھی جوئیں مارا کرتی ہے اور آپ ہی آپ نہ جانے کیا بڑبڑاتی ہے۔

مگر شکر اللہ کا — بانو زندہ ہے اور میرے پاس ہے اور میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "پر چھوٹی بی بی تم نے پولیس میں کیوں نہ رپٹ لکھوائی؟ تم تو پڑھی لکھی ہو، تحصیلدار صاحب کو لکھا ہوتا، وہ آکر تمہیں لے جاتے اور اس سور کی چمڑی اُدھیڑ دیتے؟"

وہ بولی ـــ "پولیس میں رپٹ لکھواتی تو اس کے سوا اور کیا ہوتا کہ مجھے زبردستی گھر واپس بھیجدیا جاتا۔ جو مجھ پر گزر چکا تھا، اس کے بعد میں کیا مُنہ لے کر ابا کے سامنے جاتی؟"

مطلب یہ کہ بانو بیچاری ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ ہوتی ہوئی آخر میں گھٹیا رنڈی خانے میں پہنچی تھی۔ ہاں قیمت اسی رات مجھے لے آئی تھی۔ میں نے کہا ـــ "اب تم کوئی فکر نہ کرو۔ جب تک ممدو کے دم میں دم ہے، تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ اب میں تمہیں ایک منٹ بھی اس پاپ کے نرک میں نہ رہنے دونگا۔"

وہ آنکھیں نیچی کرکے بولی "پر ممدو، میں بیمار ہوں۔ بہت بڑی بیماری ہے۔"

اب مجھے ان پھنسیوں کی وجہ سمجھ میں آئی جو بانو کے چاند جیسے مکھڑے کو داغدار بنائے ہوتے تھیں۔ مگر میں نے کہا۔ "کوئی پروا نہیں ہے۔ میں ہی کون سا چھیلا جوان ہوں؟ لنگڑا فقیر ہی تو ہوں ـــ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں نے سُنا ہے۔ اب ہر بیماری کا علاج ہو جاتا ہے۔ چلو میرے ساتھ اسی وقت۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ میں نے کہا ـــ "آجاؤ" بوڑھی مالکن بولی ـــ "ابے او لنگڑے! پانچ روپے دیتے ہیں۔ کوئی رات بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ دوسرا گاہک انتظار کر رہا ہے۔"

پیچھے ایک بھیانک، کالا سا، موٹا تگڑا آدمی نشے میں جھوم رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بانو کا ہاتھ پکڑے ہوتے اور دوسرے سے بیساکھیاں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکی میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اب یہ یہاں نہ رہے گی۔"

اُس کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہوا۔ ٹھیک یاد نہیں۔ شائد نائکہ نے اس آدمی کو اشارہ کیا ـــ وہ بانو کو دبوچنے کے لئے بڑھا ـــ بانو کی چیخ ضرور یاد ہے۔ ایسی چیخ جو پتھر دل کو موم کر دے ـــ نہ جانے کب اور کیسے میری بیساکھی ہوا میں اُٹھی ـــ اور اس شرابی کی کھوپڑی پر گری۔ اگلے پل میں وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور نائکہ چلا رہی تھی۔

"خون! کوئی آؤ۔ دوڑو۔ اس خونی کو پکڑو۔"

اور بانو ڈری ڈری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ممدو! یہ تو نے کیا کیا؟"

اور میں کہہ رہا تھا۔

"چھوٹی بی بی، تم فکر نہ کرو، اس دن میں تانگہ وقت پر نہ لایا تھا۔ یہ اس کی سزا ہے۔"

میں رات کو چپکے سے سونا گاچی پہنچ جاتا تھا ـــــ آپ جانتے ہی سرکار۔ اس بازار میں امیر غریب، نواب فقیر سب برابر ہیں جس کی جیب میں دام ہوں۔ وہ جو مال چاہے خرید سکتا ہے۔ چاہے وہ لولا لنگڑا فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

جاڑے کی ایک رات کا ذکر ہے۔ میں بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا سونا گاچی میں ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ میرے لئے نہیں نئی تھی۔ اکثر میں وہیں آیا کرتا تھا۔ دو روپیہ میں سودا ہو جاتا تھا۔ مگر اس رات کو بوڑھی نائکہ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر بولی ـــــ "کیوں رے لنگڑے پھر آگیا تو؟ پر آج دو روپے سے کام نہیں چلے گا۔! گدڑی میں پانچ روپے ہیں تو ٹھیک ہے نہیں تو راستہ پکڑو۔" ان دنوں مجھے بھیک میں اچھی رقم مل رہی تھی، چالیس کے نوٹ تو میں نے گدڑی کے اندر سیئے ہوتے تھے اور سات آٹھ روپے اور پیسے اس وقت بھی میرے پاس تھے۔ میں نے کہا۔

میں نے کہا لنگڑا ہوں تو کیا؟ پیسہ میرا بھی دو ٹانگ سے چلتا ہے۔ مال دکھاؤ۔ پانچ روپے بھی مل جائیں گے۔"

پر وہ بڑی کھاگ تھی۔ لونڈیا نہیں دکھائی۔ مجھ سے پانچ روپے لے کر مجھے اندر کمرے میں ڈھکیل دیا۔ اندر جا کر میں نے بیساکھیاں تو پھینک دیں اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لونڈیا کوئی سچ مچ نئی معلوم ہوتی تھی۔ سر جھکائے بیٹھی تھی ـــ میں نے کہا ـــ "میری جان صورت تو دکھاؤ ـــ میں لنگڑا ہوں پر تمہیں خوش کر دوں گا۔" مگر اس نے جو گھونگھٹ اُٹھایا تو یقین مانئے سرکار میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

وہ چلائی ـ "ممدو۔"

اور میں نے کہا ـــ "چھوٹی بی بی ـ تم کہاں؟"

وہ بولی ـــ "ہاں ممدو، یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔ تمہاری ٹانگ کیا ہوئی؟"

میں نے کہا "اور یہ میری قسمت کا پھیر ہے۔"

وہ رو رہی تھی ـــ میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ تو بانو مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے دھیان سے دیکھا ـــــ ان تین برسوں میں اس کا وہ رنگ روپ نہ رہا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر میں تیس پینتیس برس کی لگتی تھی۔

آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے تھے، پاؤڈر سُرخی کے ہوتے ہوئے بھی رنگت پیلی تھی۔ آدھی اتنی ہو گئی تھی کہ باہوں کی ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ منہ پر کئی جگہ عجیب سی پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں۔ جب آنسو کچھ دیر کو تھمے تو اس نے مجھے اپنا حال بتایا۔

جس ڈرائیور کے ساتھ وہ بھاگی تھی وہ بڑا بدمعاش نکلا ـــــ کلکتہ لا کر دو تین مہینے تو بانو کا زیور بیچ بیچ کر خوب عیش کیا۔ پھر جب گزارے کی کوئی صورت نہ رہی تو اُس نے کرم پر مجبور کیا۔ اور ایک رات کو اُسے ایک سیٹھ کے ہاتھ بیچ کر غائب ہو گیا۔

میں صرف سات روپے تھے۔ چھ روپے تو ہرنام نے چار دن کی مزدوری کے لئے کر دیئے تھے۔ اور ایک روپیہ میرے پاس پہلے کا بچا ہوا تھا۔ ہرنام نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ویونگ ماسٹر سے بات چیت کی تھی کہ کارخانے کی طرف سے میری کچھ مدد کی جاتے مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ اناڑی مزدور اگر اپنی بھول سے اپنی ٹانگ اور ہماری مشین توڑ ڈالے، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مل مالکوں کی طرف سے ہرجانے ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ خیر میں نے دل کو سمجھایا کہ خدا تیرے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ گیرامت۔ جب میں بستی آیا اور گاڑی سے اتر کر دیوار کا سہارا لیتا ہوا اپنی کوٹھری تک پہنچا تو رحمت، منگو، اور بہت سے مزدور مجھے دیکھنے آتے۔ تھوڑی دیر تو سب چُپ چاپ کھڑے میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھتے رہے؟ اور ان کو اس طرح سے گھورتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے غصے کا پارہ ایک دم تیز ہوگیا۔ اور میں چلایا ——" یہاں کھڑے۔ کھڑے کیا گھورتے ہو! کیا پہلے کبھی ایک ٹانگ کا آدمی نہیں دیکھا؟ نکلو یہاں سے "۔ اس پر وہ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ پر رحمت وہیں کھڑا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "ممدو! یہ خدا نے تجھے ہڑتال توڑنے کی سزا دی ہے"۔ بس یہ کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ یہ سُن کر مجھے ذرا سا بھی غصہ نہ آیا! صرف میں نے سوچا۔ کتنا بدقسمت ہے یہ رحمت اسے صبر کی قدر ہی نہیں معلوم! اور پھر کون جانتا ہے؟ شاید خدا ہڑتال توڑنے والوں ہی سے خوش ہو اور اس لئے اتنے سخت حادثہ کے باوجود میری جان بچ گئی۔ ورنہ سب ہڑتال توڑنے والوں کی ٹانگیں ٹوٹنی چاہیے تھیں۔

"ہاں تو، سرکار، صبر کے امتحان میں میں پورا اُترا۔ جب ربڑ یا لکڑی کی ٹانگ نہ ملی تو میں نے صبر کی ٹانگ لگوالی اور کباڑی کے یہاں سے یہ دو بیساکھیاں لے لیں اور اس دن سے اُن کے ہی سہارے کُود پھاند کر چل لیتا ہوں۔ جب محنت مزدوری ممکن نہ ہوئی تو بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ روزی دینے والا تو خدا ہے۔ انسان تو اُس کا ذریعہ ہے۔ پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے میں کہاں کی شرم؟ اصل میں تو ہم خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے سرکار کہ بھیک میں ڈیڑھ دو روپے روز سے زیادہ کما لیتا ہوں۔ پھر کارخانے میں جان کھپانے سے حاصل؟ —— اور ہاں، جب ہرنام بیوی بیاہ کر لے آیا اور اُس نے مجھے میری ہی کوٹھری سے نکال دیا تب سے میں نے یہاں سڑک کی پٹڑی پر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ چھتیں اور فرش، بنگلے اور کوٹھیاں، اور پلنگ کُرسیاں —— یہ سب تو بے کار کے چونچلے ہیں۔ صبر کی چھت اور صبر کا فرش ہو تو سڑک کا کنارہ بھی محل بن جاتا ہے۔

کتنے ہی مہینے میں نے صبر سے بھیک مانگ کر بتا دیئے ہیں۔ مجھے اس فقیری کی زندگی میں مزہ آنے لگا۔ نہ محنت، نہ مزدوری، نہ مالکِ مکان کو کرایہ دینا، نہ چولہے چکی کا بکھیڑا، فقیری کی زندگی ہی اصل میں آزاد زندگی ہے۔ میں اور تمام بندھنوں، ضرورتوں اور جھگڑوں سے تو آزاد ہوگیا۔ پر کٹی ہوئی ٹانگ ہونے پر بھی ایک شیطانی ضرورت اب بھی جاڑے کی راتوں میں تنگ کرتی ہے۔ جب میرے پاس پانچ دس روپے جمع ہو جاتے تھے

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چلی جا رہی تھی، میں نے بجلی کی فرکی دبا کر، گھما کر مشین کی رفتار اور تیزی کر دی۔ اس تیز رفتار میں مجھے مزہ آ رہا تھا۔ کپڑا اب اور تیزی سے بُنا جا رہا تھا اور اسی تیزی سے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہ سَن کس کس دیش کی سیر کرے گا؟ کتنا اچھا ہوتا کہ اسی کپڑے میں لپٹ کر میں بھی......

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ — مشین کے گیت میں مجھے ایک بے سُری سی آواز سنائی دی۔ سامنے دیکھا تو تانے کا تار ایک جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ دھاگے کی نلی ادھر سے اُدھر بیکار گھوم رہی تھی مگر بنائی نہیں ہو رہی تھی — ہمارے کرگھے پر جب کبھی اُون کا دھاگا ٹوٹ جایا کرتا تھا تو میرا باپ دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک مروڑی دے دیتا تھا۔ بس وہ پھر جڑ جاتے اور تانے بانے کا سلسلہ پھر جاری ہو جا— ایک دم میرے دماغ میں بھی یہی آیا کہ ممدو، تو بھی یہی کر اور یہ ذرا بھی نہیں سوچا کہ یہ بجلی سے چلنے والی مشین ہے — بندو جولاہے کا کرگھا نہیں ہے۔

بنا مشین بند کئے میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹوٹے ہوئے سرے پکڑنے چاہے مگر میری باہیں چھوٹی تھیں اور مشین لمبی تھی — ایڑیاں اٹھا کر مجھے کافی آگے کو جھکنا پڑا۔

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ مشین چلی جا رہی تھی۔ جیسے ہی دھاگے کا ٹوٹا ہوا سرا میرے ہاتھ میں آیا، میرے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے اور میں منہ کے بل مشین کے تنے ہوئے کپڑے پر آ رہا۔ کھٹا کھٹ کھٹ۔ مشین چل رہی تھی اور اس کے ساتھ مجھے اندر گھسیٹ رہی تھی۔ کپڑا لوہے کے رولر پر لپٹا جا رہا تھا، اور میں مشین کے فولادی جبڑے کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس وقت تو سرکار، مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ گئی — مرتا کیا نہ کرتا۔ ہاتھ پاؤں مارے مگر کپڑے کے جھول میں اتنا اُلجھ گیا تھا کہ کسی طرح نکلنے کی صورت نہ نکلی اور ایک بار جو میں نے ٹانگوں کو زور سے جھٹکا دیا تو بایاں پاؤں اس کمبخت مشین کے نہ جانے کس پُرزے میں پھنس گیا۔ اب میں لاکھ چھڑانا چاہتا ہوں۔ مگر پاؤں نہیں نکلتا — بلکہ میں گھسٹا چلا جا رہا ہوں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور کتنے ہی مزدور میری طرف دوڑے — ویونگ ماسٹر کی آواز سنائی دی — "بجلی بند کرو — بجلی بند کرو۔" مگر ابھی کوئی بٹن نہ دبا پایا تھا کہ کھٹاک سے آواز آئی۔

اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی بھیانک ہاتھ نے میری ٹانگ کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں اور پھر میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک مفت ہسپتال میں پڑا تھا اور میری داہنی ٹانگ کٹ چکی تھی۔ یہ دیکھ کر پہلے تو مجھے دکھ ہوا، مگر پھر میں نے سوچا۔ خدا شکر ہے۔ ٹانگ ہی گئی جان تو بچ گئی اور اگر دونوں ٹانگیں چلی جاتیں، تو کیا ہو سکتا تھا۔ آج میں بھی اسی لُنجے رولدو کی طرح باہنوں اور کولھوں کے سہارے گھسٹ گھسٹ کر چلتا——

ہاں، تو سرکار پندرہ دن کے بعد جب میں اس ہسپتال سے نکلا تو میں لنگڑا ہو چکا تھا۔ میری جیب

بار پھر بھی ہم پر پھینکے گئے اپر میں نے کہا۔
”جو بھی ہو، ہڑتال کرکے بھوکا مرنے سے بہتر ہوگا“

ہاں، تو میں کارخانے میں ہونے کو تو ہو گیا۔ مگر مجھے کام آتا ہی نہ تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہرنام نے
ویونگ ماسٹر سے جھوٹ کہہ دیا تھا کہ میں نے اُسے کام سکھا دیا ہے۔ اب یہ ایک مشین سنبھال سکتا ہے۔
کارخانے والوں کو ان دنوں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ مشینوں کو کسی نہ کسی طرح چالو رکھیں،
تاکہ اخباروں میں یہ اعلان کر سکیں کہ ہڑتال فیل ہو گئی اور کارخانے میں کام ویسے کا ویسا ہی ہو رہا ہے۔ ہرنام
نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو تو یہی ظاہر کیجیو کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ ویسے میری مشین اس کے
پاس ہی تھی۔ میں برابر اس کو دیکھتا رہتا اور جو کچھ وہ کرتا وہی میں کرنے لگتا۔ اس نے بٹن دبایا میں نے
بھی دبا دیا۔ اُس نے تیل کی کپی لے کر پرزے میں تیل دیا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اُس نے مشین تیز کی، میں نے
بھی کی۔ تین دن تو میں نے ایسے ہی گزار دیے۔ پگار تو ہفتہ کے ہفتہ ملنے والی تھی مگر ”اسٹرائک الاؤنس“ کا
روپیہ روز مل جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اپنی بلا سے۔ اسٹرائک عمر بھر چلے۔

اتنے میں مجھے مشین کے کام کا تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو گیا تھا — کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا۔ کام
تو سارا مشین کرتی تھی۔ ہمیں تو صرف بٹن دبا کر مشین چالو کرنا اور اس کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ چوتھے دن ہرنام کی مشین کا
پرزہ بگڑ گیا اور اُسے کہیں دوسری مشین پر لگا دیا گیا — ”کیوں ممدو، سنبھال لے گا نا؟“
میں نے کہا —— ”تو فکر نہ کر، اس میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگے ہیں۔“ پھر بھی وہ جاتے جاتے لوٹ
کر آیا اور کہنے لگا۔
”ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کیجیو۔“

”ہاں تو وہ دوسری مشین پر چلا گیا۔ اب اُس کی مشین اور کتنی مشینوں کی طرح بیکار کھڑی تھی۔ مگر میری
مشین کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ کام کر رہی تھی۔ کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ، مشین چل رہی تھی اور میں خدا کی قدرت پر عش عش
کر رہا تھا کہ واہ واہ! ان ولایت والوں کو کیا عقل دی ہے۔ انسانوں کا کام مشینوں سے لیتے ہیں۔ جب ہم
کمبل بنتے تھے تو میرا باپ اون کو دھو کر اور دھن کر اس میں سے میل نکالتا تھا۔ پھر میری ماں چرخے پر اون
کاتتی تھی۔ پھر ہم سب بھائی تانا تیار کرتے تھے۔ پھر کرگھے پر میرا باپ کمبل بنتا تھا اور اس طرح سب کی کئی
دن کی محنت کے بعد نو گز لمبا کمبل تیار ہوتا تھا۔ تانا بانا ہو رہا تھا، کپڑا بنا جا رہا تھا، لپیٹا جا رہا تھا اور کتنی تیزی
کے ساتھ میرا باپ اور ماں اور سب بھائی اور پڑوسی، بلکہ مظفر نگر کے سارے جولاہے مل کر ایک مہینے میں
اتنا کپڑا نہیں بُن سکتے تھے جتنا یہ مشین ایک گھنٹے میں بُن رہی تھی —— واہ واہ! سبحان تیری قدرت ——
اب اس کپڑے کی بوریاں بنیں گی۔ ان بوریوں میں دھان اور گیہوں اور دالیں اور نمک مرچ بھر کر دوسرے
ملکوں کو بھیجا جائے گا۔

سالے نے تین تین تو عورتیں رکھ چھوڑی ہیں جن میں سے ایک ولایتی میم بھی ہے۔"

"ہاں تو جب یونین والوں نے ہڑتال کا اعلان کیا تو ان دونوں نے تو کام پر جانا بند کر دیا۔ مگر ہرنام سویرے اٹھ کر چپ چاپ کام پر چلا گیا۔ بستی میں خبر فوراً پھیل گئی کہ ہرنام کام پر گیا ہے۔ اور بھی پچاس ساٹھ مزدور ایسے تھے جو ہڑتال میں شامل نہیں تھے۔ مگر رحمت اور منگو کو ہرنام کے جانے پر بڑا افسوس ہوا ــــ رحمت تو کہنے لگا۔ "نہیں نہیں ایسے ہی گھومنے گیا ہوگا"ــــ مگر شام کو جب ہرنام لوٹا تو اس کے کپڑوں پر لگے کالکھ کے دھبوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کام کر کے آ رہا ہے۔ منگو تو لگا ماں بہن کی گالیاں دینے۔ مگر رحمت نے دھیرے سے پوچھا۔ "کیوں ہرنام یہ ٹھیک ہے؟"ــــ یہ سن کر ہرنام چلا کر بولا ــــ ہاں ہاں گیا تھا کام پر۔ کر لے جس کا جو جی چاہے۔"

رحمت اب بھی دھیرے ہی سے بولا ــ "اچھا یہ بات ہے؟"ــــ پھر وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا اور وہاں سے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں ہرنام کا بستر، ٹین کا ٹرنک اور دوسرا سامان تھا۔ بڑی خاموشی سے اس نے وہ سب چیزیں برآمدے کے باہر میدان میں پھینک دیں اور ایک لفظ نہ بولا۔ چپ چاپ جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور حقہ گڑگڑانے لگا۔ ہرنام کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بانہیں چڑھا کر رحمت کی طرف لپکا۔ مگر بیچ میں منگو آ گیا ــــ کالا کلوٹا منگو تھا تو دبلا پتلا سا، مگر اس کے ہاتھوں میں بڑی طاقت تھی اور بڑا پھرتیلا بھی تھا۔ ہرنام کو روک کر اسے ایک لنگڑی جو دی تو چاروں خانے چت زمین پر آ رہا۔ اتنے میں بستی بھر کے مزدور وہاں جمع ہو گئے۔ ہرنام سے سبھی جلے ہوتے تھے۔ اسے گرتا دیکھ کر سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اب جو وہ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا اٹھا، تو دیکھا کہ چاروں طرف سے وہ گھرا ہوا ہے۔ اگر وہ رحمت اور منگو پر ایک بار بھی وار کرتا ہے تو سارے سارے اس پر جھپٹ پڑیں گے ــــ اس لئے اس بیچارے نے اپنی چیزیں اکٹھی کر کے میری کوٹھری کے سامنے برآمدے میں رکھ دیں۔ پھر میرے پاس آ کر بولا۔

"کیوں ممدو، تیرے یہاں آ جاؤں؟ کوٹھری کا سارا کرایہ آج سے میں دے دیا کروں گا۔"

"سرکار، اندھے کو کیا چاہیئے۔ دو آنکھیں۔ میں ٹھہرا بیکار۔ مجھے تو پہلے ہی فکر تھی کہ ہر مہینے کرایہ کیسے دوں گا؟ سو میں نے کہا "تو بے کھٹکے یہاں آ جا ــــ ہرنام میں نہیں ڈرتا کسی سے۔" وہ جو کہتے ہیں کہ کر بھلا تو ہوگا بھلا، سو وہی ہوا۔ میں نے ہرنام کو رہنے کے لئے جگہ دے دی اور اس نے اگلے ہی دن مجھے کارخانے میں نوکر رکھا دیا۔

ہڑتال کی وجہ سے مالک ہر کسی کو رکھنے کے لئے تیار تھے چاہے اسے کام آتا ہو یا نہیں۔ بس دو ہاتھ دو ٹانگیں ہونی چاہیئے۔ سو میں بھی ڈیڑھ روپئے روز پر نوکر رکھ لیا گیا ــــ اوپر سے روپیہ روز "اسٹرائک الاؤنس" ملتا تھا۔ اور ملنا بھی چاہیئے تھا۔ ہم پچاس ساٹھ آدمی جان پر کھیل کر کارخانہ چلا رہے تھے۔ روز ہمیں گالیاں اور دھمکیاں سہنی پڑتی تھیں ــــ بستی کے دوسرے مزدوروں نے ہمارا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ دو

پورے ڈیڑھ مہینے کھاٹ پر پڑا رہا۔ جب بخار نے پیچھا چھوڑا تو بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ رکشا چلا سکوں۔ جمع جتھا جو کچھ تھا، وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نمونیا سے مرا نہیں۔ سوچا زندہ تو ہوں۔ لعنت بھیجو رکشا پر — چلو اور کوئی کام کرو — کلکتہ میں جہاں خدا تیس لاکھ کو روزی دیتا ہے۔ کیا مجھے ہی نہ دے گا؟ اللہ پر بھروسہ کئے بیٹھا رہا۔

میری برابر والی کوٹھری میں اپنی ہی طرح کئی مزدور رہتے تھے۔ ایک تو ہرنام تھا، بلند شہر کا۔ باپ نے ساری بانداد شراب پی پی کر اڑا دی تھی۔ بیٹے کو پڑھایا لکھایا نہیں۔ سو وہ اب کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔ ایک بنارس کا چمار تھا منگو، ایک پیلی بھیت کا مسلمان تھا۔ رحمت خاں۔ اور مزا یہ کہ تینوں میں گہری دوستی تھی اور تینوں ایک ہی ساتھ رہتے تھے۔ میں نے ایک بار اکیلے میں رحمت خاں سے کہا بھی کہ تم اِن کافروں کے ساتھ رہتے ہو — ایمان دھرم کا بھی کچھ خیال نہیں؟ وہ گالی دے کر بولا۔

" ارے ایمان دھرم کی ایسی تیسی۔ ہمارا دھرم تو مزدوری ہے مزدوری۔

ان تینوں نے مجھ سے کہا۔ "چل تجھے اپنے کارخانے میں نوکری دلاتے دیتے ہیں۔ دو روپے روز ملیں گے۔" میں نے سوچا چلو اچھا ہے۔ رکشا کھینچ کھینچ کر پھیپھڑے کھوکھلے کرنے سے تو کارخانے کی مزدوری ہی اچھی رہے گی۔ اگلے دن وہ مجھے اپنے ساتھ کارخانے لے گئے جہاں پٹ سن کی بُنائی ہوتی تھی — اور مزدوروں کے ٹھیکیدار کو جسے سب سردار، سردار کہتے تھے۔ میری طرف سے پانچ روپے رشوت بھی دے دیئے۔ پر مجھے نوکری بھی نہ ملی — ویونگ ماسٹر بولا "آج کل مندا ہے۔ اس لئے ہم تو پہلے سے بہت مزدوروں کو چھٹی دینے کی سوچ رہے ہیں۔ نیا آدمی کہاں سے رکھ سکتے ہیں؟" اور میری جانب اشارہ کر کے بولا — "پھر اسے ہمارے جیسے کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں ہے۔ کتنے ہی دن تو اسے کام سیکھنے میں لگ جائیں گے۔" میں واپس آگیا اور پھر رکشا والے مالک کے پاس جانے کی سوچنے لگا۔ پر خدا کا کرنا کیا ہوا، اُسی دن کارخانے میں ہڑتال ہو گئی — ہوا یہ کہ مالکوں نے کہا۔ "بازار میں مندی ہونے کی وجہ سے ہمیں یا تو بہت سے مزدوروں کو چھٹی دینی پڑے گی یا اُن کی تنخواہ کم کرنی پڑے گی۔ اس لئے ہم نے دو روپیہ سے گھٹا کر ڈیڑھ روپیہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مزدوروں نے جب یہ سُنا تو اُن میں کھلبلی مچ گئی۔ ہڑتال کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے رحمت خاں اور منگو دونوں کو ہڑتال کی باتیں کرتے سُنا تو بولا۔

"تم لوگ پاگل ہو گئے ہو؟ — آٹھ آنے کے لالچ میں ڈیڑھ روپے کی آمدنی میں لات مار رہے ہو؟ ارے بھائی جو ملتا ہے اُسی پر صبر کرو — خدا کی مرضی ہوگی تو مزدوری بڑھ جاتے گی۔"

مگر ان دونوں پر تو ہڑتال کا بھوت سوار تھا۔ رحمت خاں بولا — "اگر اس وقت ہم نے چپ چاپ پگار کٹوائی، تو یہ مالک کل ہمارے سینے پر سوار ہو جائیں گے سینے پر —" اور منگو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا — اگر بازار میں مندی ہو رہی ہے تو یہ سالا مالک پانچ پانچ موٹروں میں سے دو ایک کیوں نہیں بیچ دیتا؟

پاس چلا جاؤں، ذرا بمبئی کلکتہ کی سیر کروں ـــ مگر گھر والوں کو کس پر چھوڑوں؟ اور پھر ریل کا کرایہ کہاں سے لاؤں؟ اِسی سوچ وچار میں کئی برس گزر گئے۔ اور ہم مظفر نگر ہی میں محنت مزدوری پر صبر کرتے رہے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اپنا بھی کلکتہ جانے کا ایک موقعہ نکل آیا۔ ہوا یہ کہ اپنے محلّے میں ایک نتھے نان بائی تھا۔ اُس کا لونڈا رحمت ایک برس سے دلّی میں کام کے لئے گیا ہوا تھا۔ وہ جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل جنٹلمین بنا ہوا ہے۔ جاپانی سلک کی قمیض، گلے میں سونے کے بٹن۔ بال انگریزی فیشن کے بنے ہوئے۔ میرے بچپن کا یار تھا۔ میں نے کہا۔ "کیوں بے رحمت! کہاں سے گڑا خزانہ مل گیا؟" بولا ـــ "ہم تو پانی سے سونا بناتے ہیں۔" میں سمجھا سالے کو کیمیا بنانے کا نسخہ ہاتھ آگیا ہے۔ پر اُس نے بتایا کہ اُس نے ریل میں سوڈا لیمن بیچنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی سے دو ڈھائی سو روپیہ مہینہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کہنے لگا۔ "تیس روپیہ مہینہ تو میں اپنے نوکر کو دیتا ہوں جو ہر اسٹیشن پر سوڈا لیمن کی آواز لگاتا ہے۔ اور سارے کلکتے اور بمبئی کی سیر کرتے ہیں۔ وہ الگ۔" یہ سُن کر میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا۔

"بھیّا رحمت ایک بار کلکتہ مجھے بھی دکھا دے۔"

سو سرکار، سوڈا لیمن بیچتے بیچتے میں بھی کلکتہ پہنچ ہی گیا۔ میں نے تو پہلے دلّی بھی نہیں دیکھا تھا۔ کلکتہ دیکھ کر تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی چوڑی صاف سڑکیں یہ موٹریں، بس، ٹرامیں، میں نے پہلے کہاں دیکھیں تھیں؟ میں نے سوچا رحمت کے سوڈا لیمن پر لعنت بھیجو اور یہیں رہ پڑو۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پندرہ برس ہو گئے، پہلے تو کئی مہینے تک رکشا چلاتا رہا۔ دن میں کبھی کبھی دو ڈھائی روپے بھی مل جاتے تھے۔ میں نے سوچا یہ کام تو بڑا اچھا ہے۔ مہینہ میں ساٹھ ستر روپے مل جاتے تھے۔

مزدوروں کے محلّے میں ایک کوٹھری لے لی تھی۔ دس روپیہ اس کا کرایہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی دس پندرہ بیوی کو بھی بھیج دیتا تھا مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے سال کے بعد میں نے کچھ نہیں بھیجا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ اُس پر کیا گزری ـــ جوان آدمی تھا سرکار، اور پھر کلکتہ میں روپیہ دو روپیہ میں سوناگاچی میں نئی مل جاتی ہے، تو پھر ہزار میل دُور بیٹھی بدصورت بیوی کو روپیہ بھیجنا تو بڑا مشکل ہوتا ہے! اور پھر دارو پینے کی عادت بھی پڑ گئی تھی سرکار۔ آپ کہیں گے کہ یہ آدمی بڑا آوارہ بدمعاش ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ دن بھر گدھے کی طرح رکشا کھینچنے کے بعد شام کو غم غلط کرنے کے لئے تھوڑی سی دارو ضرور چاہئے اور پھر دارو کے بعد جانے کیسے پھر آپ ہی آپ قدم سوناگاچی کی طرف چل پڑتے ہیں۔

ہاں تو سال بھر رکشا چلائی، کوئی سو سوا سو روپے آڑے وقت کے لئے جمع بھی کر لئے ـــ پر یہ پتہ نہ تھا کہ آڑا وقت اتنی جلدی آپہنچے گا۔ برسات کے دنوں بھیگ کر بخار چڑھا۔ بُخار سے نمونیہ ہو گیا ـــ ڈاکٹر نے کہا۔

"رکشا کھینچتے کھینچتے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں یہ کام چھوڑ دو۔"

وہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیئے گئے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر تو بڑا حاکم ہوتا ہے۔ سرکار سے تنخواہ بھی کافی ملتی ہے جبھی تو خان صاحب نے سہارنپور جاتے ہی موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ انہوں نے موٹر لے لی اور ڈرائیور رکھ لیا؟ ـــ تو یہ بات ہے سرکار، اچھا ہونے کے دو چار مہینے بعد میں لالہ گردھاری لال آڑھتی کی غلّہ کی دوکان پر اناج کی بوریاں ڈھونے پر نوکر ہو گیا۔ ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ سہارنپور سے کوئی زمیندار ٹھاکر نواب علی ملنے آئے تو کہنے لگے ـــ "لالہ سُنا تم نے تمہارے یہاں جو تحصیلدار قدرت اللہ خاں تھے نا۔"

یہ نام سُن کر میرے تو کان کھڑے ہو گئے اور بوریوں کے پیچھے سے دھیان دیکر سننے لگا ـــ لالہ بولے۔ "ہاں، ہاں۔ وہ تو اب تمہارے یہاں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں۔ سُنا ہے اب تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ موٹر بھی رکھ لی ہے۔"

ٹھاکر نواب علی بولے ـــ "ارے لالہ، یہ موٹر ہی کی برکت ہے۔ موٹر کی اور نئی تعلیم کی۔"

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ لالہ بھی بولے ـــ "ٹھاکر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

ٹھاکر صاحب نے کہا ـــ "لالہ یہ کہہ رہا ہوں کہ خان صاحب قدرت اللہ خاں کی لونڈیا اُن کے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔" میں نے اپنے دل کو لاکھ سمجھایا کہ اب تجھے خوش ہونا چاہیئے کہ خانصاحب کے ہنٹر اس سالے ڈرائیور کی پیٹھ پر پڑیں گے۔ تو تو صاف بچ گیا۔ مگر جھوٹ کیوں بولوں سرکار، سچی بات یہ ہے کہ دن بھر مجھ سے ٹھیک سے کام نہ ہو سکا اور اس رات جب ماں نے روز کی طرح پھر بندی جولاہی سے میرے بیاہ کی بات چھیڑی، تو میں نے بھی کہہ دیا ـــ "اچھا ماں، جیسی تیری مرضی۔" صبر عجیب چیز ہے سرکار! انسان اپنی قسمت پر صبر شکر کرنا چاہے تو پھر سڑی فٹ پاتھ کے پتھر بھی مخمل کے گدے بن جاتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں بندی شیدی جولاہی بھی بانو جیسی حسین دکھائی دیتی ہے۔ سال بھی نہیں ہوا تھا، شیدی نے ایک بچہ جن دیا۔ اگلے برس ایک بچی۔ پھر تو سرکار، نمبر لگ گیا۔ چھ برس میں پورے پانچ بچے تین لڑکیاں دو لونڈے۔ پر خدا کی مرضی میں کس کو چارہ ہے؟ اولاد بھی اسی کی دین ہے۔ جب چاہے واپس لے لے۔ ایک بچہ تو پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ ایک لونڈیا دو برس کی ہو کر نمونیا سے ہلاک ہو گئی۔ اب ایک لونڈا اور دو لونڈیاں رہ گئیں ـــ پر اپنے سے اتنی اولاد کو پالنا بھی مشکل تھا۔ گھر کا سارا بوجھ اب مجھ پر ہی تھا۔ بابا کی کمر تو کھاٹ کو لگ گئی تھی اور ماں کو آنکھوں سے سجھائی دینا بہت کم ہو گیا تھا بیچاری دن میں بھی ٹاک ٹوئیاں مارتی تھی۔ میرا بڑا بھائی ایک سال پہلے بمبئی جو گیا تھا، تو پھر لوٹا نہیں تھا۔ نہ کوئی خط ہی بھیجا نہ روپیہ۔

پہلے سُنا تھا، کسی کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ پھر سُنا کسی فلم کمپنی میں چوکیدار ہے۔ بڑی بڑی خوب صورت ایکٹریسوں کی موٹروں کے دروازے کھولتا ہے ـــ میرا بھی کئی بار جی چاہا کہ بھائی کے

—— بی بی، ایسی باتیں مت کرو۔ تحصیلدار صاحب کو پتہ لگے گا تو میری کھال کھینچ دیں گے۔"

وہ بولی —— "ارے، تو مرد ہو کر ڈرتا ہے؟" اور پھر برقعے میں سے سسکی کی آواز آئی —— "ممدو اگر تو تین بجے تانگہ لے کر نہیں آیا تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔"

بس یہ کہا اور وہ تو جھپ سے اسکول کے اندر چلی گئی اور میں وہیں دروازے کے سامنے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے مجھ پر بجلی گری ہو، آپ ہی بتائیے سرکار، کرتا تو کیا کرتا؟ ایک طرف تو تحصیلدار کے ہنٹر کا ڈر۔ دوسری طرف بانو کی جان کا سوال۔ نہ جانے کتنی دیر تو میں وہیں اسکول کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا تو سیدھی پگڈنڈی سے بھٹک کر کتنی ہی دیر تک کھیتوں میں بھٹکتا رہا۔ جب میں واپس پہنچا تو بارہ بج رہے تھے اور خانم غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ ابھی میں نے دروازے میں قدم رکھنا شروع ہی کیا تھا کہ گالیوں کوسنوں کی بوچھار شروع ہو گئی —— "کہاں تھا تو اب تک حرام زادے؟ گھر کا سارا کام یوں ہی پڑا ہے۔ اور تو یوں ہی واہی تباہی پھر رہا ہے۔ کیوں رے —— جواب کیوں نہیں دیتا، آخر تو تھا کہاں؟"

اور جب میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا تو آنکھوں سے آگ برساتی ہوئی وہ میری طرف بڑھی۔ "ارے بولتا کیوں نہیں؟ گونگا ہو گیا ہے کیا؟" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا —— پر جیسے ہی اُس نے میرا ہاتھ چھوا، اُس کی چیخ نکل گئی —— "ارے تجھے تو تیز بخار چڑھا ہوا ہے۔ ملیریا، کہیں پلیگ تو نہیں ہے تجھے؟ گھر میں آج ہی ایک مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔" اور یہ کہہ کر اُس نے میری طرف ایسا دیکھا جیسے میں ہی وہ مرا ہوا چوہا تھا۔ اور فوراً جا کر کاربولک صابن سے ہاتھ دھونے لگی کہ کہیں میری بیماری کی چھوت نہ لگ گئی ہو۔ تو، سرکار، خدا جو کچھ بھی کرتا ہے بندے کی بھلائی کے لئے ہی کرتا ہے۔ مجھے پلیگ تو نہیں ہوا۔ پر ملیریا بخار جو اس دن چڑھا تو اس نے ایک مہینے تک نہ چھوڑا۔ میں آدھ موا تو ہو گیا مگر تحصیلدار صاحب کے ہنٹروں سے میری چمڑی بچ گئی۔ خانم نے اُسی وقت ہی مجھے چپراسی کے ساتھ گھر بھجوا دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ بس، اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے ایسے نوکر نہیں چاہئیں جو روز بیمار ہوتے ہوں۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے سرسام کا دورہ پڑ گیا اور وہ سردی چڑھی کہ ماں نے گھر بھر کی رضائیاں اور گدڑے میرے اوپر ڈال دیئے پھر بھی کپکپی نہ گئی۔ پر اس بخار کی حالت میں بھی سرکار، بانو کا خیال میرے دل سے نہ نکلا اور بے ہوشی میں بھی بار بار یہی چلاتا رہا —— "چھوٹی بی بی تم گھبرانا مت —— میں پورے تین بجے تانگہ لے آؤں گا۔" یہاں تک کہ میرے باپ نے تنگ آ کر مجھے جھنجھوڑ کر اُٹھا دیا —— "ابے کیا تانگہ، تانگہ بڑبڑا رہا ہے۔ کہیں گرمی دماغ کو تو نہیں چڑھ گئی ہے؟" مہینہ بھر کے بعد جب چلنے پھرنے کے لائق ہوا تو سنا کہ تحصیلدار قدرت اللہ خاں کی بدلی سہارنپور میں ہو گئی ہے۔

اُن کی جگہ کوئی اور تحصیلدار آیا ہے۔ پھر بھی یہ سننے میں آیا کہ خان صاحب کی ترقی ہو گئی ہے۔ اب

جیسے ہی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی نے ساڑھے نو کا گھنٹہ بجایا۔ میں نے کہا ــــ "اسکول جانے کا وقت ہو گیا۔"

اور اسکول کا نام سُن کر بانو کی سسکیاں تھم گئیں اور میرے گیلے مونڈھے سے سر اٹھا کر اُس نے کہا۔

"چل ممدو! میری کتابیں اُٹھا۔ آج تو میرے ہاتھوں میں قلم پکڑنے کی طاقت نہیں رہی۔"

اس دن بانو اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو میں نے دیکھا کہ برقعے کے اندر ایک پوٹلی سی اُس نے چھپا کر بغل میں داب رکھی ہے۔ اسکول کے راستے میں بانو نے ہمیشہ کی طرح نقاب اُلٹ دی۔ راستہ پگڈنڈی، پگڈنڈی کھیتوں میں سے جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

"ممدو! یوں تو میں مر جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں چھوٹی بی بی، یہ خانم بڑی ظالم ہے۔"

"پھر؟ ــــ" یہ کہہ کر اس نے میری طرف یوں نظر بھر کر دیکھا کہ میرا منہ گھبراہٹ سے لال ہو گیا۔

"تحصیلدار صاحب سے کیوں نہیں شکایت کرتیں؟ وہ تمہارے باپ ہیں آخر۔"

"ابا سے شکایت کی تو یہ ڈائن مجھے جان ہی سے مار ڈالے گی اور پھر ابا میری بات کیوں ماننے لگے؟ تم نے دیکھا نہیں؟ اُن کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کرتی ہے۔"

"پھر؟" ــ اس بار میں نے یہ سوال کیا۔

وہ بولی ــــ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ــــ "چل، ممدو، کہیں بھاگ چلیں ــــ میرے پاس تھوڑا سا زیور گہنا ہے۔ تیس چالیس روپے بھی میں نے بچا کر رکھ چھوڑے ہیں۔"

امیر چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں، ایسے قصے میں نے سُنے ضرور تھے۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ باتیں قصّے کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ اب بانو کی زبان سے سُن کر میرا یہ حال ہوا سرکار، کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا۔ جواب ہی نہ بن پڑا کوئی۔ ایسا لگا جیسے دل کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ایک دل کہتا تھا ــــ "ابے ممدو! تیری قسمت جاگ گئی ہے۔ ایسا موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ذرا لونڈیا کا جوبن تو دیکھ، اور جولاہوں کی کالی کلوٹی لڑکیوں کا مقابلہ تو کر جن سے تیری ماں قسمت پھوڑنے والی ہے اور پھر وہ خود کہہ رہی ہے کہ زیور گہنے بھی ہیں۔ ابے عیش کرے گا عیش!" پر سرکار، دوسرے دل نے کہا ــــ "اپنی اوقات مت بھول! تو ممدو ہے ممدو۔ بندو جولاہے کا لونڈا۔ تحصیلدار صاحب کا نوکر، ایسی ویسی کوئی بات کرے گا، تو اتنے جوتے پڑیں گے کہ سر پر بال نہ رہے گا۔"

وہ تو خیر ہوئی سرکار کہ اتنے میں سامنے سے اسکول کا کوئی ماسٹر آتا ہوا نظر آ گیا اور بانو نے جھٹ سے نقاب گرا دی۔ پھر آہستہ سے مجھ سے بولی۔ "چھٹی چار بجے ہوگی پر تو تانگہ تین بجے ہی لے کر آ جائیو ــــ ساڑھے تین بجے کلکتہ میل جاتی ہے۔ بس آج میں گھر واپس نہ جاؤں گی۔"

ماسٹر پاس سے گذر گیا تو میں نے پیچھے سے کہا۔

دیکھ لیتے تو ایک بار اپنی پارسائی کو بھول جاتے۔ پھر بھی وہ مالک کی بیٹی تھی۔ میں نوکر تھا۔ کبھی ایسا ویسا خیال آتا بھی تو میں سوچتا۔

"ابے او بندو جولاہے کے بیٹے، کیوں پاگل ہوا ہے، اپنی اوقات مت بھول، اتنے جُوتے پڑیں گے کہ سر گنجا ہو جائے گا" —— اور یہ سوچتے ہی میرا نشہ ایسا غائب ہوتا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ پر سرکار جھوٹ کیوں بولوں۔ اگلے دن جب اس کی کتابیں اُٹھائے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا بانو کے ساتھ اسکول جاتا اور اِدھر اُدھر کسی کو نہ پا کر وہ برقعہ سر سے اُتار دیتی اور اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں پھیل جاتی تو شیطان مجھے بہکانے لگتا اور کہتا۔

"ابے تو نوکر نہیں ہے۔ وہ مالک کی بیٹی نہیں ہے۔ تو بھی جوان ہے وہ بھی جوان ہے۔"

ایسے تو بانو تحصیلدار کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی چہیتی اور اس کے لئے دُنیا کا ہر عیش و آرام موجود تھا۔ پر یہ تحصیلدار صاحب کی دوسری بیوی خانم جو تھی۔ یہ تو بڑی ظالم تھی۔ سوتیلی بیٹی کو ایک گھڑی خوش دیکھنا اُس کے لئے مشکل تھا۔ پر تھی بڑی چالاک۔ جب تک تحصیلدار صاحب گھر میں رہتے، اُن کے...... دکھانے کے لئے بانو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ پر جیسے ہی وہ کچہری جانے کے لئے نکلے اور اُس نے چولا بدلا —— بات بات پر غریب بانو پر ڈانٹ پڑتی۔ پٹتی بھی بے چاری۔ ایک دن سویرے خانم نے اپنے گود کے بچے کے گُو اور مُوت میں سنے ہوتے نہالچے پوتڑے دھونے کے لئے بانو کو کہا۔ وہ بیچاری اسکول کا کام کر رہی تھی، اس میں ذرا دیر ہو گئی۔ خانم گودام میں سے کھانا پکانے والی کو آٹا تول کر دے کر جب باہر نکلی تو دیکھا نہالچے ویسے ہی پڑے ہیں۔ بس آگ ہی تو لگ گئی۔ بانو کے ہاتھ سے اسکول کی کاپی چھین کر پُرزے پُرزے کر دی اور لڑکی کو چوٹی پکڑ گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی اور وہیں چھپر کھٹ کا پایہ اُٹھا کر، اُس کے ہاتھوں کو نیچے دبا کر خود چھپر کھٹ پر چڑھ بیٹھی اور کہتی رہی تو جب تک تو معافی نہیں مانگے گی۔ ناک نہیں رگڑے گی، میں تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ پر بانو بھی ہٹ کی بڑی پکی تھی۔ دانت بھینچے رہی، نہ روئی نہ سسکی، نہ معافی مانگی۔

جب خانم کا بچہ رویا تو وہ خود ہی اُٹھی۔ میں برآمدے کی چک میں سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور بس نہیں چلتا تھا کہ جا کر خانم کو جان سے مار دوں۔ جب اس کمبخت کو کمرے کے باہر جاتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ پر اب بانو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ خود پائے اُٹھا سکے۔ یہ دیکھ کر میں خانم سے ڈرتا ڈرتا کمرے میں گیا اور جلدی سے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اس وقت بانو کی آنکھوں کا حال کیا بیان کروں سرکار! ایسی لگتی تھی۔ جیسے کوئی گھائل ہرنی۔ جیسے کسی نے کسائی کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے اب اُن آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے، پھر تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر سسکیاں بھر رہی ہے۔ آپ ہی بتلایئے ایسے موقع پر کوئی کرے بھی تو کیا کرے؟ —— میرا تو سانس اُوپر کا اُوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "چھوٹی بی بی کیا کر رہی ہو؟ —— خانم دیکھ لے گی تو میری کھال اُدھیڑ دے گی" —— میں نے آہستہ سے کہا —— اور پھر

مست۔" یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ـــــ وہ دن اور آج کا دن جب کبھی میں کسی امیر رئیس کو بڑھیا کپڑے پہنے اکڑفوں کرتے دیکھتا ہوں تو فوراً اپنی کمال میں مست ہو جاتا ہوں۔

ہاں صاحب! ـــ تو جب میں بڑا ہوا تو کئی برس تو اپنے باپ کے ساتھ کمبل بُننے کا کام کرتا رہا۔ مگر جب یہ دھندا مندا پڑ گیا، تو میرے باپ نے نمبردار سے سفارش کروا کر مجھے تحصیلدار صاحب کے یہاں نوکر رکھا دیا۔ تحصیلدار صاحب شہر کے باہر تحصیل کے پاس ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ اللہ بخشے۔ خان قدرت اللہ خان اُن کا نام تھا۔ بڑے رعب داب والے تھے۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں اور آواز ایسی کہ کسی کو زور سے ڈانٹ دیں تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جائے۔ شہر بھر اُن سے کانپتا تھا۔ اُن کے یہاں بس میں ایک ہی نوکر تھا۔ تحصیل کے دو چپراسی بھی کچہری کے وقت کے بعد اُوپر کا کام کرتے تھے۔

گھر کا سب کام کاج مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانے کو ایک بڑھیا دو وقت آجاتی تھی۔ مگر جھاڑو دینا، روز کمرے کی میز کرسیوں کو جھاڑنا پونچھنا۔ تحصیلدار صاحب کو ہر پندرہ بیس منٹ بعد حقہ بھر کر دینا۔ برتن دھونا بستر بچھانا، بازار سے سودا سلف لانا ـــ یہ سب میرا کام تھا۔ اور ہاں' ان سب کاموں کے علاوہ ایک کام اور بھی تھا۔ وہ تھا تحصیلدار صاحب کی بیٹی بانو کی کتابیں اُٹھا کر اُسے اسکول چھوڑ کر آنا۔ لڑکیوں کا اسکول کوئی دُور نہ تھا ـــ بنگلے سے مشکل سے آدھ میل ہوگا ـــ اور کھیتوں سے ہو کر جاؤ تو اس سے بھی کم۔ مگر تحصیلدار صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ اُن کی بیٹی خود کتابیں اُٹھا کر لے جائے ـــ اس لئے بانو کو اسکول پہنچانا، اور وہاں سے واپس لانا ـــ میرا فرض تھا اور سچ پوچھئے تو سارے کاموں سے یہی کام مجھے سب سے اچھا لگتا تھا۔

اُن دنوں میں کوئی ۱۷، ۱۸ برس کا ہوں گا۔ صاحب! خدا کے فضل سے ناک نقشہ بھی بُرا نہیں تھا۔ صحت بھی ماشاء اللہ اچھی تھی۔

پھر تحصیلدار صاحب نے دو چار پُرانی قمیضیں اور شلواریں دے دی تھیں جنہیں میری ماں نے گونتھ گانتھ کر ٹھیک کر دیا تھا۔ وہ پہن کر اور سر کے بالوں میں کڑوا تیل ڈال۔ میں بھی اچھا خاصا جنٹل مین لگتا تھا۔ بانو اسکول تو برقع اوڑھ کر جاتی تھی مگر مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ تحصیلدار صاحب پردے کے معاملے میں ویسے بڑے کٹر تھے مگر اُن کا کہنا تھا کہ نوکروں سے کیا پردہ؟ اور یہ ایسے ہی کہتے جیسے کوئی کہے کہ گھر کے کتے سے کیا پردہ؟ ـــ یا گھوڑے سے کیا پردہ؟"

ہاں تو صاحب بانو مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی کوئی ۱۵ یا ۱۶ برس کی ہوگی۔ ساتویں کا امتحان دینے والی تھی۔ اُس کا حال کیا بتاؤں۔ آپ سے ایسی باتیں کرتے شرم آتی ہے۔ پر یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے بانو کو بنایا تھا۔

رنگت ایسی جیسے میدا اور شہد! اور کالے ریشمی برقعے میں سے منہ نکال کر جب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تو ایسا لگتا تھا جیسے بدلی میں سے چاند نکل آیا تھا۔

گھونگر والے بال۔ بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں۔ میں تو آدمی تھا سرکار وہ بھی جوانی کا عالم فرشتے بھی اُسے

پانچ سو مانگے اور میری جیب میں صرف سات روپے نکلے تو آپ جانتے ہیں میں نے کیا کیا؟ نہ ربڑ کی ٹانگ لگوائی نہ لکڑی کی ——— صبر کی ٹانگ لگوائی۔ اس دن سے آج تک ان ہی ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں اور صبر کی ٹانگ سے گذارہ کر رہا ہوں۔ صبر ہو تو بیساکھیوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے صاحب۔ اللہ نے ہاتھ دیئے ہیں کولہے دیئے ہیں۔ وہ سامنے دیکھئے نا۔ لوٹے رولدو کی تو دونوں ٹانگیں بے کار ہیں۔ پھر بھی ہاتھوں اور کولہوں کے سہارے مزے سے گھسٹ کر چل لیتا ہے ——— اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ٹانگوں کے ساتھ باہنوں پر فالج نہ گرا دیا۔

خدا کی مہربانی تھی کہ بچپن ہی میں ماں باپ سے صبر کا سبق ملا۔ ہم ذات کے جولاہے ہیں صاحب ——— یوں تو ہم مسلمانوں میں ذات پات نہیں ہوتی۔ خدا کے بندے سب برابر ہیں۔ مگر امیری غریبی، اونچ نیچ، شرافت، رذالت بھی تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے میرے ماں باپ کا کہنا تھا کہ انسان کو کبھی اپنا درجہ نہیں بھولنا چاہیئے اور وہ عمل بھی ہمیشہ اسی اصول پر کرتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر بھی وہ شریفوں کے لونڈوں تک کو جھک کر سلام کرتا۔ ہر پٹھان کو "خانصاحب"، ہر سید کو "میر صاحب"، ہر بنئے کو "لالہ جی"، ہر برہمن کو "پنڈت جی" اور ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر کو، یہاں تک کہ پٹواری، نمبردار تک کو ——— "سرکار" کہتا تھا مگر وہ سب اسے "بندو جولاہا" کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ان امیر شریفوں کے بچوں کو اجلے کپڑے پہنے، کتابیں ہاتھ میں لئے اسکول جاتے ہوئے دیکھ کر ہم بھائیوں کا بھی جی چاہتا کہ ہمارے بھی ایسے کپڑے ہوں۔ اور پڑھ لکھ کر ہم بھی افسر بنیں۔ مگر میرا باپ ہمیں سمجھاتا ——— "بیٹا! اپنی اوقات کبھی نہ بھولنی چاہئے۔ خدا نے جو درجہ دیا ہے۔ اسی پر صبر شکر سے صبر کرنا چاہیئے۔ نہیں تو، کوا چلا ہنس کی چال ——— والی کہاوت ہو جائے گی"۔ میرے باپ کو کہاوتیں بہت یاد تھیں ——— اور جیسا موقعہ ہوتا فوراً کوئی نہ کوئی کہاوت سنا دیتا۔

ایک برس کی بات ہے جب ہم شہر کے آڑھتی بنئے کے لئے کمبل بنا کرتے تھے۔ وہ ہمیں اون اور کمبل ڈیڑھ روپیہ کتائی اور بنائی دیتا اور پھر اسی کمبل کو دس روپے، گیارہ روپے میں بازار بیچتا۔ ہاں، تو ایک برس عید کے موقع پر بابا کو آڑھتی کے یہاں سے رقم نہ ملی۔ بات یہ تھی کہ اس سال ولایت اور جاپان سے مشین کے بنے ہوتے جھاگ جیسے ملائم کمبل سستے داموں آ گئے تھے اور ہمارے مظفر نگر کے کمبلوں کی مانگ بہت کم ہو گئی تھی۔ سینکڑوں کمبل بن بکے پڑے ہوئے تھے اور خود ہمارے والے آڑھتی نے ولایتی کمبلوں کی ایجنسی لے لی تھی۔ ہاں، تو جب بابا کو پچاس ساٹھ کمبلوں کی بنائی نہ ملی تو وہ بے چارہ ہمارے لئے کپڑے کہاں سے بنواتا؟ ——— وہی پچھلے سال کی عید کے کپڑے ماں نے گھر میں صابن سے دھو کر دے دیئے۔ جب ہم نے اپنے پڑوس میں وکیل صاحب کے بچوں کو ریشمی اچکنوں اور نئی ترکی ٹوپیاں پہنے دیکھا تو ہمیں بڑا رونا آیا۔ پر بابا نے کہا۔

"ارے روتے کیوں ہو؟ ——— وہ امیر اپنے مال میں مست ہیں تو ہم غریب اپنی کھال میں

شکر اللہ کا

نہیں صاحب! کوئی شکوہ شکایت نہیں۔ رشتہ داروں، دوستوں، دشمنوں، تعلقات والوں، افسروں، مالکوں، کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ نہ سرکار سے کوئی گلہ ہے۔ نہ اللہ میاں سے کوئی شکوہ ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ سو میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں اور صبح شام خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ کھانے کو پلاؤ قورما نہیں تو چٹنی روٹی تو بھیجدیتا ہے۔ سر کے اوپر آسمان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں تو کیا ہوا۔ سونے کے لئے فٹ پاتھ کے پتھر تو ہیں۔ میری کٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کر رحم نہ کھائیے۔ صاحب خدا کا شکر ہے، دوسری ٹانگ تو صحیح ہے۔

سچ پوچھیے تو صبر ہی ہم غریبوں کی سب سے بڑی دولت ہے۔ صبر ہماری عورتوں کا زیور ہے، اور ہمارے بچوں کا کھلونا۔ آپ محلوں، بنگلوں میں رہنے والے صبر کے فائدے کیا جانیں۔ سوکھی روٹی کو صبر کی چٹنی سے لگا کر کھاؤ تو مرغِ مسلم کا مزہ آتا ہے۔ پھر سڑک کے کنارے صبر کی مخملی گدی بچھا کر اوپ
سے ریشمی چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ ایسی نیند آتی ہے کہ کسی راجہ نواب کو نہ آتی ہوگی اور جب مشین میں آکر می
بائیں ٹانگ کٹ گئی اور مل کے مالکوں نے ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا اور میں ایک کباڑی کے یہاں
دو روپے میں یہ ٹوٹی ہوئی بیساکھیاں خرید کر اچھلتا کودتا لنگڑاتا ہوا ایک ڈاکٹر کے یہاں پہنچا جو کہ نقل
ٹانگ بنانے میں مشہور تھا اور اس نے ربڑ کی ٹانگ لگانے کے لئے ہزار روپیہ اور لکڑی کی ٹانگ کے

کے لئے جو گھر آپ بنا رہے ہیں، یہ بڑا کام ہے، اچھا کام ہے لیکن بھگوان کے لئے جلدی کیجئے۔ —— اگر آپ مجھے اور میری چمپا اور ہمارے بچوں کو بچانا چاہتے ہیں۔

◆

پر اپنی راتیں بسر کر رہے ہیں ؟"

اور میں نے کہا۔

"نہیں۔ صرف انیس ہزار نو سو ننانوے۔ اس لئے کہ چمپا تو مر چکی ہے۔ صرف اُس کے خون کا ایک دھبّہ رہ گیا ہے۔ سو وہ بھی ایک چھینٹا پڑتے ہی ڈھل جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے۔"

انھوں نے مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے انھیں شبہ ہو کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔

پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"تم سرکاری ڈورمیٹری میں کیوں نہیں رہتے۔ جہاں بے گھروں کے سونے کا انتظام کیا گیا ہے۔ کیا تم پانچ آنے روز خرچ نہیں کر سکتے ؟"

میں نے کہا۔

"میری آمدنی پینتالیس ۴۵ روپے ماہوار ہے۔"

"پھر تم وہاں کیوں نہیں جاتے ؟ یہاں فٹ پاتھ پر کیوں سوتے ہو ؟"

"کیوں ؟"

"کیوں ؟ ؟"

"کیوں ؟ ؟ ؟"

اُن کے سوالوں کی بوچھار ہوتی رہی اور میری زبان بند رہی۔ اب میں اُنھیں کیا بتاؤں۔ کیسے بتاؤں۔ اگر بتا بھی پاؤں تو مجھے یقین ہے وہ میری بات نہیں سمجھیں گے۔

میں اُن سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے میرے جیسے بے گھر لوگوں کے لئے سرکاری ڈورمیٹری بنائی ہے۔ چلئے بیس ہزار کے لئے نہیں تو ساڑھے تین سو کے لئے تو سونے کا انتظام کیا ہے۔ بہت اچھا کیا۔ شکریہ ! دھنیہ واد !! جے ہند !!! لیکن سرکار ! میں ڈورمیٹری میں دُوسرے لوگوں کے ساتھ نہیں سونا چاہتا۔ میں ٹھہرا گھر گرہستی والا۔ مجھے میری بیوی اور تین بچوں کو تو ایک الگ گھر، کم سے کم ایک الگ فلیٹ چاہیئے۔ ایک کمرہ، ایک رسوئی گھر اور آنگن میں سُرخ پھولوں سے لدا ہوا گل مہر کا ایک پیڑ...... لیکن میں اُن سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا اور وہ مجھے پاگل سمجھ کر چلے گئے اور میں سڑک پر گیس کے ہنڈے کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں اور قریب ہی فٹ پاتھ پر چمپا کے خون کا دھبّہ ہے جو مدھم پڑ چکا ہے۔ آسمان پر بادل گھرنے لگے ہیں۔ جلد بارشیں شروع ہو جائیں گی اور پھر یہ خون کا دھبّہ بھی بمبئی کے دامن سے دُھل جائے گا۔ پھر کیا رہے گا ؟ یہ ہے پتھر کی سیج پر گذاری ہوئی ایک ہزار راتوں کی میری داستان !

مگر ــــ مجھے نہیں معلوم کون لوگ وہ بڑے بڑے پنج سالہ پلان اور پراجکٹ بناتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے کسی کی نظر سے میری یہ ڈائری گذرے تو اُن سے میری اتنی غرض ہے کہ بے گھروں

ہو گیا تھا۔

کالا سوٹ پہنے ہوئے ایک نوجوان جو وہسکی کے نشے میں تھا گاڑی میں سے کھینچ کر نکالا گیا۔ ہوش آتے ہی وہ بڑبڑایا۔

"چ . . . . چ . . . . چ . . . . سٹیئرنگ وھیل نہ جانے کیسے ایک دم ٹوٹ گیا۔ ہاں . . . . ."

اور پھر چمپا کی لاش کو دیکھ کر۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔ مگر نہ جانے یہ لوگ فٹ پاتھ پر کیوں سوتے ہیں؟" اور میرے جی میں آیا کہ اُسے بتاؤں کہ لوگ فٹ پاتھ پر کیوں سوتے ہیں؟ اور کیوں چمپا اور سب سے دُور فٹ پاتھ کے کنارے پر سو رہی تھی۔ لیکن اس وقت میں گونگا ہو گیا تھا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلا۔ مبہوت ہو کر صرف دیکھتا اور سُنتا رہا۔ پولیس والے نے کار کے مالک سے اُس کا پتہ پوچھا تو اُس نے مالا بار ہل پر ایک بلڈنگ کا نام بتایا۔

"فلیٹ کا نمبر؟" سپاہی نے نوٹ بک میں لکھتے ہوئے پوچھا۔

اور اس کالے سوٹ والے نوجوان نے جواب دیا۔ "ساری بلڈنگ ہی ہماری ہے۔"

اور اب سرکاری خرچ پر چمپا کا کریا کرم ہو چکا ہے۔ چتا کے شعلوں میں وہ راکھ ہو چکی ہے۔ آپ رہا کیا ہے؟ فٹ پاتھ پر اُس کے خون کا ایک دھبہ! یہی سوچتے ہوئے میں ردی اخبار کے کاغذوں کو بچھا کر لیٹنے کی تیاری کرتا ہوں۔ اس اخبار میں ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ خبر چھپی ہے۔ بمبئی سرکار نے فٹ پاتھ پر سونے والے بے گھروں کے لئے ایک گھر بنایا ہے جہاں ساڑھے تین سو آدمیوں کو صرف پانچ آنے فی کس یومیہ ادا کرنے پر رات کو سونے کی جگہ ملے گی . . . . .

ہزارویں رات

یہ میری ڈائری کا شاید آخری ورق ہے۔

اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اجالا ہو جائے گا۔ چمپا کی یاد میں دس راتیں جاگ کر گذارنے کے بعد کل رات میں پہلی بار سو سکا تھا۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

چند پولیس کے سپاہی اور چند سماج سدھار کے والنٹیر۔

"کیوں کیا ہے؟"

ہم فٹ پاتھ پر رہنے والوں کی گنتی کر رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا "تمہارا نام؟"

اس پوچھ گچھ کے دوران میں اُن میں سے ایک نے بتایا کہ اب بمبئی میں صرف دو ہزار لوگ ہیں جو فٹ پاتھ

نوسونوّے ۹۹۰ ویں رات

گھر بنا نہیں اور اُجڑ گیا!

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک رات میں بلکہ چند لمحوں میں زندگی ختم ہو جائے گی اور زندگی کی تمام اُمنگیں، آرزوئیں، زندگی کی تمام حسین خواب اور مستقبل کی پوری عمارت شیشے کے گھر کی طرح یکایک چکنا چُور ہو جائے گی۔ کل رات دو بجے کے بعد جب میری آنکھ لگی تو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ پہلے بھی میں نے کئی بار خواب میں دیکھا تھا کہ ہمارا گھر بن رہا ہے۔ دیواروں پر سفیدی ہو رہی ہے لیکن اس بار میں نے دیکھا کہ گھر تیار ہو گیا ہے اور ہم اس میں اُٹھ آئے ہیں۔ رسوئی گھر میں چمپا بیٹھی کھانا پکا رہی ہے۔ آنگن میں گل مہر کا پیڑ سُرخ سُرخ پھولوں سے لدا ہوا ہے اور ہری ہری گھاس پر ہمارے بچے' دو لڑکیاں اور ایک لڑکا گیند بلا کھیل رہے ہیں اور پھر یکایک آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے۔ بجلی کوندنے لگی اور طوفانی بادلوں کی کڑک سے ہمارا چھوٹا سا گھر کانپنے لگا۔ اندھیرا' آندھی اور طوفان۔ ساری زمین ہل رہی تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کالے آسمان پر بجلی کوندی اور ہمارے گھر کی طرف لپکی۔ بجلی کی چمک میں میں دیکھ رہا تھا' چمپا رسوئی گھر میں کھانا پکا رہی ہے اور میرے بچے پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں اور وہ سب اس آتشیں تلوار کی زد میں ہیں۔ میں چاہتا تھا کہ میں چیخوں۔

"چمپا باہر آجاؤ۔ بچو! پیڑ کے نیچے سے ہٹ جاؤ۔"

لیکن یکایک میں گونگا ہو گیا۔ میرے منھ سے آواز ہی نہ نکلی۔ ایک شعلہ سا بھڑکا۔ ایک ہیبت ناک تڑاخہ ہوا اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ اور اُس اندھیرے میں ہمارے گھر کے گرنے کی آواز ایسی آئی جیسے کوئی کار دیوار سے ٹکرائی ہو اور بریک لگنے کی خوفناک چیخ کے ساتھ کتنے ہی شیشے چھن چھن کر کے ٹوٹ گئے ہوں۔

میں گھبرا کر اُٹھا اور صبح کی دھندلی روشنی میں دیکھا۔ سارے فٹ پاتھ پر کھلبلی سی مچی ہوئی ہے۔ ایک بڑی سی خوبصورت کالی کار اپنے اگلے دو پہیے ہوا میں اُٹھائے دیوار سے بغل گیر ہو رہی ہے۔ اس کے پہیے اب تک گھوم رہے ہیں اور گھومتے ہوئے ٹائروں پر سے گہرے سُرخ رنگ کی بوندیں ٹپ ٹپ کر کے فٹ پاتھ پر گر رہی ہیں۔

خون! ..... چمپا کا خون .....!!

پاگلوں کی طرح میں اُدھر دوڑا جہاں اُس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ بھاری ظالم موٹر نے اس کے دُبلے پتلے جسم کو پیس کر رکھ دیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایک خراش بھی نہ آئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر اب بھی وہی مسکراہٹ تھی جیسے وہ مری نہ ہو۔ کوئی بہت ہی سُندر، بہت ہی میٹھا سپنا دیکھ رہی ہو۔ اور اُس کی دائیں ہاتھ کی مٹھی میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ تھا۔ اس گھر کی رنگین تصویر جو بننے سے پہلے ہی کھنڈر

مجھے رکھ لے۔" اور یہ کہہ کر اپنے مذاق پر وہ خود ہی ہنسا لیکن کسی نے اُس کی ہنسی میں اس کا ساتھ نہ دیا۔ چمپا نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف خاموشی سے ایک بار رگھیا کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہ میں اتنی نفرت اور حقارت تھی کہ رگھیا کے چہرے پر سے ہنسی غائب ہو گئی۔ اور وہ کھسیانہ ہو کر کھانسنے لگا۔

پھر چمپا نے اپنے چیتھڑوں، گدڑیوں کا پلندہ اُٹھایا اور ہم سب سے دُور فٹ پاتھ کے کنارے پر اپنا بستر بچھایا اور خاموش لیٹ گئی۔ لیکن سوئی نہیں۔ جب سے لیٹی ستاروں بھرے آسمان کو تک رہی ہے۔

اور میں جاگ رہا ہوں۔ کیونکہ موتی مر گئی ہے اور اب چمپا کی حفاظت کرنے والا کون ہے میرے سوا؟

نوسو نواسی ۹۸۹ رات

خواب کی تصویر۔

بزرگوں نے کچھ غلط نہیں کہا کہ وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ چمپا بھی موتی کے غم کو بھولتی جا رہی ہے۔ آج شام کو جب میں کام سے واپس آیا تو اس نے ایک دھیمی سی پیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا۔

آج تو میں اُس کے لئے ایک تحفہ لایا تھا۔ اپنے اور اُس کے خوابوں کے گھر کی تصویر۔ یہ اُسی گڑیا گھر کی تصویر تھی جو ہم نے "پنج سالہ پلان" والی نمائش میں دیکھا تھا۔ ہمارے خوابوں کی یہ تصویر رنگین تھی۔ لال اینٹوں کا مکان۔ چمنی میں سے کالا کالا دُھواں اُٹھتا ہوا۔ آنگن میں پیڑ کے ہرے گھنے پتے۔ اُن میں سُرخ پھول۔ دو بچیاں، ایک نیلا فراک پہنے ہوئے۔ دوسری نارنجی۔ ایک کے ہاتھ میں پیلے رنگ کا غبارہ، دوسری کے ہاتھ میں اُودے رنگ کا غبارہ۔ لڑکے کے بدن پر سفید قمیص، خاکی نیکر۔ کالے چمکتے ہوئے جوتے۔ زمین پر ہری ہری گھاس۔

"یہ - - - - یہ - - - - تصویر میں رکھ لوں؟"

چمپا نے کہا اور میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں اُمید اور خوشی سے چمک رہی ہیں۔ میں نے کہا۔

"ہاں اور کیا؟ تمہارے ہی لئے تو لایا ہوں۔"

اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں نے خاموشی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ کتنی محبت تھی اُن آنکھوں میں، کتنا تشکر تھا۔ اُن آنکھوں میں اُمیدیں اور آرزوئیں بھی تھیں۔ اور عہد و پیماں بھی اور میرے لئے تو اُن آنکھوں میں زندگی کا سب سے اہم پیغام تھا۔

کتنی ہی راتوں کے بعد آج چمپا اطمینان سے گہری نیند سو رہی ہے۔ آخری شام بھی گڑگڑاتی ہوئی گزر چکی ہے۔ یونیورسٹی کلاک ٹاور دو بجا چکا ہے۔ اور اب میری آنکھیں بھی بند ہوئی جا رہی ہیں۔ - - -

میں نے ماڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوشی سے چیخ کر کہا۔ وہ گھر نہیں تھا۔ صرف گھر کا ماڈل تھا۔ جیسا گڑیوں کا گھر ہوتا ہے لیکن اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر لکھا تھا۔

"یے گھروں کے ایسے ہزاروں گھر بنائیں جائیں گے۔"

دیر تک ہم اس گڑیا گھر کے سامنے کھڑے اُسے حیرت اور خوشی سے تکتے رہے۔ ایک کمرہ، ایک رسوئی گھر، ایک برآمدہ، آنگن میں ایک پیڑ اور پیڑ کے نیچے تین ننھی گڑیاں، تین بچے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری ساری آرزوئیں، ہمارے سارے سپنے اس ماڈل میں سمٹ آتے ہیں۔ جب ہم وہاں سے لوٹے تو میں نے دیکھا چمپا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

اب وہ سو رہی ہے اور اس کے چہرے پر ایک اطمینان اور خوشی اور اُمید کی مسکراہٹ ہے۔

نوسو اٹھترویں ۹۷۸ رات

موت کا سایہ!

ہمارے سُکھ کے سپنوں پر موت نے اپنا بھیانک سایہ ڈال دیا ہے۔ چمپا کی کُتیا مر گئی ہے۔ کسی نے اُسے زہر دے دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موتی کے ساتھ چمپا کے دل کا ایک ٹکڑا بھی مر گیا ہے زہر کس نے دیا؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن رگھیا اتنا خوش کیوں نظر آتا ہے؟ ہو سکتا ہے یہ خون اُسی نے کیا ہے۔

بہت دیر تک تو چمپا موتی کو گود میں لئے بیٹھی رہی۔ اور اُس کی خاموش آنکھوں سے آنسو بہتے رہے پھر وہ اٹھی اور دونوں ہاتھوں پر لاش کو اُٹھائے جیسے باپ اپنے بیٹے کی لاش کو لئے شمشان جاتا ہے۔ سمندر کی طرف چلی گئی۔ میں نے چاہا اس وقت اس کے ساتھ جاؤں لیکن چمپا نے خاموشی سے مڑ کر اس انداز سے مجھے دیکھا کہ میں وہیں ٹھہر گیا۔ اُس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

"تم مت آؤ۔ اس وقت میں اکیلی ہی جانا چاہتی ہوں۔"

کوئی ایک گھنٹہ بعد وہ واپس آئی۔ خالی ہاتھ۔ اُس وقت اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ اتنی خاموش اور ساکت تھی کہ ڈر لگتا تھا کہیں دماغ پر تو کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ کھانے کو بھی کہا لیکن چمپا نے جواب میں میری طرف نگاہیں اٹھا کر حیرت سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"میری پیاری موتی مر گئی ہے۔ آج کی رات میں کیسے کھانا کھا سکتی ہوں؟

اور میں خاموش ہو گیا۔

رگھیا نے چلا کر کہا۔

"کیوں چمپا! اب تیری چوکیداری کون کرے گا؟ کُتیا تو مر گئی۔ اُس کی جگہ اپنی حفاظت کے لئے

اور لوگ انتظار کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے جلدی ہے شادی کرنی ہے۔ گرہستی بنانی ہے۔۔۔۔۔ پھر بچے ہوں گے۔۔۔۔۔۔ اس لئے جلد سے جلد ہمیں گھر ملنا ہی چاہئے۔۔۔۔

نوسو پچھترویں ٩٧٥ رات۔ ہمارا گھر۔ ہمارا گھر!

... آج رات تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ اور تو اور چمپا بھی اپنی مستقل خاموشی کے گنبد سے نکل رہی ہے۔ میں ڈائری لکھ رہا ہوں اور وہ اینٹوں کے چولھے پر مٹی کی ہانڈی میں دال پکا رہی ہے۔ اور ساتھ ساتھ اپنے وطن کا ایک لوک گیت گنگنا رہی ہے۔ میں اس گیت سے واقف ہوں یہ گیت گاؤں کی عورتیں شادی کے موقع پر گاتی ہیں۔

چمپا کو خوش اور ہشاش بشاش اور گاتی ہوئی دیکھ کر فٹ پاتھ پر سونے والے سب حیران ہیں۔ صرف ایک مجھے تعجب نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجھے چمپا کی خوشی کی وجہ معلوم ہے۔

آج ہم اپنے گھر کو دیکھنے گئے۔ جس میں ہم شادی کے بعد رہنے والے ہیں۔

ہوا یہ کہ ہمارے فٹ پاتھ کے قریب کئی دن سے بڑا ہنگامہ ہے۔ روشنیاں، لاؤڈ اسپیکروں پر چیخ و پکار۔ ہزاروں لوگوں کا مجمع۔ رات کے ایک بجے تک میلا سا لگا رہتا ہے۔ ہمارا سونا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ کوئی نمائش ہو رہی ہے۔ دروازے پر بورڈ لگا ہے۔

"پنج سالہ پلان"

جیسا میں نے پہلے بھی اس ڈائری میں لکھا ہے۔ ہم فٹ پاتھ پر رہنے والے ایسی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے۔ کیونکہ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پلان اور پراجیکٹ ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے لیکن جب میں نے بورڈ پر لکھا دیکھا "پنج سالہ پلان" تو میری یاد میں گھنٹی سی بجی، کیونکہ اُس خبر میں جس کا تراشا اب تک میری جیب میں محفوظ ہے۔ لکھا تھا — دوسرے پنج سالہ پلان میں بے گھروں کے لئے گھر بنانے کی اسکیم بھی شامل ہے۔ سو میں نے یہ سوچا۔ اس نمائش میں جا کر تو دیکھنا تو چاہیئے۔ بھیڑ کے ساتھ بہتا ہوا میں بھی اندر پہنچ گیا۔ بہت ہی عجیب و غریب چیزیں دیکھیں — تصویریں، نقشے۔ پانچ سال میں یہ ہوگا، پانچ سال میں وہ ہوگا۔ اتنے انجن بنیں گے۔ اتنے ہزار میل ریل کی پٹڑی بنے گی، اتنے کالج، اتنے ہسپتال۔ اور میں دل ہی دل میں کہتا رہا۔ ہمیں کیا؟ ہمیں کیا؟ لیکن ایک چیز ایسی بھی دیکھی جس میں مجھے بہت دلچسپی ہے اور جسے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ کئی منٹ تک میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر میں وہاں سے بھاگا۔ اپنے فٹ پاتھ پر آیا اور کسی کی پروا کئے بغیر چمپا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گھسیٹتا ہوا نمائش میں لے گیا۔

"دیکھو چمپا! ہمارا گھر!"

ہم فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو سیاست، الیکشن، کانگرس، سوشلسٹ پارٹی، کیونسٹ پارٹی، لوک سبھا پنج سالہ پلان، بجٹ وغیرہ سے کوئی بھی دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ سب چیزیں اپنی زندگی سے بالکل غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں۔ اخباروں سے ہم ضرور دلچسپی رکھتے ہیں لیکن صرف ردّی اخباروں سے۔ فٹ پاتھ پر بستر بچھانے کے لئے اور کبھی کبھی اوڑھنے کے لئے۔ لیکن آج صبح میں سو کر اُٹھا اور اپنا کاغذی بستر لپیٹنے لگا تو اخبار میں ایک سُرخی دیکھی۔

"بے گھروں کے لئے گھر بنیں گے۔"

ساری خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ سرکار نے کئی ہزار چھوٹے چھوٹے گھر بنانے کا پلان بنایا ہے اور یہ گھر ہمارے جیسے غریبوں کے لئے بنیں گے۔ میں نے یہ خبر پیپر میں سے پھاڑ لی اور احتیاطاً لپیٹ کر جیب میں رکھ لی۔ بائیں طرف کی جیب میں اپنے دل کے قریب۔ نہ جانے کیوں دن بھر مجھے اطمینانِ قلب محسوس ہوتا رہا اور میں اپنا کام بہت خوش دلی اور پھرتی سے کرتا رہا۔ گو مینیجر کی ڈانٹ سُننی پڑی کیونکہ میں دفتر میں بہت زور سے سیٹی بجا رہا تھا۔

شام ہوتے ہی میں سیدھا گھر یعنی فٹ پاتھ کو واپس آیا۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ اِس وقت تک اور لوگ اپنے اپنے کام سے نہیں لوٹے تھے۔ چمپا اکیلی بیٹھی موتی سے باتیں کر رہی تھی۔

"چمپا! چمپا!!"

آج میں نے اس کا نام لے کر پکارا۔

"دیکھ تو سہی اس پیپر میں کتنی اچھی خبر ہے۔" اور میں نے وہ تراشہ جیب سے نکال کر اُسے دیدیا۔

اس نے کاغذ کو پڑھے بغیر نفی میں سر ہلا دیا "میں تو اَن پڑھ ہوں۔ تم ہی بتاؤ کیا لکھا ہے؟"

"لکھا ہے کہ سرکار ہمارے جیسے بے گھروں کے لئے جو فٹ پاتھ پر سوتے ہیں گھر بنا رہی ہے؟ میں بہت جوش میں بات کر رہا تھا" ہے نا بہت اچھی خبر۔ اب ہم فٹ پاتھ پر سونے کی بجائے اپنے گھر میں رہیں گے۔۔۔ اپنے گھر میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ اور تم۔۔۔۔۔ سمجھیں نا چمپا؟"

اُس نے سر ہلا کر ہاں کہا اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ جو مسکراہٹ بھی تھی اور ٹھنڈی سانس بھی۔ اُس نے پوچھا "مگر کب؟"

اب مجھے ساری خبر کو غور سے پڑھنا پڑا۔ لکھا تھا کہ اُن گھروں کو بنانے کا کام تو جلدی شروع ہو جائے گا لیکن اندازہ کیا جاتا ہے کہ سب بے گھروں کو بسانے کے لئے کافی تعداد میں مکان بنانے کے لئے کم سے کم دس برس لگیں گے۔

دو لفظوں "مگر کب؟" سے میرا سویرے والا جوش کسی قدر مدھم پڑ گیا لیکن پھر بھی مایوس نہیں ہوں بلکہ دعا کر رہا ہوں کہ جب یہ گھر تیار ہونے شروع ہوں تو ہمارا یعنی میرا اور چمپا کا گھر پہلے ہی بن جائے۔

شہر کی طرف روانہ ہوا۔ چمپا نے حیرت اور خوشی سے جگمگاتی ہوئی اُونچی اونچی عمارتیں دیکھیں۔ اور میں نے اُن تمام روشنیوں کو چمپا کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے دیکھا۔ پھر بھی ہم نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے چلتے رہے۔ واپس ہوتے وقت ہم ایک بڑی شاندار دکان کے سامنے سے گذر رہے تھے جس کی شیشے کی کھڑکیوں میں رنگ برنگ کی ریشمی ساڑیاں اور سونے چاندی کے گہنے سجے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے چمپا اُن ساریوں کے سامنے ٹھہری اور میں نے اس کے چہرے کا عکس شیشے میں دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب آرزو تھی اور ایک عجیب مایوسی اور وہ اُن ساریوں کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ صرف ریشمی ساریاں نہ تھیں، آرام اور آسائش کی وہ تمام چیزیں تھیں جن سے اُس کی زندگی محروم تھی۔

اور میرا جی چاہا میں اُسے چیخ کر کہوں۔

"چمپا! میری اپنی چمپا! میں ایک دن تمہیں یہ سب چیزیں لا دوں گا۔ یہ ریشمی ساریاں، یہ زیور گہنے۔ میں تمہیں دنیا کی سب خوبصورت چیزیں نذر کر دوں گا۔ اس لئے کہ تم خوبصورت ہو، جوان ہو اور تمہارا حق ہے کہ تمہارے بدن پر ایسی رنگین ساریاں ہوں۔ تمہارے کانوں میں یہ سنہری آویزے جھولتے ہوں، اور تمہارے ماتھے پر وہ جھومر جگمگاتا ہو۔ یہی نہیں۔ میں تمہیں ان سب سے بھی زیادہ خوبصورت اور پیاری بھینٹ دینا چاہتا ہوں، ایک محبت کرنے والا شوہر، ایک چھوٹا سا گھر۔ اولاد! کاش۔ تم ایک بار مجھ سے کچھ مانگو تو سہی۔" لیکن اُس نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ صرف ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی کُتیا سے کہا۔

"چل موتی! گھر چلیں"

"گھر!" وہ اس فٹ پاتھ کو گھر کہتی ہے۔ وہ چند چیتھڑوں اور چند ٹھیکروں کو گھر کہتی ہے۔ آہ چمپا! کاش! میں تجھے ایک سچ مچ کے گھر میں لے جا سکتا۔۔۔۔۔

اور اب آدھی رات گزر چکی ہے۔ سب سو رہے ہیں اور میں اپنی ڈائری لکھ رہا ہوں۔ جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے میں چمپا کو دیکھ سکتا ہوں۔ گیس کی پیلی روشنی اُس کے چہرے پر پڑ رہی ہے اور وفادار موتی پاس بیٹھی چوکیداری کر رہی ہے۔ اس وقت چمپا اور بھی حسین نظر آ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوتے ہوتے وہ اپنی زندگی کی سب محرومیوں، سب تکلیفوں کو بھول جاتی ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ہے۔ جیسے وہ کوئی سُکھ بھرا سپنا دیکھ رہی ہو۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اُس کے مسکراتے ہوتے خوابوں میں میرے لئے بھی کوئی جگہ ہے یا نہیں؟۔۔۔۔۔

۹۴۴
نو سو چوالیسویں رات

خوش خبری ـــــ "مگر کب؟"

پینے جارہا ہوں۔ لیکن کُتیا بھونکے جارہی تھی اور ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

سُنا ہے آج رگھیا نے ہسپتال جاکر پیٹ میں سُوئے لگوائے۔ مجھے موتی کی یہ حرکت بہت پسند آئی۔ اس لئے کہ مجھے چمپا سے کافی دلچسپی پیدا ہوچلی ہے بلکہ شاید دلچسپی سے بھی زیادہ۔۔۔۔

نوسوساتویں ۹۰۷ رات

ایک آدمی۔ ایک عورت۔ ایک جانور۔

آج رات میں بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش ہوں کہ سو نہیں سکتا۔

آج چمپا نے مجھ سے بات کی۔ پہلی بار!

شام کو جب میں کام سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر سناٹا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ دیوالی کی رات ہے۔ اس لئے فٹ پاتھ کے ہمارے سب پڑوسی روشنیاں دیکھنے، بھیڑ میں جیبیں کاٹنے بھیک مانگنے اور مندروں میں سے مفت مٹھائی لانے گئے ہوئے ہیں۔ صرف چمپا وہاں موجود تھی اور وہ نل کے پاس بیٹھی ہوئی اپنی کُتیا کو نہلا رہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ دوسروں کی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر چمپا سے بات کرلوں لیکن پھر میں نے سوچا شاید جھڑک دے۔ اس لئے میں نے صرف کھنکھار کر اپنی واپسی کا اعلان کیا اور پھر چٹائی کو زور زور سے جھاڑا ـــــ

”اری موتی!“ چمپا نے بظاہر کُتیا سے کہا ”تو دیوالی کی روشنیاں دیکھنے نہیں جاتے گی؟“

کُتیا نے اپنا گیلا سر زور سے ہلایا۔ اور پانی کے ننھے ننھے قطرے ہوا میں اُڑنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ سوال دراصل مجھ سے کیا گیا ہے لیکن پھر بھی مجھ میں براہِ راست بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

پھر وہ بولی۔

”شاید تجھے بھیڑ سے ڈر لگتا ہے۔ آج سڑکوں پر لوگ بھی تو بہت ہوں گے۔“

اس بار میں بول ہی پڑا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو چمپا۔ میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا۔“

اُسے معلوم تھا کہ میں کچھ کہوں گا لیکن پھر بھی جب میں براہِ راست اُس سے بات کرنے کی جرأت کی تو وہ کسی قدر گھبرا سی گئی۔

پھر وہ اُٹھی اور کُتیا سے یا مجھ سے بولی۔

”چلو ہم بھی دیوالی کی روشنیاں دیکھ آئیں مگر دیکھنا بھیڑ بھڑکّے سے دُور ہی رہنا۔“

ایک آدمی، ایک عورت، ایک جانور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمارا عجیب و غریب جلوس

بات یہ ہے کہ چمپا کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے جیسے کئی لڑکیاں پچھلے دو برس میں مجھے فٹ پاتھ پر ملی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب درد چھپا ہے۔ درد بھی اور خوف بھی اُس کی آنکھیں ہرنی کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو شکاریوں کے نرغے میں پھنس گئی ہو اور اُسے ہر لحظہ گولی کھانے کا خوف ہو۔ یا شاید یہ ہرنی گولی کھا کر گھائل ہو چکی تھی لیکن کبھی کبھی جب وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوتی ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔ لیکن میں کن انکھیوں سے دیکھتا ہوتا ہوں۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں کسی حسین پیارے تصور سے چمک رہی ہیں۔ اور اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر دھیمی سی، خفیف سی بجھی بجھی مسکراہٹ اُبھر آئی ہے۔۔۔۔۔۔ جیسے وہ اپنی زندگی کا کوئی بہت خوبصورت بہت پیارا لمحہ یاد کر رہی ہو۔۔۔۔۔۔

ہر شخص نے اُس سے دوستی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چمپا کسی سے بات نہیں کرتی۔ کئی آوارہ نوجوانوں نے اُس کی طرف دیکھ کر سیٹیاں بجائی ہیں۔ آہیں بھری ہیں، پھبتیاں کسی ہیں لیکن چمپا نے آج تک کسی کو منہ نہیں لگایا۔ دُنیا میں اس کا صرف ایک دوست اور ساتھی ہے۔ وہ ہے ایک لنگڑی خارش زدہ بھوک کی ماری کُتیا جسے وہ موتی موتی کہہ کر پکارتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ایسی خوبصورت جوان لڑکی اتنے بدصورت مکروہ جانور سے کیسے پیار کر سکتی ہے لیکن فٹ پاتھ کی دُنیا میں انوکھے کردار رہتے ہیں۔ عجیب و غریب واقعات ہوتے ہیں اور اس لئے تھوڑے دنوں میں ہم چمپا اور اس کی کُتیا کو بھی اپنے فٹ پاتھ کی چھوٹی سی برادری میں شامل سمجھنے لگے ہیں لیکن وہ اب بھی ہم میں سے کسی سے بات نہیں کرتی۔

دن میں چمپا کیا کرتی ہے؟ مجھے کیا کسی کو بھی نہیں معلوم لیکن ہر شام جب میں کام سے لوٹ کر آتا ہوں تو میرا دل اس خوف سے دھڑکتا ہوتا ہے کہ شاید وہ ہمارا فٹ پاتھ چھوڑ کر کہیں اور نہ چلی گئی ہو لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ وہ موجود ہے اور اپنے کونے میں بیٹھی موتی سے باتیں کر رہی ہے جیسے وہ کُتیا نہ ہو اُس کی سہیلی ہو۔ اس وقت مجھے ایک عجیب اطمینان اور خوشی کا احساس ہوتا ہے اور بے اختیار میں کوئی فلمی گیت گنگنانے لگتا ہوں اور رات کو جب ہم سب چیتھڑے یا ردی کاغذ بچھا کر اپنے اپنے بستر تیار کرتے ہیں تو دو چار من چلے ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ چمپا کے کونے کی طرف سرکتے جائیں۔ رگھیا جس کا سیاہ جسم پہلوانوں جیسا ہے اور بنسی جو دُبلا پتلا ہے اور ہمیشہ پان کھاتا اور فلمی گیت گاتا رہتا ہے اور جو کسی سینما کے سامنے ٹکٹوں کا کالا بازار کرتا ہے۔ ان دونوں کی گندی نگاہیں ہمیشہ چمپا کا پیچھا کرتی رہتی ہیں لیکن چمپا اطمینان کی نیند سوتی ہے۔ اس لئے کہ رات بھر موتی اس کے سرہانے بیٹھی چوکیداری کرتی ہے اور اگر کوئی چمپا کی طرف ایک قدم بھی بڑھاتا ہے تو وہ اتنے زور سے بھونکتی ہے کہ سب جاگ اُٹھتے ہیں اور مجرم شرمندہ ہو کر بڑبڑاتا اپنے بستر پر واپس آ کر لیٹ جاتا ہے۔

کل رات تو موتی نے رگھیا کی ٹانگ ہی پکڑ لی تھی۔ اگرچہ وہ یہی کہے جا رہا تھا کہ میں تو نل پر پانی

موسم بہار فٹ پاتھ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ گل مہر کے پیڑ پر پتہ ایک بھی نہیں لیکن اُس کی سوکھی ٹہنیوں پر ہزاروں لال لال پھول کھل گئے ہیں۔ جب کبھی میں اُن پھولوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ان میں کوئی گہرا فلسفیانہ اشارہ چھپا ہوا ہے۔ اگر میری بے رنگ زندگی اِس سوکھی ہوئی ٹہنیوں والے پیڑ کی طرح ہے تو یہ سرخ پھول ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ مگر۔ بس۔ اس کے آگے میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ اصل میں فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو کوئی فلسفہ نہیں سوجھتا۔ یہ اور بات ہے کہ فلموں میں بھکاری بھی بات بات پر فلسفہ بگھارتے ہیں لیکن دراصل وہ خیالات بے چارے بھکاری کے نہیں ہوتے، مکالمہ نویس کے ہوتے ہیں۔ جو شاید اپنے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر فٹ پاتھ کا فلسفہ سوچتا ہے۔

پھر بھی اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ بہار کا موسم شروع ہو چکا ہے اور شاید میری زندگی میں بھی بہار آ گئی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں گل مہر کے پھولوں کو دیکھتا رہوں اور اس سے بھی زیادہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں چمپا کو دیکھا کروں۔ چمپا جس کا حسن فٹ پاتھ کی اس گندی دُنیا میں اتنا ہی عجیب اور حیرت انگیز ہے جیسے کیچڑ میں اُگا ہوا کنول یا سوکھی ہوئی ٹہنیوں پر کھلے ہوئے سُرخ پھول۔۔! مجھے نہیں معلوم وہ کہاں سے آئی ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے۔ اُس کی سانولی رنگت میں چمک بھی ہے۔ اور پُرانے سونے جیسا ایک مدھم سا پیلا پن بھی ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں جو پلکوں کی جالیوں میں سے ایسے جھانکتی ہیں جیسے کوئی پردہ دار حسینہ۔ لمبے چمکیلے سیاہ بال۔ جنہیں وہ اکثر ایک ٹوٹے ہوئے کنگھے سے بیٹھی بیٹھی سنوارا کرتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بالوں میں بھی جان ہے۔ اپنی الگ شخصیت ہے۔ کبھی وہ ہوا کے جھونکے سے چمپا کے چہرے پر بکھر جاتے ہیں۔ کبھی وہ کنگھے کے ٹوٹے ہوئے دانتوں سے اُلجھ جاتے ہیں۔ کبھی لمبی چوٹی کی شکل میں ناگن بن کر دیکھنے والوں کو ڈستے ہیں، کبھی جوڑا بن کر سمٹ جاتے ہیں۔ چمپا کے پاس زیور تو کیا کوئی ڈھنگ کا کپڑا بھی نہیں ہے۔ جوانی سے گدرایا ہوا اس کا بدن میلے گندے چیتھڑوں میں چھپا رہتا ہے لیکن اس کے گھنے لمبے چمکیلے سیاہ بال زیور اور گہنوں، ریشمی ساریوں اور ہر طرح کی آرائش سے زیادہ دلکش اور خوبصورت ہیں___

اپنے کونے میں بیٹھا بیٹھا میں چمپا کو گھورتا رہتا ہوں۔ ہمارے فٹ پاتھ پر جتنے لوگ رہتے ہیں___ سب ہی اُسے گھورتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے ایک خاص نظر سے دیکھتی ہے اور شاید یہ اتفاقیہ ادثہ نہیں تھا کہ کل سویرے ہم نل پر منہ دھونے ایک ہی ساتھ پہنچے اور جب نل بند کرتے ہوئے میرا ہاتھ فاقیہ اس کے ہاتھ کو چھو گیا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹکا نہیں، نہ اُس کی تیوری پر ناخوشی کا کوئی بل آیا بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ اُسے یہ لمس اچھا لگا۔۔۔۔ یا ہو سکتا ہے یہ سب میرے اپنے تخیل کا کرشمہ ہو۔

سو اب میں لیمنگٹن روڈ پر آگیا ہوں تاکہ جب جیب میں سینما دیکھنے کے پیسے نہ ہوں تو فٹ پاتھ پر ہی سے سینما گھروں کی رونق اور ہلچل کا نظارہ کر سکتا ہوں اور جب کسی فلم کا پریمیر ہوتا ہے۔ اس رات تو بڑے بڑے فلم سٹاروں کا نظارہ ہو جاتا ہے۔ کیسی اچھی اچھی موٹروں میں وہ سب آتے ہیں۔ واہ واہ۔ ایک دن تو بھیڑ بھڑکے میں، میں دلیپ کمار کی موٹر کے اتنا قریب تھا کہ موٹر کی کھڑکی میں سر ڈال کر کہہ دیا۔

"ارے واہ یار دلیپ کمار — ہاتھ تو ملاؤ!"

لیکن اُس شور اور گڑبڑ کی وجہ سے شاید اس بے چارے نے سُنا نہیں اور اس سے پہلے کہ مجھ سے ہاتھ مِلاتا پولیس والوں نے دھکے اور لاٹھیاں مار مار کر ہم لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔۔۔

میرے خیال میں مجھے یہاں سے بھی کہیں اور جانا پڑے گا۔ یہ جگہ پولیس تھانے سے بہت ہی قریب ہے۔

۵۲۶

پانچ سو چھبیسویں رات

"جہاں ریلیں لوریاں سُناتی ہیں!"

رات کو خاصی سردی پڑنے لگی ہے اور میں کُھلا فٹ پاتھ چھوڑ کر دادر میں ایک ریل کے پُل کے نیچے آباد ہو گیا ہوں۔ رات بھر ریلیں لوری سناتی ہوئی سر پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سر کی مالش اور سارے بدن کی چمپی ہو رہی ہے اور بالکل مُفت!

رات کو اوڑھنے کے لئے میں کینوس کا ایک پوسٹر لایا ہوں۔ جس پر "رات کی رانی" فلم کی ہیروئن مس چنچل بالا کا جناتی سائز کا چہرہ بنا ہوا ہے۔ صرف ناک ہی ایک فٹ سے زیادہ لمبی ہے اور ایک ایک آنکھ میرے جوتے کے برابر۔ آدھی رات بعد جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو میں کینوس کی اس رنگین رضائی کو اوڑھ لیتا ہوں۔

پہلے تو میں نے شرافت برتی اور کینوس کو سیدھی طرف سے اوڑھتا رہا تاکہ تصویر والی سائڈ باہر رہے لیکن آس پاس کے فٹ پاتھ پر رہنے والے ٹھہرے سب کے سب بدمعاش، لوفر۔ آتے جاتے فقرے کستے۔ چنچل بالا کے حسین چہرے کو تکتے، گھورتے اور ایک بدمذاق نے تو ان حسین ہونٹوں کے اُوپر کوئلے سے ایک مونچھ بھی بنا دی۔ سو اس دن سے میں کینوس کو اُلٹا کر کے اوڑھنے لگا ہوں اور رات بھر مجھے ایک عجیب خوشبو خواب میں پریشان کرتی رہتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کینوس اور آئل پینٹ کی بُو ہے یا مس چنچل بالا کے چہرے پر جو گلابی پاؤڈر لگا ہے، اس کی خوشبو۔۔۔

آٹھ سو چالیسویں رات

سُرخ پھول اور ایک سانولا پیلا چہرہ!"

اور ایک رات اس نے ہوٹل سے باہر نکلتی ہوئی میم صاحب سے بھیک مانگتے ہوئے اس کے سفید فراک کو اپنے گندے ہاتھ سے چھو لیا۔ میم صاحب نے اُسے تو انگریزی میں گالی دے کر جھڑک دیا، پھر شاید مینیجر سے رپورٹ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگلی رات کو جب ہم اپنے اپنے بستر بچھاتے وہاں پہنچے تو ہمیں پولیس کی مدد سے برآمدے کے باہر نکال دیا گیا۔

جب سے میں موسم کے مطابق کئی مکان بدل چکا ہوں۔ برسات سے پہلے کے گرمی کے مہینے تو میں نے اپالو بندر پر گذارے۔ جب بارشیں شروع ہو گئیں تو ایک بڑی دوکان کے چوڑے برآمدے میں پناہ لی۔ یہ جگہ بارش سے کسی قدر محفوظ تھی لیکن اس دُکان کی شیشے کی کھڑکیوں میں بلا سر کی قدِ آدم نیم برہنہ لڑکیاں جو تیرنے کا لباس پہنے کھڑی تھیں وہ رات بھر مجھے گھورتی رہیں۔ اب میں بیکار نہیں ہوں۔ ایک دفتر میں پینتالیس روپے ماہوار پر چپراسی کی نوکری مل گئی ہے۔ یہ دفتر "امپورٹ ایکسپورٹ" کا ہے۔ یعنی اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر۔ لیکن میں تو کبھی نہ کوئی سامان آتا جاتا دیکھتا ہوں۔ نہ کوئی گاہک آتا ہے۔ البتہ تار دن رات آتے ہیں۔ ٹیلیفون ہر وقت بجتے رہتے ہیں۔ کبھی ہندوستان کے کسی شہر سے تو کبھی کسی دوسرے ملک سے۔ کبھی سنگاپور، کبھی کولمبو، کبھی، لندن، کبھی نیویارک۔ مجھے تو کوئی کالا بازار کا دھندا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب تک اپنے ۴۵ روپے ہر مہینے کھرے ہیں۔ اپنے سے کیا مطلب اُس دفتر میں ہوتا کیا ہے۔

ہاں تو کام میرے پاس ہے لیکن سر چھپانے اور سامان رکھنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی کھولی کے لئے دو دو سو روپے پگڑی مانگتے ہیں۔ اتنے روپے اکٹھے میرے پاس کہاں سے آتے؟ ہو سکتا تھا کہ میں شہر کے باہر مزدوروں کے جھونپڑوں کی بستیوں میں چلا جاتا۔ جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے خود تعمیر کی ہیں لیکن ایسی بستیاں شہر سے بہت دُور ہیں اور میں شہر کے ہنگاموں میں رہنا چاہتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ قریب سے ایک ٹرام گذر جاتے تو میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ اور اب درجنوں ٹراموں اور بسوں کے شور میں بھی آرام سے سوتا رہتا ہوں۔ کان پر جُوں نہیں رینگتی بلکہ اب شہر کی ہلچل، روشنی، دوڑ دھوپ اور چیخ و پکار کے بغیر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اُدھوری ہے۔

یہ بھی ممکن تھا کہ میں چار پانچ آدمیوں کے ساتھ مل کر ایک کھولی لے لوں۔ ایسی حالت میں مجھے دس بارہ روپے ماہوار کرایہ دینا پڑتا۔ کسی دوست کی مہربانی سے رات بھر کے لئے میں ایسی کھولی میں سویا بھی۔ لیکن وہاں اتنی گرمی تھی، اتنی گرمی تھی کہ رات بھر میں پسینے میں شرابور رہا۔ چھوٹی سی کوٹھری نہ کھڑکیوں کی اور اس میں چھ سونے والے اور سب کے ہاضمے خراب۔ سب خراٹے لینے والے۔ پہلے ہی دن میں وہاں سے بھاگ آیا۔ اُس کوٹھری سے تو اپنا ہوادار فٹ پاتھ ہزار درجے بہتر ہے۔

آتی ہیں۔ یہ سب تو اصل ہیں اصل۔ فٹ پاتھ پر لیٹے لیٹے اُن کے عطر اور سینٹ کی خوشبوئیں سُونگھی جا سکتی ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی جارجیٹ کی ساڑی یا پاؤں تک کا فراک قریب سے گذرتا ہے تو اس کا نرم لمس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گوری گوری پنڈلیاں نظر آتی ہیں۔ میرے قریب ہی جو نوجوان سوتا ہے، وہ فلموں میں اکسٹرا کا کام کرتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اگر ہم آدمی نہ ہوتے سینما کا کیمرہ ہوتے —— اور جو کچھ ہم لیٹے لیٹے کنکھیوں سے دیکھتے ہیں وہ فلم کر لیا جاتا تو سنسر والے اُس سین کو کبھی پاس نہ کرتے! ——

اور ڈائیلاگ تو ایسے ایسے سُنائی دیتے ہیں کہ کیا کبھی کسی فلم میں سُنے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ شراب بندی کے اس دور میں بھی بڑے بڑے ہوٹلوں میں ایک "پرمٹ روم" ہوتا ہے۔ جہاں بڑے آدمی سرکاری لائسنس لے کر شراب پیتے ہیں۔ شاید اسی لئے آدھی رات کے بعد جو لوگ ہوٹل سے نکلتے ہیں، وہ بہت ہی رنگین اور مزے دار باتیں کرتے ہوتے ہیں۔ بے جھجک اور بہت ہی بے تکلفی سے۔ زمین پر پڑی ہوئی مخلوق سے بے پروا۔ جیسے ہم مُردے ہوں یا بے زبان بے عقل جانور ہوں۔ یا شاید وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تو سو رہے ہیں اور جاگ بھی رہے ہیں تو فٹ پاتھ پر بسنے والے انگریزی کی گفتگو کیسے سمجھ سکتے ہیں اور انھیں میرے میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ کا علم ہی نہیں ہے۔ نہ انھیں معلوم ہے کہ میرے قریب سونے والا راجو جو اپنے کو محکمہ بیکاری کا انسپکٹر کہتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس ہے۔ اور وہ ہماری ہستی کو قطعاً فراموش کر کے بات کرتے ہیں۔

"چلو ڈارلنگ!"

"رات کو اس وقت کہاں؟"

"چلو جوہو چلیں ...... کیسی خوبصورت چاندنی رات ہے!"

اور پھر اُن کے قہقہوں میں موٹریں سٹارٹ ہونے کی آواز شامل ہو جاتی ہیں اور کاریں رواں ہو جاتی ہیں۔ اپالو بندر پر ایک سنّاٹا چھا جاتا ہے۔ صرف سمندر کی لہریں پتھر کی دیوار سے ٹکرا کر فریاد کرتی رہیں اور میری نیند مجھ سے آنکھ چرا کر اُن کاروں کے ساتھ اُڑتی جوہو کے ساحل پر جاتی ہے اور چاندنی رات میں چمکتی ہوئی ریت پر نہ جانے کس کی تلاش میں آوارہ گھومتی رہتی ہے۔۔۔

(۲۷۵)
دو سو پچھترویں رات

"ارے واہ یار! دلیپ کمار!"

تاج محل ہوٹل چھوڑے مجھے کافی دن ہو چکے ہیں۔ دراصل وہ جگہ میں نے اپنی مرضی سے نہیں چھوڑی بلکہ مجبوری سے۔ ہوا یہ کہ ایک لنگڑا خارش زدہ بھکاری بھی ہم لوگوں کے قریب سونے لگا تھا۔

کے بزدل تھے۔ سو وہ انہیں چھوڑے بغیر مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کیا پکڑا ہے بدمعاش کو۔ اب بھاگ کر کہاں جاتا ہے؟ لیکن جب پولیس کی سیٹیوں کی آواز قریب آتی ہوئی سنائی دی تو اُس نے بڑے زور سے میرے لات ماری۔ لیکن میں نے جب بھی پتلون کا پائنچہ نہ چھوڑا۔ میں دھڑام سے فٹ پاتھ پر گر گیا اور میرے سر میں اتنے زور سے پتھر لگا کہ تارے نظر آنے لگے اور جب میرے ہوش و حواس ٹھکانے ہوتے تو میں نے دیکھا کہ ڈاکو کی پتلون تو میرے ہاتھ میں ہے اور ڈاکو سڑک پر بھاگا چلا جا رہا ہے...... ادھ ننگا..... بے شرم کہیں کا!

ڈاکو کی پتلون اچھے قیمتی کپڑے کی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا اسے گول کر جاؤں لیکن پھر میں نے آزاد ہندوستان کے ایک معزز شہری کی حیثیت سے اپنے فرض کا احساس کیا اور اس پتلون کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس نشانی سے سرکاری جاسوس فوراً ڈاکوؤں کا پتہ لگا سکیں گے اور میرے بینک کا لُٹا ہوا روپیہ واپس مِل جائے گا، لیکن تھانے میں جب انہوں نے میرا پتہ پوچھا اور میں نے جواب دیا "بینک کے سامنے والا فٹ پاتھ" تو ان لوگوں کی نظریں ہی بدل گئیں اور وہ لگے مجھ سے سوال کرنے جیسے میں معزز اور فرض شناس شہری نہیں کوئی چور ڈاکو ہوں۔ اس کے بعد میں نے طے کر لیا کہ بینک کے قریب سونا خطرناک ہے۔ اس سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے وہ بینک میرا نہیں کسی اور کا ہو۔

اور اگلے دن سے میں تاج محل ہوٹل میں اُٹھ آیا۔ میرا مطلب ہے تاج محل ہوٹل کے باہر والے برآمدے میں۔ جہاں اس ہوٹل کے میرے جیسے غیر سرکاری مہمان قیام کرتے ہیں۔ اس جگہ میں کئی سہولتیں ہیں۔ ایک تو سمندر کے کنارے ہے، اس لئے رات کو اکثر ٹھنڈی ہوا آیا کرتی ہے۔ دوسرے جہاں میں سوتا ہوں، وہاں سے کچن قریب ہے اور کھانوں کی اتنی اچھی اچھی خوشبوئیں آتی ہیں کہ خواب میں ہمیشہ مرغ مسلّم اور کٹلٹ کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ رات کو دیر سے آنے اور جانے والے مہمانوں کا نظارہ مفت میں ہوتا ہے۔ کالے سوٹوں والے ولایتی صاحب لوگ، پتلے ریشمی فراک پہنے، میمیں، کھادی پہنے لیڈر مہاشے اور باریک شیفون کی ساڑیاں اور ولایتی سینٹ لگائے اُن کی شریمتیاں، ہیرے جواہرات سے لدی ہوئی رانیاں مہارانیاں۔ بڑی بڑی خوبصورت کاریں۔

"ٹاٹا۔ مائی ڈیر!"

"بائی بائی ڈارلنگ!"

دولت اور حُسن اور فیشن کا یہ تماشا سینما سے بھی زیادہ دلچسپ ہے اور پُر لطف ہے اور پھر بالکل مُفت، بلا ٹکٹ۔ سینما میں تو چلتی پھرتی پرچھائیاں ہوتی ہیں لیکن یہ میمیں، میمیں، یہ بیگمیں، یہ رانیاں یہ دیویاں، یہ کماریاں اور شریمتیاں۔ یہ حسین عورتیں جو تاج محل ہوٹل میں ڈنر کھانے اور ڈانس کرنے

کے شیشوں پر اس کا سایہ کپڑے بدلتے ہوتے نظر آجاتا اور میری نیند اُچاٹ کرجاتا لیکن کہیں بھی میں دو چار راتوں سے زیادہ نہ گزار سکا۔ ہر جگہ سے پولیس والوں نے مجھے ہنکا دیا۔ جیسے اُن ڈھور ڈنگروں کو ہنکا دیا جاتا ہے جو پکی ہوئی کھیتی میں گھس آتے ہیں۔ ہر بار میں سوچتا۔ " ارے بھایو! میں محل نہیں مانگتا، بنگلہ نہیں مانگتا لیکن مجھے آسمان تلے کسی صاف ستھری، ہوادار جگہ تو سونے دو" لیکن اب مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ جیسے غریب غربا امیروں کے گھروں میں نہیں رہ سکتے۔ اُسی طرح وہ امیروں کے ٹہلنے کی تفریح گاہوں یا اُن کے گھروں کے سامنے فٹ پاتھ پر بھی نہیں سو سکتے۔

سو اب میں فیروز شاہ مہتہ روڈ پر مقیم ہوں۔ عین ایک بینک کے سامنے سوتا ہوں نہ جانے کیوں، مگر یہاں سو کر بہت اطمینان محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بینک میری ہی ملکیت ہو اور میں وہاں اپنے روپے کی حفاظت کے لئے سو رہا ہوں۔

سوتے وقت میں ہمیشہ اپنا منہ بینک کی شیشے والی دیواروں کی طرف رکھتا ہوں۔ یہاں بڑے بڑے سنہری حروف میں لکھا ہے"۔ اس بینک کا سرمایہ ہے ......۵" اب مجھے اپنی پتھر کی سیج پر سونے کی عادت پڑ چکی ہے لیکن آنکھ بند کرنے سے پہلے میں کافی دیر تک ان سات سنہری صفروں کو تکتا رہتا ہوں۔

۵...... یعنی پانچ کروڑ یا پچاس کروڑ؟ حساب میں میں ہمیشہ کمزور ہوں۔

کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس چاندی کے روپوں کا ایک ڈھیر ہے۔ لاکھوں کروڑوں روپے اور میں انہیں سڑک کے برابر رکھتا چلا رہا ہوں یہاں تک کہ چاندی کی یہ زنجیر بمبئی سے ہاتھرس تک جا پہنچی ہے۔ ہاتھرس جہاں میرے ماتا پتا اس اُمید میں دن بتا رہے ہیں کہ ایک دن اُن کا سپوت بمبئی سے لاکھوں روپے کما کر لائے گا۔

۱۲۷ ایک سَو ستائیسویں رات

میرا پتہ —— تاج محل ہوٹل۔

جس رات بینک میں ڈاکہ پڑا مجھے وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ اس رات کے واقعات اب تک میری یاد میں اس طرح گھومتے ہیں جیسے سینما کے پردے پر کوئی ڈرامہ۔ بینک میں آپ سے بجنے والی بجلی کی گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ صبح کے تین بجے ہوں گے کہ یہ گھنٹی دفعتہً بجنے لگی اور آس پاس کے سب فٹ پاتھ پر سونے والے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ڈاکو بینک کی کھڑکی میں سے کود رہے ہیں۔ مجھے اُن پر بہت غصہ آیا۔ کیونکہ آخر وہ میرا ہی تو بینک تھا۔ جس میں انہوں نے ڈاکہ ڈالا تھا اور میرا ہی روپیہ تو وہ لے کر بھاگ رہے تھے......

سو میں نے ایک ڈاکو کو اُس کی پتلون کا پائنچہ پکڑ کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے ہاتھوں میں نوٹوں

پہلی (۱) رات

بے درودیوار کا ایک گھر بنانا چاہیئے“

”بیٹا پہلی ہی رات سب سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے“ بھکاری کا کہنا کتنا صحیح تھا۔ اُس رات کو مشکل سے چند منٹ سو سکا ہوں گا۔ فٹ پاتھ کے پتھروں کی ہزاروں نوکیں میرے بدن میں چبھ رہی تھیں۔ قریب کی نالی سی دُنیا کی بدترین بدبوؤں کے جھونکے آ رہے تھے۔ مجھے نووارد سمجھ کر ایک خارش زدہ کتا میرا معائنہ کرنے پر تلا ہوا تھا ایک مریل سی بلی میری ٹانگوں میں اُلجھتی ہوئی ایک چوہے کا پیچھا کر رہی تھی۔ اور چند لمحے پہلے یہی چوہا میرے پاؤں کی انگلیوں کو کترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پیروں کی حفاظت کے لئے جوتے پہن کر سوؤں۔ اندھیرے میں ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ جوتے غائب ہیں۔ میں نے طے کیا کہ آئندہ سوتے ہوئے کبھی جوتا نہیں اُتاروں گا۔

جب آنکھ نہ لگی تو میں نے بیڑی سلگائی۔ اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ ستارے اُس فٹ پاتھ سے دور، بہت دور تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خوف ہوا کہ آس پاس کی اونچی اونچی عمارتیں جھک کر مجھے دیکھ رہی ہیں اور نہ جانے کب اڑا اڑا دھم کر کے گر پڑیں اور ہم فٹ پاتھ پر سونے والوں کو چکنا چور کر دیں۔

اسکول میں پڑھا ہوا غالب کا ایک مصرع یاد آیا ع

”بے درودیوار کا اک گھر بنانا چاہیئے“

بہت کوشش کی کہ دوسرا مصرعہ یاد آ جائے لیکن یاد نہ آیا۔ اس لئے دیر تک یہی گنگناتا رہا۔

”بے درودیوار کا اک گھر بنانا چاہیئے“

میں نے سوچا شاید غالب بھی فٹ پاتھ پر رہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ بھی تو بے درودیوار کا گھر ہے۔ اور پھر ایک فلمی گیت کا ٹکڑا نہ جانے کہاں سے تیرتا ہوا آگیا۔

”بستر بچھا دیا ہے تیرے گھر کے سامنے“

پھر میں نے پتھریلے فرش پر پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔ شعر کہنا آسان ہے اور فٹ پاتھ پر سونا مشکل

اڑتالیسویں (۴۸) رات

چاندی کی لمبی سڑک۔

اب میں فٹ پاتھ کے پُرانے رہنے والوں میں شمار کیا جاتا ہوں۔

اُس پہلی رات کے بعد کتنی راتیں میں نے ایک مناسب بیڈروم کی تلاش میں گزاریں۔ کبھی مالابار ہل پر ہینگنگ گارڈن کی ایک بنچ پر سویا۔ کبھی چوپاٹی کی نرم ریت پر سمندر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں۔ کبھی میرین ڈرائیو پر ایک مشہور فلم سٹار کے فلیٹ کے عین سامنے ۔۔۔۔۔ اتنے قریب کہ کبھی کبھی کھڑکی

آنکھوں کی چمک میرے گالوں کی سُرخی، میرے بدن کی طاقت اُن تیس دنوں میں کہاں غائب ہوگئی تھی؟ میں ہاتھرس سے بمبئی تھرڈ کلاس میں آیا تھا۔ لیکن بلا ٹکٹ نہیں۔ ٹکٹ کے علاوہ میری جیب میں بائیس روپے تھے۔ میٹریکولیشن کا سرٹیفکٹ تھا۔ اور اپنی پرانی لیکن کام کرتی ہوئی گھڑی تھی جو مجھے اپنے سورگباشی پتا سے ورثے میں ملی تھی اور میرے دل میں جوانی کا جوش تھا، کام کرنے اور ترقی کرنے کی اُمنگ تھی۔

میرے ایک دوست نے اپنے چچیرے بھائی کے نام ایک چٹھی دی تھی کہ جب تک مجھے کام اور رہنے کی کوئی الگ جگہ نہ مل جائے وہ اپنے ہاں مجھے رکھ لے۔ وہ بے چارہ ایک کپڑے کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اور اپنی بیوی اور دو بچوں سمیت پریل کی ایک چال میں پانچویں مالے پر ایک کوٹھری میں رہتا تھا جو بمبئی کی زبان میں کھولی کہلاتی ہے۔ یہ کوٹھری یا کھولی رہنے کے علاوہ نہانے دھونے اور کھانا پکانے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ کھولیوں کی قطار کے پیچھے ایک پتلا سا برآمدہ تھا جس سے ہوکر مشترکہ پاخانوں کو راستہ جاتا تھا۔ رات کو میں برآمدے میں چٹائی بچھا کر سو رہتا۔ قریب ہی ایک کارخانے کی چمنی تھی جس کا دھواں اکثر ہوا کے ساتھ اُڑتا ہوا وہاں آجاتا۔ اس کے علاوہ پاخانوں کے نل کبھی کام نہ کرتے تھے اور رات بھر ایسا معلوم ہوتا جیسے اصغر علی محمد علی تاجر کے کارخانے سے خوشبوؤں کے بھبکے آرہے ہیں۔ لیکن دن بھر کام تلاش کرنے کے بعد میں گھر لوٹتا تو اتنا تھکا ہوا ہوتا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا۔ نہ فیکٹری کا دھواں مجھے ستاتا نہ پاخانوں کی بدبو اور نہ اُن تمام لوگوں کے سُریلے خراٹے جو میری طرح اُس برآمدے میں سوتے تھے۔ اور میں اپنے دوست کے بھائی کا احسان مند تھا کہ اُس کی مہربانی سے میرے پاس سر چھپانے کا ٹھکانہ تو ہے۔ گھر سے خط منگانے کا ایک پتہ تو ہے۔

اور پھر ایک رات کو جب ہوا بند تھی اور برآمدے میں ہم لوگ ہاتھ کے پنکھے جھلنے پر مجبور تھے۔ کھولی کے بند دروازے کے پیچھے سے مجھے کھُسر پھُسر سنائی دی۔

"باپ رے کیسی گرمی ہے!" بیوی کہہ رہی تھی۔ بھگوان کے لئے دروازہ تو کھول دو۔ شاید ہوا کی کوئی لہر آجائے۔"

"پاگل ہوئی ہے؟" اُس کے پتی نے جواب دیا۔ دروازہ کیسے کھول سکتے ہیں جب "وہ" وہاں سو رہا ہے؟ یہ تو بڑی بے شرمی ہوگی۔"

سو اگلے دن وہ یعنی میں نے اُن سے کہا کہ میں نے دوسری جگہ سونے کا انتظام کر لیا ہے۔

"سوچ لو بھائی! نہ جانے وہاں تمہیں آرام بھی ملے گا۔" اُس شریف آدمی نے تکلف کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

اور میں نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ "فکر نہ کرو وہاں جگہ بہت ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ اتنی بڑی جگہ ہے جتنا بمبئی شہر!

الف لیلہ ۱۹۸۰ء

یعنی پتھر کی سیج پر ایک ہزار راتیں

بیٹا! پہلی ہی رات ہمیشہ سب سے زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔"

بوڑھے بھکاری کے یہ الفاظ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

جس اناڑی پن سے میں فٹ پاتھ پر اخبار کے کاغذ بچھا کر سونے کی تیاری کر رہا تھا اُس سے وہ پہچان گیا تھا کہ میں اُس دنیا میں نوارد ہوں۔ اور پھر ایک خشک سی ہنسی ہنستے ہوئے اُس نے کہا۔

"لیکن گھبراؤ نہیں بیٹا! بہت جلد اس پتھر کی سیج پر سونے کی عادت پڑ جائے گی۔"

اپنی نئی زندگی کی پہلی رات گزارنے کے لئے میں نے جان بوجھ کر ایک سنسان سی گلی کا تاریک سا فٹ پاتھ تلاش کیا تھا۔ ہر لمحہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کوئی جاننے والا نہ مل جائے۔ ان تین برسوں میں اُس خودداری اور شرم کے احساس کو میں کتنی دور چھوڑ آیا ہوں۔ دراصل یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اُس رات کو میری موت واقع ہوئی۔ "پرانا" میں "مر گیا اور

فٹ پاتھ سے پہلے

مجھے اُس وقت بمبئی آئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ لیکن اُن تیس دنوں میں میری کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نوجوان جو بوری بندر کے اسٹیشن پر آتا تھا۔ اب ساٹھ برس کا بڈھا ہو چکا ہے۔ نہ جانے میری

کے کام میں اس کو ایک گمنام لڑکی کو یاد کرنے کی کب فرصت ہوگی۔ مگر اس وقت بینا کو وہ احساسِ فتح نصیب ہوگا۔ جو ایک آرٹسٹ کو اپنا شاہکار دیکھ کر نصیب ہوتا ہے۔

بینا اٹھی، دروازہ کھولا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"عصمت عورت کا بہترین زیور ہے۔ کیا تو اس کو یوں لٹا دے گی؟" اور جب یوں بھی نہ مانی تو اُس کو ڈرانے کی کوشش کی۔ "وہ بیمار ہے۔ اس کے پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔ تجھے کوئی بیماری لگ جائے گی۔"

مگر بینا اس وقت اُن خوفناک سولہ برسوں کا خیال کر رہی تھی جو وجے سنگھ نے قید میں گزارے تھے۔ وہ طویل عرصہ جس میں وہ زندگی کی ہر دلچسپ اور خوشگوار رنگینی سے محروم رہا تھا۔ سینما اور تھیٹر، گانا اور ناچ۔ بچوں کی آواز، غروب آفتاب کا رنگین منظر۔ چاند اور ستارے۔ برسات کی رم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ درختوں کی چھاؤں۔ پھولوں کی بہار، ماں کی ممتا۔ اولاد کی اُمنگ۔ عورت کا پیار اور کل پھر وہ اُسی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور یہ زندگی کے بارہ گھنٹے یونہی گذر جائیں گے۔ وجے سنگھ اپنی پیاس کو ساتھ لئے واپس چلا جائے گا۔ وہ جس نے اپنی جوانی قوم کی آزادی اور انقلاب کے لئے قربان کر دی تھی۔ اس کے واسطے ایک عورت چند گھنٹے کے لئے اپنا جسم بھی دینے کو تیار نہ ہوگی۔ عورت۔ نرمی۔ پیار۔ دل کے قریب ایک اور دھڑکن۔ سولہ برس تک وہ اُن سے محروم رہا۔ اِس وقت اُس کو اگر یہ نصیب نہ ہوا تو شاید مرتے دم تک نصیب نہ ہو۔

نہیں وہ ایسا نہ ہونے دے گی۔ اُس نے اپنی جان انقلاب کے لئے وقف کر دی تھی اپنی جان۔ اور اپنا جسم۔ اپنی عصمت بھی۔ وجے سنگھ کی قربانیوں کے سامنے اس کے حقیر جسم کی کیا وقعت تھی۔ اس سے بہتر جسم بازار میں پانچ پانچ روپے میں فروخت ہوتے ہیں۔ نہیں۔ وہ اپنی محبت سے، اپنے بدن کی گرمی سے وجے سنگھ کو آرام پہنچائے گی۔ چند گھنٹے میں سولہ برس کی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے بدن میں وجے سنگھ کو چند لمحے کے لئے ہی سہی، پھولوں کی بہار، بچوں کی آواز، ماں کی ممتا، موسیقی کی جھنکار، غروب آفتاب کی رنگینی، برسات کی رم جھم سب کچھ مل جائے گا۔ اور آئندہ زمانے میں جب وہ جیل کی سختیوں سے تنگ آکر دنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگے گا تو اُسے ان چند گھنٹوں کی یاد آئے گی۔ ایک لڑکی کی یاد۔ ایک نوجوان جسم کی یاد۔ اور وہ مسکرا دے گا۔ مایوسی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ وہ زندگی سے منہ موڑتے موڑتے رک جائے گا۔ وہ اپنے جسم اور دماغ اور دل کو زندہ رکھے گا۔ ہندوستان کی خاطر۔ انقلاب کی خاطر اور پھر جب ملک آزاد ہو جائے گا تو وجے مایوس اور شکستہ خاطر نہیں بلکہ مسکراتا ہوا قیدخانے سے نکلے گا۔ تاکہ پھر اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کر سکے۔ لاکھوں اُس کی کہانی سنیں گے اور اس کی قربانی اور ایثار سے اُن کے سر بلند ہو جائیں گے اور دل فخر سے بھر جائیں گے۔ اس وقت شاید وجے سنگھ بینا کا نام بھی بھول جائے گا۔ انقلابی حکومت کو چلانے

آخری بار! اس لئے اگر اُسے آخری بار اپنے گھر جانے کی اجازت ملی تھی تو عدالت سے سیدھا وہیں لے جانا ہوگا۔

"بس دس منٹ دے سکتے ہیں۔" پولیس کے دو سپاہیوں میں سے بڑے والے نے کہا۔ جب وہ لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اُس کے فلیٹ پر پہنچے جو تیسری منزل پر تھی۔

آدمی نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "آپ اجازت دیں تو میں اس کمرے میں دس منٹ اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ مرنے والی کی یادوں کے ساتھ! آپ دروازے پر پہرہ دے سکتے ہیں۔"

بڑے والے کانسٹبل نے کمرے کے اندر جاکر دیکھا، باہر جانے کے لئے دوسرا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی۔ سڑک سے پچاس فٹ اُونچی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اُس نے کہا "مگر کوئی گڑبڑ نہ ہو ورنہ یہ دیکھ لو ——" اور اُس نے اپنی پیٹی میں لگے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

آدمی نے اندر سے دروازہ بند کرلیا مگر کانسٹبلوں کو اطمینان ہوگیا جب چٹخنی لگانے کی کوئی آواز نہیں آئی۔

"عجیب آدمی ہے یہ بھی۔" چھوٹے والے کانسٹبل نے اپنے ساتھی سے کہا "پہلے تو اپنی بیوی کو قتل کیا اور اب اُسی کمرے میں اُس کی یاد کر رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اُس کی بیوی کا بھوت اُس کا ٹینٹوا دبا رہا ہوگا۔"

بڑے والے کانسٹبل نے اپنا تجربہ بگھارتے ہوئے کہا "تم کیا جانو۔ یہ سب خونی پاگل تو ہوتے ہی ہیں۔ اُن کے سر پر خون سوار ہوجاتا ہے۔ یہ بے چارہ تو فوج میں تھا۔ سُنا ہے گورنمنٹ نے میڈل بھی دیا ہے۔ دس دشمن مارے تھے اُس نے۔ چھاپہ ماروں کے دستے میں تھا یہ۔"

چھاپہ مار! کمانڈوز! فقط اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ اس کے دماغ میں ایک شبہ بجلی کی طرح کوندا۔ "چھاپہ ماروں کو تو اُونچے مقاموں سے کودنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔"

دوسرے لمحے ہی وہ دونوں کمرے کے اندر تھے مگر وہ کمرہ خالی تھا۔ کھڑکی کے پٹ ہوا سے ہل رہے تھے۔ جب انہوں نے نیچے دیکھا تو وہ سڑک کی دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اتنے میں پیٹی سے پستول ہاتھ میں آیا۔ وہ بھیڑ میں کھو گیا تھا۔

مگر کودنے سے پہلے آدمی اپنے جوتے اُتار کر چھوڑ گیا تھا۔ "فکر نہ کرو۔" بڑے والے کانسٹبل نے کہا۔ "میرے کتے اِن جوتوں کی بُو سے اُسے کھوج نکالیں گے!"

تو وہ بڑبڑایا۔ "بس دو خون ؟ میں نے تو بارہ خون کئے ہیں۔" اور پولیس افسر سمجھے خون اس کے سر پر چڑھ گیا ہے یا وہ جان بوجھ کر دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔

●

"مجرم!" جج اُس سے مخاطب تھا مگر اُس سے آنکھیں چرا کر دیکھ رہا تھا وکیل صفائی کی طرف۔ اس سے پہلے کہ تمہیں سزائے موت دی جائے، تمہیں کچھ کہنا ہے؟"

اور اسی لمحے میں آدمی کے دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کیا کہے گا ــــ اور کیا کرے گا۔ وہ آہستہ سے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا "جی جناب" اُس نے کہا اور جج کی طرف آنکھیں گڑا کر دیکھتا رہا مگر وہ اب بھی کسی دوسری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"بزدل کہیں کا!" آدمی نے سوچا "جس کو سزائے موت دی ہے اس سے نظریں ملاتے ہوئے گھبراتا ہے!"

جج نے مجرم کی طرف دیکھے بغیر اُس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا "ہاں تو کیا کہنا ہے تمہیں؟ کوئی آخری خواہش؟"

"جناب والا۔ مرنے سے پہلے میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں جہاں ــــ میری بیوی کو ــــــ جہاں میری بیوی کی لاش پائی گئی تھی۔"

"منظور کیا جاتا ہے۔" جج نے عدالت کے کلرک کو اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر جیل کے قانون اِس کی اجازت دیتے ہیں" اور پھر قیدی کی طرف سے نظر بچا کر اس کے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اور کچھ کہنا ہے؟"

"جی نہیں، جناب والا۔ بہت بہت شکریہ، جناب والا!"

جج تو کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ سو اُس نے تو نہیں دیکھا مگر عدالت میں جتنے اور لوگ حاضر تھے اُنہوں نے دیکھا کہ مجرم کو جب لے جایا گیا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ لوگ بھی جو اب تک اُس سے کچھ نہ کچھ ہمدردی رکھتے تھے اب اُن کو بھی یقین ہو گیا کہ جو آدمی دو بھیانک خون کر کے بھی مسکرا سکتا ہے، اُس کو تو واقعی سزائے موت ہی ملنی چاہیئے۔

●

آدمی کی آخری خواہش اُس کی اُمید سے بھی پہلے ہی پوری ہو گئی۔ جیل کے قوانین کی رُو سے وہ ایک بار پھانسی کی کوٹھری میں بند ہو گیا تو اس کو صرف ایک بار وہاں سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔

جو شیطان بیٹھا ہوا تھا اُس نے حکم دیا تھا کہ اُسے مار دیا جائے اور اُس نے سنگین اُس کی پسلیوں میں اتار دی تھی۔ شاید دس دشمنوں کے بعد یہ پہلے دوست کا خون نہیں تھا، شاید گیارہویں دوست کا خون تھا جو اُس کے ہاتھوں ہوا تھا۔

مگر پھر بھی اُس کو اتنی تسلّی تھی کہ اُس کا دوست بغیر کوئی تکلیف محسوس کیے اِس دنیا سے گزر گیا تھا۔ اُس نے فوجی سنگین کو اُس کی کمر سے جب کھینچ کر نکالا تھا تو بدن ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر زخم سے گرم گرم خون کا ایک فوّارہ نکلا تھا جس کے چھینٹے اس کے کوٹ کی آستین پر گرے تھے۔ ثبوت کے طور پر سنگین کے ساتھ یہ کوٹ بھی مقدمے کے دوران پیش کیا گیا تھا۔ اور سرکاری وکیل نے ڈرامائی انداز میں اس کوٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا "یہ مائی لارڈ جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا" اور وہ یہ سوچ کر مسکرا دیا تھا کہ وکیل صاحب کو یہ نہیں معلوم کہ اس آستین پر تو دس اور انسانوں کا خون بھی پکار رہا ہے مگر وہ خون نہ وکیل صاحب کو نظر آئے گا نہ کوئی عدالت اُس لہو کی پکار سننے کے لئے تیار ہے۔

اور اُس کی آنکھوں میں اُس وقت بھی آنسو تھے جب وہ قتل کے ارادے سے اپنی فلیٹ کے اُس کمرے میں داخل ہوا تھا جہاں اُس کی بیوی سو رہی تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ روشنیاں بجھی ہوئی تھیں مگر کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے پردوں کو سرسراتی ہوئی ہوا کے ساتھ چاندنی بھی دبے پاؤں اندر آ گئی تھی۔ اُس مدھم روشنی میں وہ اتنی خوبصورت، اتنی معصوم، اتنی بھولی بھالی لگ رہی تھی کہ اس کی ہمت نہ پڑی کہ سنگین کو میان سے باہر نکالے۔ پہلے اس کا خونی ارادہ تھا جس ہتھیار سے اُس کے عاشق کا خون کیا ہے اُسی سے اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالے گا مگر اب وہ اِس خیال سے ہی کانپ اٹھا۔ جس سے اُس نے محبت کی تھی وہ اُس کا خون بہتا نہ دیکھ سکے گا۔ یہ کام اُس کو اپنے ہاتھوں سے لینا ہوگا۔ اس کی ٹریننگ بھی اُس کو فوج میں دی گئی تھی۔ کمانڈو اسکول میں کراٹے انسٹرکٹر نے اس کو سکھایا تھا کہ گلے کی کونسی رگ کو دبانے سے دشمن کو ہمیشہ کے لئے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ وہ سبق اس کو آج بھی یاد تھا اور اُس کی بیوی نیند سے بیدار ہوئے بغیر ہی مر گئی اور جو مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر تھی وہ برقرار رہی۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جن ہاتھوں نے بارہ خون کئے تھے۔ مگر اب اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی کے دامن سے بے وفائی کا داغ ہمیشہ کے لئے دھل گیا ہے۔ اب وہ پھر معصوم ہے — اور اس کی ہے۔ ہمیشہ کے لئے اُس کی! اس نے اُس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا — کتنے ٹھنڈے تھے وہ ہونٹ! اُس نے اُس کے ننھے ننھے گورے گورے پاؤں کا بوسہ لیا۔ جو اِس وقت بے جان سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے تھے! پھر وہ اس کے پلنگ کے پائنتی بیٹھ گیا اور وہ آنسو جو اب تک اُس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے وہ بہہ نکلے اور اُسے ایسا لگا کہ وہ رو رہا ہے۔

نہ صرف اپنی بیوی کے لئے، نہ صرف اپنے دوست کے لئے بلکہ اُن گمنام انجان دس آدمیوں کے لئے بھی جو سب اُس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ وہ اُس وقت سسکیاں لے کر روتے جا رہا تھا جب صبح کے اُجالے میں پولیس نے اس کو دو خون کرنے کے جرم میں گرفتار کیا اور جب اُسے فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی

پی گیا۔ نہیں (اُس نے سوچا) میں اُس جج کے سامنے اپنی کمزوری کا اظہار ہرگز نہیں کروں گا۔ کاش اُس جج کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں اُس کی نگاہ میں، اُس کے انداز میں ذرا سا بھی رحم، تھوڑی سی بھی ہمدردی ہوتی ایک انسان کے لئے اُس کی اُن مجبوریوں کے لئے جو کبھی کبھی اس کے ہاتھوں سے قتل کراتی ہیں! پھر وہ اس کو سزائے موت کا حکم بھی سناتا تو آدمی کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ وہ سمجھ جاتا کہ جج بھی مجبور ہے۔ انصاف کے ہاتھوں، قانون کے ہاتھوں تعزیرات ہند کے ہاتھوں۔ پھر وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے دیتا۔ چاہے دیکھنے والے اُسے کتنا ہی بزدل سمجھے۔ مگر اُن آنسوؤں میں اُس کے دل میں جو زہر بھرا ہوا تھا وہ باہر نکل جاتا۔ اُس کی روح پاک اور صاف ہو جاتی اور پھر وہ اُسے پھانسی بھی دے دیتے تو اس کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ پھر وہ خوشی سے موت کو گلے لگا لیتا اس وقت ایک ہی خواہش، ایک ہی آرزو، ایک ہی خیال، ایک سُلگتا ہوا سوالیہ نشان بن کر آدمی کے دل اور دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ کیا وہ جج انسان نہیں تھا؟ کیا وہ صرف قانون کی ایک مشین تھا جس میں انسانی ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں تھا؟ آدمی کو سزائے موت دینا اس کا قانونی فرض تھا۔ مگر کیا رحم اور ہمدردی کا ایک اِشارہ اس کا انسانی فرض نہیں تھا؟ اُس کے قلم کی ایک جنبش نے ایک آدمی کی زندگی کو ختم کرنے کا حکم سنا دیا تھا اور اُس کی آواز میں، اُس کی آنکھوں میں، ذرا سے افسوس کی جھلک نہیں آئی تھی ....

آدمی نے بھی دو انسانوں کو سزائے موت دی تھی ... دو انسان جن سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ ایک اُس کی بیوی تھی اور دوسرا اس کا دوست تھا۔ عدالت کی زبان میں وہ ڈبل خونی تھا مگر جب اس نے اپنے دوست پر اپنی فوجی سنگین سے وار کیا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے من میں اندھیرے میں بیٹھا ہوا کوئی شیطان اُسے قتل پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اُس کی بیوی کا عاشق تھا مگر وہ اُسکا دوست تھا اور سو وہ اُسے تکلیف پہنچا کر مارنا نہیں چاہتا تھا۔ پیچھے سے آ کر اُس نے چپکے سے وار کیا تھا۔ کمر کی تیسری پسلی کے نیچے جہاں دل ہوتا ہے وہاں سنگین کا بس ایک وار ــــ اور اس کا دوست وہیں ڈھیر ہو گیا تھا بغیر یہ جانے ہوئے کہ اس کی دفعتاً موت کا ذمّے دار کون ہے؟ سنگین سے دشمن پر کہاں اور کیسے وار کرنا چاہئیے ــــ یہ اُس کو فوج میں سکھایا گیا تھا۔ اس نے دس کو ــــ اپنے جیسے دس آدمیوں کو ــــ اسی طرح وار کر کے موت کے گھاٹ اُتارا تھا جس کا ثبوت وہ میڈل تھا جو اس کو انعام میں ملا تھا۔ اُس کا دوست گیارہواں تھا۔ وہ دشمن تھے۔ یہ دوست تھا۔ مگر سنگین دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتی۔ سنگین جان لے سکتی ہے مگر خود بے جان ہوتی ہے۔ بے جان، بے روح، بے عقل۔ اور سپاہی جو سنگین چلاتا ہے وہ بھی ٹھنڈے فولاد کی طرح بے روح، بے عقل ہو جاتا ہے۔ کیا وہ دس واقعی اس کے دشمن تھے؟ اس کو تو ان کے نام بھی نہیں معلوم تھے۔ اُس سے پہلے اُس نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کس کے بیٹے تھے، کس کے بھائی تھے، کس کے شوہر تھے، کس کے دوست تھے ــــ اُسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ اُس کو صرف بتایا گیا تھا کہ وہ اُس کے دشمن ہیں۔ اُس کو حکم دیا گیا تھا کہ اُن کو مارنا اُسکا فرض ہے۔ اور سو اُس نے اُن کو مار دیا تھا۔ جنگ سے واپس آنے پر اُس کو بتایا گیا تھا کہ اُس کا دوست دراصل اُس کا دشمن ہے۔ اُس کے من کے اندھیرے میں

سلامتی کی ہی نہیں۔" جج نے جواب دیا۔ "یہ قانون کی بہت بڑی جیت ہوگی تب ہی تو اس بیچارے کی سلامتی میں مجھے اتنی دلچسپی ہے۔"

بے ہوش تو وہ پہلے بھی تھا پھر بھی بے ہوشی کی گیس سنگھائی گئی تو آدمی کا سوتا ہوا لاشعور زندگی اور موت کے درمیان جھولا جھولنے لگا۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کے بدن میں زندگی نہیں تھی۔ وہ مر چکا تھا مگر مکمل طور سے نہیں۔ ذرا سی کسر باقی تھی۔

بے ہوشی کی گیس سنگھائی جا رہی تھی۔ رگوں میں سوئی لگا کر خون چڑھایا جا رہا تھا۔ ایک دوسری سوئی کے ذریعے گلوکوز دیا جا رہا تھا تاکہ آپریشن کے دوران اس کے دل کی حرکت جواب نہ دے جائے۔ ڈاکٹر کی تمام جان، تمام طاقت، تمام قابلیت اب اس کی انگلیوں میں آ گئی تھی جو نشتر لے کر آدمی کی پسلیوں کے پنجرے کو توڑ کر اُس کے سینے کی کھال چیرتی ہوئی اب دل کی طرف بڑھ رہی تھیں جس کی حرکت اب اتنی سست ہو گئی تھی کہ لگتا تھا اس میں اب جان ہی نہیں ہے۔ بے ہوشی کے بادلوں میں سے آدمی کا لاشعور دو آوازیں سن سکتا تھا ـــ کہیں دور کتے بھونک رہے تھے اور ایک آواز تحکمانہ لہجے میں کہے جا رہی تھی۔

"... پھانسی دی جائے یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے اور یہ مر جائے..."

"... پھانسی دی جائے ـــ پھانسی دی جائے..."

"... یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے ـــ دم نکل جائے ـــ"

"مر جائے ـــ مر جائے ـــ مر جائے ـــ"

●

سزائے موت کا فیصلہ سناتے ہوئے جج کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ کوئی جذباتی لغزش نہیں تھی "... پھانسی دی جائے یہاں تک کہ اس کا دم نکل جائے اور یہ مر جائے..."

آدمی کو اپنے گلے کے گرد پھانسی کی رسّی تنگ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تو بے خیالی سے اس نے قمیص کے کالر کے اوپر کے بٹن کو کھول لیا۔ اس کی نگاہیں جج کے چہرے پر ہمدردی یا افسوس کے آثار تلاش کر رہی تھیں۔ (آخر وہ ایک انسانی جسم کو ختم کئے جانے کا حکم دے رہا تھا، صرف قلم کی ایک جنبش سے!) مگر وہاں ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔ جج کے چہرے پر مسکراہٹ تو نہیں تھی مگر کوئی غم، کوئی افسوس، کوئی فکر بھی نہیں تھی۔ اگر چہرے پر کوئی جذبہ تھا تو وہ اطمینان اور فراغت کا تھا کہ ہفتوں کی قانونی رسّہ کشی کے بعد جو استغاثہ اور صفائی کے وکیلوں اور ان کے گواہوں کے درمیان ہوئی تھی، آخرکار یہ مقدمہ بھی اپنے انجام تک پہنچ گیا تھا۔ ایک مصوّر کو اپنا شاہکار مکمل کرنے کے بعد شاید ایسا ہی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

آدمی کو دفعتاً محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے آ رہے ہیں لیکن اپنی قوت ارادی سے ان کو

دل ہی تو ہے

آپریشن تھیٹر کی سفید دیواروں میں تین افراد قید تھے۔
ایک آدمی تھا۔
ایک جج تھا۔
ایک ڈاکٹر تھا۔

ایک آدمی تھا بے سکت، بے ہوش، تقریباً بے جان آدمی آپریشن ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس کے دل میں ایک سوراخ تھا۔ اس کے سوراخ میں پستول کی ایک گولی تھی۔ تھوڑی دیر ہی میں اس کے دل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند ہونے والی تھی۔

جج نے کہا۔ اور اس کی دھیمی آواز بھی اس آپریشن تھیٹر میں ایسی گونجی جیسے وہ عدالت میں فیصلہ سنا رہا ہو۔ "ڈاکٹر اس آدمی کی جان بچانا بہت ضروری ہے۔ یہ مرنے نہ پائے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "جج صاحب میں خدا نہیں ہوں لیکن بخدا ہم اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔"

جج نے کہا۔ "تمہیں ناممکن کو بھی ممکن بنانا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تب تو ایک ہی صورت ہے اسے بچانے کی۔ لیکن آپ جانتے ہیں وہ آپریشن کتنا خطرناک ہے۔"

"میں جانتا ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ قانون کی خاطر، انصاف کی خاطر تم وہ خطرناک آپریشن کر ڈالو۔"

"اگر ہم کامیاب ہو گئے تو ۔۔۔" ڈاکٹر نے کہا "یہ سائنس کی بہت شاندار فتح ہوگی۔"

پانی آگیا۔

بھجیا! چٹ پٹی مسالے دار بھجیا!

اور اگر وہ مر گئے ہوتے تو بھجیا کیسے کھاتے؟"

ٹھنڈا میٹھا فالودہ کیسے پیتے؟

چاندنی رات میں جُوہو کے کنارے نرم نرم ریت کا لمس اپنے گالوں پر کیسے محسوس کرتے؟

مالا بار ہل پر جاکر ہینگنگ گارڈن میں کھلے ہوتے پھولوں کا نظارہ کیسے کرتے؟

وہ بھجیا نہیں تھی، وہ زندگی تھی جو اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ چٹ پٹے مسالے کی خوشبو کے ساتھ اُن کو واپس بُلا رہی تھی۔

اُترنے والے مُسافر چڑھنے والے مسافروں سے دست و گریباں تھے ——— کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی تھی۔

موہن نے للی کے کان میں چلا کر کہا۔ "چلو، رسول میرج کر لیں؟ کیوں منظور ہے؟"

تو للی نے موہن کے کان میں چلا کر کہا "ہاں ہاں منظور ہے"

"تو چلو، چرچ گیٹ چلیں"

اور یہ کہہ کر موہن نے للی کا ہاتھ پکڑا اور ڈبے میں گھسنے والی بھیڑ پر پل پڑا۔ کسی نہ کسی طرح وہ بھیڑ کے ریلے کے ساتھ اندر گھس ہی گئے۔

ٹرین چلی گئی۔

مگر وہ آدمی بنچ پر اُسی جگہ بیٹھا رہا۔

وہ بھجیا اُسی طرح پڑی رہی۔

پھر وہ آدمی آہستہ سے اپنی جگہ سے اُٹھا اور بھجیا کی پڑیا اُٹھا کر کھانے لگا۔

تب چائے والے نے اپنی دُکان سے آواز دی "کیوں چلے گئے وہ دونوں؟"

"ہاں چلے گئے"

"روز مجھ سے بھجیا لے کر کھاتے ہیں" چائے والے نے کہا۔

"مگر اب وہ تمہاری بھجیا کھانے نہیں آئیں گے۔ اب وہ اپنے لئے خود چٹ پٹی مسالے دار بھجیا بنایا کریں گے۔"

"کیا تم ان کو جانتے ہو؟ کون ہیں یہ دونوں؟"

اور وہ جو کھٹائی کی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر اور مزا لے کر بھجیا کھا رہا تھا۔ بولا "لیلیٰ مجنوں"

پہیتوں کی رگڑ سے چمک رہی تھی ۔ شاید دُور سے ریل چلی آ رہی تھی۔ پٹری میں سے ایک عجیب زوں زوں کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی ـــ جیسے سِتار کے تار کو کسی نے چھیڑ دیا ہو اور اب اُس کی جھنکار کی گونج رہ گئی ہو۔ جیسے کتنی ہی شہد کی مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں۔ جیسے وہ پٹریاں کتنی عجیب انجانی زبان میں اُن سے کچھ کہہ رہی ہوں۔

اُن کی نگاہیں ریل کی پٹری پر جمی ہوئی تھیں کہ ایک دم دھڑدھڑ کرتی ہوئی ایک ٹرین آ گئی۔ اُن کے سامنے کی پٹڑی پر سے ٹرین کے کتنے ہی بھاری ہیبت ناک پہیے دھڑدھڑاتے ہوتے گُزر گئے۔ پھر وہ ٹرین بھی چلی گئی، مگر وہ پٹڑی پہلے کی طرح چمکتی رہی، گنگناتی رہی، اُن سے کچھ کہتی رہی۔

اور پھر ایک ساتھ ان دونوں کی سمجھ میں آ گیا کہ ریل کی پٹڑی اُن سے کیا کہہ رہی ہے۔

للی نے موہن کی طرف دیکھا۔

موہن نے للی کی طرف۔

اور دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا اور ایک ہی جواب۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے اور موت وہاں اُن کے سامنے وہاں اُس ریل پٹڑی کی تلوار جیسی دھار پر اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

اب قریب آنے والی ریل کی آواز سے ریل کی پٹڑیاں جھنجھنا اُٹھیں۔

وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

ایک لمحے کے لئے انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خاموشی سے اقرارِ محبت کیا۔ پھر للی کا نرم ہاتھ موہن کے سخت کھُردرے اور مردانہ ہاتھ میں آ گیا۔

اب ٹرین اُن کی طرف دھڑدھڑاتی ہوئی آ رہی تھی۔

ایک لمحہ، اور پھر وہ دونوں ریل کی پٹڑی پر کود جائیں گے۔ اُس ٹرین کے بھاری پہیے اُن کی مشکل آسان کر دیں گے۔ موت کی گود میں ان کو ہمیشہ کے لئے ایک دُوسرے کے ساتھ سُلا دیں گے۔ اُن کی محبت کو امر کر دیں گے۔

”اے۔“

ایک آواز نے اُن کو چونکا دیا اور اسی لمحے میں ٹرین آ گئی اور ڈبے اُن کے پاس سے گُزرنے لگے۔ للی اور موہن نے مُڑ کر دیکھا تو یہ وہی ادھیڑ عمر کا. میلا پاجامہ، پھٹی قمیص والا آدمی تھا ـــ جو مسکرا کر بھجیا کی پُڑیا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

” اپنی بھجیا تو ساتھ لیتے جاؤ۔“ اُس نے چلّا کر کہا۔

”بھجیا! چٹ پٹی مسالے دار بھجیا! نہ جانے کیوں بھجیا کا نام سُن کر اُن دونوں کے مُنہ میں

سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔

موہن نے اس آدمی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا "یہ نہ جانے کون ہے جو ہمیں یوں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ بابا کا جاننے والا نہ ہو؟"

"تو پھر کیا کہا تمہارے بابا نے؟" للی نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

موہن کو، جواب اب تک اس سوال سے کترا رہا تھا، جواب دینا ہی پڑا۔ "وہ ـــــ وہ ـــــ بھی اس شادی کے خلاف ہیں، للی۔"

"وہ کیا وجہ بتاتے ہیں؟"

"کہتے ہیں، ہندو ہو کر میں کرسچین لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا ہوں؟"

"کیوں، کرسچین لڑکیوں میں انھیں کیا برائی دکھائی دیتی ہے؟"

"وہ کہتے ہیں ـــــ کہ کرسچین چھوکریاں بڑی خراب ہوتی ہیں۔ ہر مرد سے آنکھیں لڑاتی ہیں۔" للی کے سانولے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ "کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو؟"

"نہیں نہیں، للی یہ بات نہیں ہے۔ بھلا میں ایسا کیسا سوچ سکتا ہوں۔ مگر بابا کو کون سمجھاتے۔ تمہارے ڈیڈی کو بھی برا بھلا کہتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ دارو کا دھندہ کرتا ہے۔"

"اور تمہارے بابا کیا دھندہ کرتے ہیں؟"

موہن نے ہچکچا کر جواب دیا۔ "سٹے کا۔"

للی کچھ کہنے والی تھی مگر اتنی دیر میں دوسری ٹرین آ گئی اور پلیٹ فارم پر پھر گہما گہمی شروع ہو گئی مگر وہ آدمی جو ان کی بینچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا تھا، وہیں بیٹھا رہا اور اسی طرح ان کو گھورتا رہا بلکہ ان کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔

گاڑی گئی تو للی نے کہا "اب کیا ہوگا موہن؟"

موہن نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں تو آج اسی فکر میں مل میں کام کرنے بھی نہیں گیا۔ اگر تمہارے ڈیڈی نے تمہاری شادی کسی اور سے کر دی تو میں جان دے دوں گا۔"

للی بولی "تم کیا سمجھتے ہو، میں زندہ رہوں گی؟ ڈیڈی نے زبردستی کی تو میں زہر کھا لوں گی ـــــ موہن! تم مجھے تھوڑا سا زہر لا دو۔"

"زہر میں کہاں سے لاؤں گا۔ زہر پر تو کنٹرول ہے۔ ڈاکٹر کے چٹھی دیئے بنا زہر مل ہی نہیں سکتا۔"

تھوڑی دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے اور ان کے بیچ میں بجیا اسی طرح پڑی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے پہلے للی کی اور پھر موہن کی نگاہ ریل کی پٹری پر جم گئی۔ فولاد کی کالی پٹری جو ریل کے

"پہلے کبھی کبھار سنڈے کو چلے جاتے تھے۔ اب تو انھیں شراب پینے سے فرصت ہی کب ملتی ہے جو وہ چرچ جانے کا سوچیں۔"

"اور جب فرصت ملتی ہے تب کیا کرتے ہیں؟"

"تم تو جانتے ہی ہو موہن۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔" رلی نے آواز کو دھیمی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر جواب دیا۔ "ڈیڈی دارو کا دھندا کرتے ہیں۔"

اتنے میں دوسری طرف کی ٹرین آ گئی۔ یہ اتنی بھری ہوئی نہیں تھی۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں سے پندرہ بیس مسافر اُترے۔ فرسٹ کلاس سے ایک بھی نہیں اُترا۔ ٹرین چل دی۔ پلیٹ فارم پھر سنسان ہو گیا۔

"اور کیا کہتے ہیں تمہارے ڈیڈی؟" موہن نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔

"کیا کرو گے سن کر موہن؟ تمہارے بارے میں بڑی بڑی باتیں جو وہ کہتے ہیں، اُن کو دہرانا مجھے اچھا تھوڑا ہی لگتا ہے۔"

"پھر بھی میں جاننا چاہتا ہوں، وہ کیا کہتے ہیں، کیا سوچتے ہیں میرے بارے میں؟ —— میرے ہندو ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی اعتراض ہے اُن کو؟"

"ہے۔" رلی نے جواب دیا۔

"کیا ہے؟"

"وہ کہتے ہیں تم ایک لیبر ہو، مل میں مزدور ہو، تمہارے کپڑوں سے پسینے اور تیل کے دھبوں کی بو آتی ہے انھیں۔"

"تو وہ دن بھول گئے ہیں جب ہم اور وہ دونوں گھرانے ماہم والی بستی کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے؟"

"اب وہ اُس بستی کی بات سننا نہیں چاہتے، موہن، وہ اُن جھونپڑیوں کو بھول جانا چاہتے ہیں۔ وہ میرے باپ ہیں، میں اُن سے بحث نہیں کر سکتی۔ تم بتاؤ تمہارے بابا نے کیا کہا؟ وہ تو ہمیں آشیرواد دیں گے نا؟"

موہن جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک تیسری ٹرین آ گئی۔ یہ پہلی ٹرین سے بھی زیادہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جو اندر تھے وہ باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے اور جو باہر تھے وہ اندر گھسنے کے لئے زور لگا رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی منٹ ٹرین کو ٹھہرنا پڑا۔ پھر بھی جب ٹرین چلی تو کئی مسافر جو اُترنا چاہتے تھے، وہ اندر ہی رہ گئے اور کئی جو اس میں چڑھنا چاہتے تھے وہ پلیٹ فارم پر کھڑے رہ گئے۔ اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو میلا پاجامہ اور دُھلی ہوئی قمیص پہنے ہوئے تھا، اس بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ جہاں موہن اور رلی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بنچ کے دُوسرے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا مگر منہ پھاڑے ہوئے ان دونوں کو اتنے تعجب اور غور سے دیکھ رہا تھا جیسے عجیب جانوروں کا جوڑا اُس نے اِس

للی "لیج کی" سے دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی، تو سب سے پہلے سڑک والی کھڑکی کھولی۔ کتنا اچھا ہے میرا موہن! اُس نے سوچا "میری فکر میں اب تک سڑک پر کھڑا ہے۔" پھر اُس نے ہاتھ کے خاموش اشارے سے موہن کو "بائی بائی" کہا اور جب مطمئن ہو کر موہن بھی ہاتھ ہلا کر چل پڑا۔ تب ہی وہ کھڑکی سے ہٹی۔

وہ مڑی ہی تھی کہ للی کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کا باپ دروازے میں کھڑا تھا۔

●

پیریل سٹیشن پر لوکل ٹرینیں آ رہی تھیں۔ ٹرینیں جا رہی تھیں۔ "فاسٹ" ٹرینیں دھڑ دھڑ کرتی ہوئی، پلیٹ فارم کو ہلاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ایک بنچ پر للی اور موہن بیٹھے تھے اور اُن کے درمیان میں کاغذ میں بھجیا رکھی تھی، مگر آج دونوں میں سے ایک کا ہاتھ بھی اُس چٹ پٹی مسالے دار بھجیا کی طرف نہ اُٹھ رہا تھا۔

"سو تمہارے ڈیڈی نے انکار کر دیا؟" موہن نے خاموشی کو توڑتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"انکار ہی نہیں کیا، موہن" للی بولی "بہت کچھ کہا۔ شراب پیتے ہوئے تھے۔ سو گالیاں بھی دیں مجھے۔ تمہیں بھی بہت بُرا بھلا کہا۔"

"کیا کہا؟ معلوم تو ہو ان کو مجھ میں کیا بُرائی نظر آتی ہے؟"

للی نے ایک دم جواب نہ دیا۔ جیسے بولتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔ اتنے میں ایک ٹرین آ کر ٹھہر گئی۔ سارے ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ مسافر اُترے، مسافر چڑھے۔ سب ڈبے جوں کے توں بھرے رہے۔ گاڑی پھر چل دی۔ اُترنے والے مسافر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پُل پر ہو لئے — پلیٹ فارم پھر سنسان ہو گیا۔

اب للی نے دھیرے سے کہا "ڈیڈی کہتے ہیں تم — تم — ہندو ہو، اور بولتے ہیں میں مر جاؤں گا پر اپنی بیٹی کی شادی ایک ہندو کے ساتھ نہ ہونے دوں گا۔"

"تمہارے ڈیڈی کرسچن ہیں؟"

"ہاں!"

"چرچ جاتے ہیں؟"

میں سوار ہو گئے۔

●

باندرہ کی سڑکیں رات کے سناٹے میں سوئی ہوئی ـــ صرف رلّی اور موہن کے قدموں کی آواز تھی اور فٹ پاتھ پر سونے والوں کے خراٹے۔

دُور کہیں کسی گھڑیال نے دو بجائے۔

موہن نے چلتے چلتے کہا "رلّی یاد ہے ماہم والی بستی میں جب ہم پہلی بار ملے تھے اُس وقت بھی رات کے دو ہی بجے تھے۔"

"بالکل یاد ہے۔ تم چوری سے اپنی گاگر لائن میں آگے رکھ رہے تھے۔"

"اور تم ڈنڈا ہاتھ میں لئے پہرا دے رہی تھیں اور تُتلا تُتلا کر کہہ رہی تھیں ـــ مال مال کے بھُل کچھ بنا دوں گی۔"

"مجھے ماہم والی بستی بہت یاد آتی ہے۔ وہاں ہم کتنے خوش تھے۔"

"مگر اب تو تم بہت اچھی فلیٹ میں رہتی ہو۔"

"ہاں، یہ گھر تو اچھا ہے مگر تم جو نہیں ہو وہاں ماہم کی بستی میں تو ہم دن بھر ساتھ کھیلتے تھے۔"

"یاد ہے جب میں نے بلیک بورڈ پر فادر ولیم کی تصویر بنائی تھی؟"

راستے کی روشنی میں رلّی نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا جہاں ہلکی نیلی نیلی دو لکیریں پڑی ہوئی تھیں اور اس نے کہا "یاد ہے۔"

اور پھر رلّی کا گھر آ گیا۔

دوسری منزل پر جس فلیٹ میں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی، وہاں ایک کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی۔

موہن نے کہا "لگتا ہے تمہارے ڈیڈی ممی جاگ رہے ہیں۔ تمہیں کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

رلّی نے جواب دیا "فکر نہ کرو۔ وہ میرا کمرہ ہے اور اُس کی دریچی میرے پاس رہتی ہے۔ اچھا گُڈ نائیٹ، میں کل ہی ڈیڈی سے بات کر کے شام کو تمہیں ملوں گی۔"

"تو پھر چار بجے ریل سٹیشن پر۔"

رلّی اندھیرے زینے پر راستہ ٹٹولتی ہوئی اُوپر چڑھ گئی اور جب تک اُس کے قدموں کی آواز آتی رہی۔ موہن وہیں سڑک پر کھڑا رہا۔

مگر آج سے تمہیں کبھی انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نوکری چھوڑ آئی ہوں۔"

اتنے میں ٹرین چلی گئی تھی اور اگلی ٹرین آنے تک پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔

ٹی اسٹال کے پاس اپنی مقررہ بنچ پر بیٹھے ہوئے لِلی اور موہن بھجیا کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بھجیا ختم ہوگئی، مگر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ دوسری ٹرین آئی۔ مسافر ڈبوں میں سے اُترے، مسافر ڈبوں میں چڑھے۔ ٹرین چلی گئی۔ ایک بار پھر اسٹیشن پر سناٹا چھا گیا۔

رات ہوگئی۔ سٹیشن کی روشنیاں جل اٹھیں۔ ٹرینیں آتی رہیں۔ ٹرینیں جاتی رہیں۔ مسافر اُترتے رہے، مسافر چڑھتے رہے۔ للی اور موہن اسی جگہ بیٹھے رہے، باتیں کرتے رہے اور بھجیا خرید کر کھاتے رہے اور پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر کار للی نے کہا "اچھا تو اب دیر ہوگئی ہے۔ مجھے جانا ہی چاہیئے۔"

موہن نے جیسے خواب میں کوئی بات سنی ہو۔ "لِلی کچھ کہا تم نے؟"

"نہیں کچھ نہیں کہا۔" لِلی نے اُسے یقین دلایا۔

اور وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں کھو گئے۔

ایک کے بعد ایک، دو ٹرینیں جنوب کو گئیں۔ تین ٹرینیں شمال کو گئیں، مگر وہ دونوں اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ یہاں تک کہ چائے اور بھجیا کی دکان بھی بند ہوگئی اور چائے والا جاتے جاتے اُن سے کہہ گیا۔

"ابھی آخری ٹرین آنے والی ہے۔ اس کے بعد صبح تک کوئی ٹرین نہیں ملے گی۔"

تب وہ دونوں چونکے۔ دُور سے ٹرین قریب آنے کی آواز دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی تھی۔

"تو کل تم دفتر نہیں جاؤ گی؟" موہن نے پوچھا۔

"نہیں، اب میں کبھی دفتر نہیں جاؤں گی۔"

"پھر میں تم سے کیسے ملا کروں گا؟"

"تمہارے رِل کی شِفٹ ختم ہونے سے پہلے میں یہاں آجایا کروں گی۔"

"اور اگر تمہارے ڈیڈی نے تمہیں اُس وقت گھر سے نہ نکلنے دیا؟"

"پھر میں کیسے آسکتی ہوں؟ تم ہی بتاؤ۔ پھر کریں تو کیا کریں؟"

"تو پھر ایک ہی راستہ ہے۔ کل ہی ہم شادی کرلیں گے۔"

لِلی کے کانوں میں ننھی ننھی گھنٹیاں بجنے لگیں اور اتنے میں ٹرین آگئی اور جو لِلی نے دھیرے سے کہا وہ ریل کی دھڑ دھڑاہٹ میں کھو گیا۔

موہن نے لِلی کا بازو پکڑا۔ "آؤ تمہیں گھر پہنچا آؤں۔" اور وہ دونوں سامنے والے ڈبیتے

"موہن!" پتلی مونچھوں والے ٹامس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ "یہ موہن کون ہے؟"

اور للی نے جواب دیا تھا "وہ میرا موہن ہے!"

"کیا تمہاری اس سے منگنی ہوئی ہے؟"

"ہاں، یہی سمجھو۔" للی نے جواب دیا تھا۔

"کب سے؟"

"بارہ برس سے۔"

"تو کیا تمہاری منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی؟"

"ہاں، یہی سمجھو۔"

"مگر موہن! وہ تو ہندو ہو گا، اس سے تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

للی نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا محبت کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ بیگ ہلاتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد "چگی" داڑھی والے اکبر علی ہیڈ کلرک نے اپنا رجسٹر بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے واہ۔ اپنی للی تو لیلیٰ نکلی۔"

اور جب ٹامس نے پوچھا۔ لیلیٰ "ھوازشی؟" (——— WHO IS SHE ——) تو اکبر علی نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ بھی ایک محبت کی دیوانی تھی، للی کی طرح۔"

◆

لوکل ٹرین پریل کے اسٹیشن پر پہنچی اور للی دھکم پیل کر کے تھرڈ کلاس کے ڈبے کی بھیڑ میں سے باہر نکلی تو اس نے موہن کو حسبِ معمول کلاک کے نیچے کھڑا پایا۔

موہن اب اکیس برس کا جوان تھا۔ وہ ایک مل میں میکانک تھا اور اس کی نیلی شرٹ اور پتلون پر پڑے تیل کے دھبے اعلان کر رہے تھے کہ وہ سیدھا کام سے آ رہا ہے۔

"ڈارلنگ!" للی نے موہن کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت انتظار کرنا پڑا کیا؟"

"موہن نے مسکرا کر جواب دیا "صرف آدھ گھنٹہ۔ اتنی دیر میں صرف چار ٹرینیں گئی ہیں۔ کیوں آج دفتر میں کام زیادہ تھا یا اپنے منیجر سے ذکر چھیڑ رہی تھیں؟"

للی نے جلدی سے کہا۔ "اس شیطان کا تو نام مت لو۔ جی چاہتا ہے اس کا منہ نوچ لوں۔

ایک ادھیڑ عمر کے شریف آدمی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ مگر یہ گالی اس نے اس بے چارے کو نہیں دی تھی۔ نہ ہی یہ گالی اس نے ان بیلڈی ٹوائز کو دی تھی، جن کی لوفرانہ حرکت کو وہ اب تک بھلا بھی چکی تھی۔ اس وقت اس کو غصہ آ رہا تھا اپنے دفتر کے مینجر پر، جو موٹا تھا اور گنجا تھا۔ مگر اپنے گنج کو چھپانے کے لئے کنپٹی کے لمبے بالوں کو گنجی کھوپڑی کے اوپر چپکائے رکھتا تھا اور جس کی رنگت مینڈک کے پیٹ کی طرح پیلی تھی اور جس کے موٹے موٹے گدے دار ہاتھ ہمیشہ ہوس کے پسینے سے بھیگے رہتے تھے اور جو دفتر میں کام کرنے والی ہر لڑکی سے فلرٹ کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔

للی کو اس دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف دو مہینے ہوتے تھے مگر اتنے عرصے ہی میں اس نے مینجر کی بدنیت کو بھانپ لیا تھا اور اس لئے وہ جہاں تک ممکن ہوتا۔ اس کے قریب جانے سے کتراتی رہتی تھی مگر اس دن مینجر نے اپنی سپیشل سٹینوگرافر کو چھٹی دے دی تھی اور للی کو اس کی جگہ کام کرنا پڑا تھا۔

تین گھنٹے تک للی نے شارٹ ہینڈ کی کتاب پر مینجر کے ڈکٹیٹ کراتے ہوئے خطوں کے ڈرافٹ لکھے تھے۔ ہر خط شروع ہوتا تھا۔ "ڈیر سر" یا "مائی ڈیر ....." سے اور ہر بار جب اس کے منہ سے "ڈیر" کا لفظ نکلتا تھا، وہ ایک خاص انداز سے للی کی طرف دیکھتا تھا، جس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا مگر جس کو سمجھنے کے لئے للی تیار نہ تھی اور پھر شام ہوتے جب وہ ان سب خطوں کو ٹائپ کر کے دستخط کرانے لے گئی تھی، اس بدمعاش نے للی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا "آج رات کے شو میں سینما دیکھنے کے لئے چلتی ہو؟" اور پھر اس نے للی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا، تاکہ اسے اپنی گود میں بٹھالے اور تب للی کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ مینجر کے ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرے اور ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگ آتے۔

مینجر کا دفتر ایر کنڈیشنڈ تھا اور اس لئے اس تھپڑ کی آواز کسی نے نہ سنی تھی۔ مگر سب نے یہ ضرور دیکھا کہ للی جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ سرخ تھا اور اس کے ہونٹ بھینچے ہوتے تھے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ للی تیز تیز چلتی ہوئی اپنی میز تک گئی، دراز کھول کر اپنی سب چیزیں نکال کر اپنے بیگ میں ڈالیں اور پھر بغیر کسی سے کچھ کہے وہ دفتر سے باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی، کہ اب وہ اس دفتر میں پھر کبھی قدم نہیں رکھے گی۔

دفتر میں جتنے دوسرے نوجوان کلرک تھے سب ہی نے تو باری باری للی سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ان میں سے کسی کو منہ نہ لگایا تھا، نہ کسی کے ساتھ سینما گئی تھی۔ نہ کسی ریستوران میں چائے پینے کی دعوت قبول کی تھی اور ایک دن جب کسی نے زیادہ اصرار کیا تھا تو اس نے کہہ دیا تھا "آئی ایم سوری، مگر شام کو مجھے موہن سے ملنا ہوتا ہے۔"

نوجوان اتنا بڑھا تو نہیں ہو سکتا۔ وجے سنگھ کیوں اپنی جوانی، اپنا حسن، اپنی تندرستی کھو بیٹھا؟ انقلاب کے لئے۔ بینا۔ انقلاب کے لئے۔ اسی انقلاب کے لئے جس کی خاطر تو جان دینے کو تیار ہے مگر تو تو باتیں ہی بناتی ہے۔ اس نے تو کر دکھایا۔ اپنی جوانی، اپنی تندرستی، اپنے دوست اور عزیز۔ اپنے رومان بھرے خواب۔ سب کچھ انقلاب کے لئے قربان کر دیے۔ سولہ برس جیل میں کاٹے کال کوٹھری میں رہا۔ کوڑوں کی مار کھائی وارڈروں کی ٹھوکریں کھائیں۔ گالیاں سنیں۔ کس لئے ــــ؟ انقلاب کے لئے اور تو۔ تیرا دل اتنا چھوٹا ہے کہ آج تو اس وجے سنگھ کی داڑھی، اس کی جھریوں اور اس کی پھنسیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لعنت ہے۔ لعنت ہے تجھ پر۔“

دوسرے کمرے میں وجے سنگھ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ قدم چلتے چلتے دروازے کے قریب آتے اور رک گئے۔ بینا کا دل بھی حرکت کرتے کرتے رک گیا ــــ نہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئی، نہ دروازہ کھلا۔ چند سیکنڈ کے بعد قدم واپس چلے گئے۔ بینا کا دل پھر حرکت کرنے لگا۔

”نہیں وہ اپنی طرف سے پہل نہیں کرے گا۔ وہ حساس ہے۔ اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ تجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرے گا، اگر تو اس کمرے میں نہیں جائے گی تو وہ رات بھر ٹہل کر گزار دے گا اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر پھر جیل چلا جائے گا۔ جس نے سولہ برس یوں گزار دیئے وہ تو باقی زندگی بھی گزار سکتا ہے۔ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہ کر سکے گی۔ اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی۔“

وجے سنگھ کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ پلنگ پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر لیٹنے کی۔

”شاید سو جائے۔“ بینا نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر فوراً ہی کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ اور یہ کیا؟ کیا بینا کے کان دھوکا دے رہے تھے یا واقعی وجے سنگھ رو رہا تھا؟ بینا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ وجے سنگھ رو رہا تھا۔ وجے سنگھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے کوڑے مارے گئے تو وہ ہنستا رہا تھا۔ وجے سنگھ جو پھانسی کا حکم پا کر بھی مسکرایا تھا۔ وہی وجے سنگھ جس نے پچاس دن بھوک ہڑتال کی تھی۔ جو نہ قید سے ڈرتا تھا نہ مار سے۔ جو موت سے گھبراتا تھا نہ کالے پانی کی سزا سے۔ وہی وجے سنگھ آج رو رہا ہے۔ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر۔

وجے سنگھ کی آنکھیں بینا کے شہوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی تھیں۔ اس نے بینا کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ مگر یہ پیغام بیکار ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس کو روتا دیکھ کر بینا کی ممتا جاگ اٹھی۔ بچوں کی ہر ضد پوری کرنی چاہیئے اور ہندوستان کا سب سے بڑا انقلابی، نڈر وجے سنگھ بھی اس معاملے میں بچہ ہی تو تھا۔ باوجود اپنی داڑھی، اپنی پھنسیوں اور میلے میلے زرد دانتوں کے۔

بینا کے دل کی تہ میں سے رواجی اخلاقیات نے سر اٹھایا اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"سائنس یہ کلاس کو اچھی طرح سے گھور کر فادر نے للی سے کہا۔ "تم نے بھی یہی حرکت کی ہے؟ پھر تمہیں بھی وہی سزا ملے گی۔ نکالو، اپنا ہاتھ باہر۔"

لِلی نے اپنا ہاتھ کھول کر بڑھا دیا۔

اور فادر ولیم جو اس دُنیا اور اُس دُنیا دونوں کے سب جسمانی اور روحانی بھیدوں سے واقف تھے، یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گئے کہ للی کے ہاتھ پر چار گہری نیلی لکیریں پڑی ہوئی تھیں جیسے اس کی ہتھیلی پر پہلے ہی سے چار بار بید کی مار پڑ چکی ہو۔

●

لِلی شام کو دفتر سے باہر نکلی تو فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تین ٹیڈی بائیز TEDDY BOYS نے بہ یک وقت سیٹی بجائی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں لِلی تھی بھی سیٹی بجانے کے قابل۔ رنگت سانولی مگر خوبصورت آنکھیں۔ قدرتی گھونگریالے چمکیلے سیاہ بال، چھریرا مگر بھرا ہوا جسم جو اس کے چُست فراک میں اور بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ اونچے فراک میں سے نکلی ہوئی سڈول ٹانگیں۔ ایسی لڑکی کو دیکھ کر بھلا کون سیٹی نہیں بجائے گا؟

لِلی کو ٹیڈی بائیز کی سیٹی سننے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دن میں کئی بار اس کو اس قسم کی سیٹیاں سنائی دیتی تھیں۔ لِلی کو ان لفنگے چھوکروں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اگر اُسے دیکھ کر اُن کا جی سیٹی بجانے کو چاہتا ہے تو شوق سے سیٹی بجائیں۔ بڑی لاپرواہی سے وہ اپنا بیگ ہلاتی ہوئی اُن کے پاس سے گزر جاتی اور اُس کا یہ انداز دیکھ کر وہ بھی سیٹی بجانا بھول جاتے۔

لیکن آج اس کا موڈ خراب تھا۔ جیسے ہی ٹیڈی بائیز نے سیٹی بجائی، لِلی نے پلٹ کر دیکھا، پھر وہ اُن کی طرف بڑھی۔ اُس کی آنکھوں میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی سیٹی کی آواز تینوں چھوکروں کے ہونٹوں پر سے غائب ہو گئی۔

"کیا ہے؟" اُس نے ڈانٹ کر کہا "شرم نہیں آتی، لوفر کہیں کے! کیوں، بلاؤں پولیس کو؟" اور پولیس کا نام سنتے ہی تینوں تنگ مہری کی پتلونیں اور نکیلے جوتوں کے تینوں جوڑے وہاں سے بھاگتے ہوئے نظر آئے۔

"سواتن!" انھیں بھاگتے دیکھ کر لِلی چلائی ـــــ سور کہیں کے!"

پھر وہ بس سٹینڈ کی طرف چل پڑی۔ آج اس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی اُونچی ایڑی کے سینڈل کی آواز میں بھی غصہ بھرا ہوا لگتا تھا۔

"سواتن! سور کہیں کا" چلتے چلتے دانت بھینچ کر اُس نے اتنے زور سے کہا کہ آگے چلنے والے

نوجوان اتنا بڑھا تو نہیں ہو سکتا۔ ویجے سنگھ کیوں اپنی جوانی، اپنا حسن، اپنی تندرستی کھو بیٹھا؟ انقلاب کے لئے۔ بینا۔ انقلاب کے لئے۔ اسی انقلاب کے لئے جس کی خاطر تو جان دینے کو تیار ہے مگر تو تو باتیں ہی بناتی ہے۔ اس نے تو کر دکھایا۔ اپنی جوانی، اپنی تندرستی، اپنے دوست اور عزیز۔ اپنے رومان بھرے خواب۔ سب کچھ انقلاب کے لئے قربان کر دیئے۔ سولہ برس جیل میں کاٹے کال کوٹھری میں رہا۔ کوڑوں کی مار کھائی وارڈروں کی ٹھوکریں کھائیں۔ گالیاں سنیں۔ کس لئے؟ انقلاب کے لئے اور تو۔ تیرا دل اتنا چھوٹا ہے کہ آج تو اس ویجے سنگھ کی داڑھی، اس کی جھریوں اور اس کی پھنسیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لعنت ہے۔ لعنت ہے تجھ پر۔"

دوسرے کمرے میں ویجے سنگھ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ قدم چلتے چلتے دروازے کے قریب آتے اور رک گئے۔ بینا کا دل بھی حرکت کرتے کرتے رک گیا۔۔۔ نہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئی، نہ دروازہ کھلا۔ چند سیکنڈ کے بعد قدم واپس چلے گئے۔ بینا کا دل پھر حرکت کرنے لگا۔

"نہیں وہ اپنی طرف سے پہل نہیں کرے گا۔ وہ حساس ہے۔ اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ تجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرے گا، اگر تو اس کمرے میں نہیں جائے گی تو وہ رات بھر ٹہل کر گزار دے گا اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر پھر جیل چلا جائے گا۔ جس نے سولہ برس یوں گزار دیئے وہ تو باقی زندگی بھی گزار سکتا ہے۔ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہ کر سکے گی۔ اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی۔"

ویجے سنگھ کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ پلنگ پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر لیٹنے کی۔

"شاید سو جائے" بینا نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر فوراً ہی کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ اور یہ کیا؟ کیا بینا کے کان دھوکا دے رہے تھے یا واقعی ویجے سنگھ رو رہا تھا؟ بینا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ویجے سنگھ رو رہا تھا۔ ویجے سنگھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اسے کوڑے مارے گئے تو وہ ہنستا رہا تھا۔ ویجے سنگھ جو پھانسی کا حکم پا کر بھی مسکرایا تھا۔ وہی ویجے سنگھ جس نے پچاس دن بھوک ہڑتال کی تھی۔ جو نہ قید سے ڈرتا تھا نہ مار سے۔ جو موت سے گھبراتا تھا نہ کالے پانی کی سزا سے۔ وہی ویجے سنگھ آج رو رہا ہے۔ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر۔

ویجے سنگھ کی آنکھیں بینا کے شہوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی تھیں۔ اس نے بینا کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ مگر یہ پیغام بیکار ثابت ہوا تھا۔ لیکن اس کو روتا دیکھ کر بینا کی ماتا جاگ اٹھی۔ بچوں کی ہر ضد پوری کرنی چاہیئے اور ہندوستان کا سب سے بڑا انقلابی، نڈر ویجے سنگھ بھی اس معاملے میں بچہ ہی تو تھا۔ باوجود اپنی داڑھی، اپنی پھنسیوں اور میلے میلے زرد دانتوں کے۔

بینا کے دل کی تہ میں سے رواجی اخلاقیات نے سر اٹھایا اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

چہرے پر گڑی ہوئی ہیں اور ان آنکھوں کی گہرائی میں وہی جنون، اُن کی سطح پر وہی بچوں کی سی سادگی اور ساتھ ہی وہ حیوانی کشش بھی ہے جو پارٹی کے دفتر والی تصویر میں تھی۔ بینا کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ آنکھیں دُھندلا گئیں اور ان میں آگ کے بجائے دُھواں سا، تحکم کی بجائے التجا سی جھلکنے لگی۔

بینا نے جلدی سے روشنی بند کی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

مگر دونوں کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا۔ اُس کی چٹخنی اس کی طرف لگی تھی۔ جدھر وجے سنگھ کا پلنگ تھا۔ بینا نے کواڑ بھیڑتے ہوئے آواز دی "مہربانی کر کے چٹخنی لگا لیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور انتظار کرتی رہی کہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئے۔ ایک منٹ گزرا۔ دو منٹ — پانچ منٹ۔ دس منٹ اور بینا کو ایسا محسوس ہوا کہ جب تک چٹخنی بند نہ ہوگی، اُسے نیند نہ آئے گی مگر چٹخنی بند نہ ہوئی۔

بینا نے سوچا "کیا وجے سنگھ سو گیا ہے؟" مگر دوسرے کمرے سے پلنگ پر کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اُٹھ بیٹھا ہو۔ پھر کمرے میں چلنے کی آواز — وہ سویا نہ تھا۔ ٹہل رہا تھا۔

بینا کو وجے سنگھ کی بے چینی کی وجہ معلوم تھی۔ اس لئے کہ وہ خود اس بے چینی کی وجہ تھی۔ سولہ ۱۶ برس کی تنہائی اور بے لُطف زندگی کے بعد "طوفان میل" کی بے باک محبت کے سبق دیکھ کر اُس کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اُٹھے تھے اور اپنی تسلی چاہتے تھے۔ کل صبح وہ پھر جیل چلا جائے گا۔ یہی چند گھنٹے باقی تھے۔

بینا نے اب تک اپنے آپ کو جنسی لذتوں سے محروم رکھا تھا۔ کیا اسی لئے کہ ایک کریہہ المنظر لمبی داڑھی والے، گندے اور بیمار بڈھے کی ہوس کی آگ بُجھائے؟ اُس نے ہمیشہ ایک خوبصورت تندرست نوجوان کے خواب دیکھے تھے۔ نوجوان جو اُس سے محبت کرتا ہو۔ اس کے ساتھ اپنا تمام جیون بتانے کو تیار ہو۔ کہاں اُس کے سپنوں کا وہ کڑیل جوان اور کہاں یہ مُرجھایا ہوا بُڈھا! نہیں ہرگز نہیں۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتی۔

مگر بینا کے حساس مگر ہمدرد دماغ نے اسی صورتِ حال کو دُوسری پوزیشن میں یوں پیش کیا۔ بیشک وجے سنگھ قبل از وقت بُڈھا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرے پر خوفناک داڑھی ہے۔ اس کی پیشانی پر جُھریاں پڑی ہیں۔ اس کے سَر پر پھنسیاں نکلی ہیں۔ اس کے منہ سے زرد اور گندے دانت جھانک رہے ہیں۔ مگر کیوں؟ بینا۔ سوچ۔ سولہ برس ہوئے۔ یہی وجے سنگھ ایک خوبصورت کڑیل جوان تھا۔ تو نے اُس کی تصویر دیکھی ہے۔ کیا تو نے اس تصویر کی طرف تمنا بھری نظروں سے نہیں دیکھا؟ آج اُسی وجے سنگھ کی یہ حالت کیوں ہے؟ کیوں؟ سولہ برس میں پچیس ۲۵ برس کا

تھے۔ بینا تو وہاں ایک دفعہ بھی نہ گئی تھی۔ مگر وجے سنگھ کو لے گئی۔ تماشہ شروع ہونے ہی والا تھا۔ جب وہ ٹکٹ لے کر داخل ہوئے۔ روشنیاں گل ہو گئیں اور روپہلی پردے پر تصویروں نے حرکت شروع کر دی۔ فلم تھا "طوفان میل" پرانا زٹیل فلم۔ مگر وجے سنگھ کے لئے تو معجزے سے کم نہ تھا۔ تصویروں کو چلتے پھرتے تو اُس نے ضرور قید ہونے سے پہلے دیکھا تھا۔ مگر گاتے بولتے دیکھ کر وہ بالکل دنگ رہ گیا۔ چارلی اور غوری کے بھونڈے مذاق پر وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔ کھلکھلا کر تالیاں بجا کر۔ دوسرے تماشائی مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگے۔ بینا کو پہلے تو ذرا کوفت ہوئی۔ مگر فوراً ہی اُس کو یہ خیال آیا کہ شاید سولہ برس میں پہلی بار وجے سنگھ ہنس رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی اُس کو "طوفان میل" فلم بھی اچھا لگنے لگا۔

مادھوری اور بلیموریا پردے پر محبت کا رنگین کھیل کھیل رہے تھے۔ بے باک، بے پروا۔ حیوانی محبت۔ وہ محبت نہیں جو شبِ فراق کے آنسوؤں میں ظاہر ہوتی ہے — بلکہ وہ محبت جو قہقہوں اور معنی خیز نگاہوں میں جھلکتی ہے۔ مادھوری ایک چُست بدن سے چپکے ہوئے لباس میں مجسم آرزو بنی ہوئی تھی۔ شہوانیت کا ایک شرارہ جس کی قربت ہر ایک کو جھلس دینے کو کافی تھی۔ اُف رے اُس کی شرارت آمیز، شہوت خیز باتیں، کٹیلی نظر۔ وہ اُس کا سینہ کے ابھار پر ہاتھ رکھ کر ایک عجیب انداز سے کہنا "ہائے۔ یہاں"

وجے سنگھ بڑے انہماک سے فلم دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ۔ کیا یہ بھول سے بینا کے ہاتھ پر رکھا گیا تھا۔ چکی پیستے پیستے ہاتھ سخت ہو گیا مگر پھر بھی اس میں ایک قسم کی نرمی تھی۔ کسی زمانے میں یہ ہاتھ نازک اور حساس رہا ہو گا۔ اُنگلیاں اب بھی لمبی اور نازک تھیں۔ وجے سنگھ تماشا دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ بینا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ وہ بینا کے ہاتھ کو دبانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا "شاید غلطی ہی سے یہ ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا گیا ہو" بینا نے سوچا اور نرمی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ہال میں اندھیرا تھا مگر پھر بھی بینا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وجے سنگھ کو اس کا ہاتھ ہٹا لینا بُرا معلوم ہوا ہے۔ اس کے بعد فلم میں اس کی دلچسپی اور انہماک بھی ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے کہا "چلو گھر چلیں۔ بس دیکھ لیا فلم" اور جب وہ باہر سڑک کی روشنی میں آئے تو وجے سنگھ ایک رُوٹھے ہوئے بچے کی طرح زمین پر نظریں جماتے چل رہا تھا۔

گھر پہنچ کر بینا نے اپنے پلنگ پر وجے سنگھ کے لئے بستر دُرست کر دیا اور اُس سے کہا کہ آرام سے سو جاتے کیونکہ صبح ہی اس کو شہر جانا تھا۔ اس کے بعد اُس نے دُوسرے کمرے میں فرش پر دری بچھا کر اپنے سونے کا انتظام کیا۔ ایک گلاس میں پانی بھر کر وجے سنگھ کے سرہانے رکھ دیا اور پوچھا۔ "اور کچھ چاہیئے" وجے سنگھ نے نفی میں سر ہلا دیا مگر بینا نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ اُس کی آنکھیں اُس کے

اس کو پڑھتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی پرانی انقلابی چمک واپس آتی جا رہی تھی۔ غصّہ۔ افسوس۔ خوشی۔ سب جذبات اس کی آنکھوں میں یکے بعد دیگرے نظر آ رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی وہ پھر انقلابی لیڈر تھا۔ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کو اپنی پارٹی کو ہدایات دینی تھیں۔ اُس نے بینا سے کاغذ اور قلم مانگا اور خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ چکی چلاتے چلاتے قلم پکڑنے کی عادت ہی نہ رہی تھی۔

خط ختم کر کے اس نے بینا کو دیا کہ اگلے دن حفاظت سے سکریٹری تک پہنچا دے۔

بینا نے گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ خاموشی توڑنے کے لئے اس نے کہا "ابھی آپ سونا چاہتے ہیں یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا کچھ دیر اور بیٹھنا ہے"

وجے سنگھ کا جواب سُن کر وہ دنگ رہ گئی۔ "میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سینما" ——

دفعتاً بینا کے دماغ میں سولہ برس قید کے ہولناک نتائج کی ایک جھلک بجلی کی طرح کوند گئی۔ سولہ برس سنہ ۲۸ء سے سنہ ۴۴ء تک یعنی وجے سنگھ نے کوئی ٹاکی ہی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس نے سہگل کی آواز سُنی تھی نہ رمولا کا حُسن دیکھا۔ نہ کانن بالا کے رسیلے گانے اور نہ چندر موہن کا کمالِ اداکاری۔ وہ تو بولتی ہوئی تصویروں کے جادو سے اتنا نا واقف تھا جیسے افریقہ کے تاریک ترین جنگلوں میں رہنے والا۔ سولہ برس وہ زندگی کے دلچسپ اور خوشگوار پہلوؤں سے محروم رہا تھا۔ سینما اور تھیٹر۔ گانا اور ناچ۔ بچوں کی آواز۔ غروبِ آفتاب کا رنگین منظر۔ چاند اور ستارے برسات کی رم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ درختوں کی چھاؤں۔ پھولوں کی بہار۔ ماں کی ممتا۔ اولاد کی اُمنگ۔ عورت کا پیار۔ کچھ بھی نہیں۔ بس ایک گندی اندھیری کوٹھڑی۔ جیل کے افسروں اور وارڈروں کی کرخت آوازیں، عادی مجرموں، ڈاکوؤں اور خونیوں کا ساتھ۔ زندگی کے سمندر میں موت کا یہ جزیرہ۔ انسانیت کی حدود سے باہر۔ دُنیا کے بیچ میں، مگر دنیا سے بہت دُور اور یہاں وجے سنگھ نے سولہ برس یعنی ایک سو بانوے مہینے تقریباً چھ ہزار مصیبت بھرے دن اور چھ ہزار کالی راتیں اور اس کے بعد صرف بارہ گھنٹے زندگی کے۔ بارہ گھنٹے روشنی، رنگ اور خوشبو کے۔ اس کے بعد پھر جیل خانے کے مہیب کالے دروازے بند ہو جائیں گے۔

میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سینما" بچپن کی سادگی کے ساتھ وجے سنگھ نے کہا تھا۔ ہر انسان کی فطرت میں بچپن ہوتا ہے۔ اور انقلابی بھی تو آخر انسان ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ آج کی رات اس کے دل میں سینما دیکھنے کی یہ شدید آرزو پیدا ہو گئی۔ کیا معلوم ہے اب جو وہ جیل جاتے تو پھر کبھی زندہ نہ نکلے۔ شاید سینما دیکھنے کی حسرت دل ہی دل میں رہ جاتے۔

رام نگر میں ایک ہی معمولی سینما تھا۔ جہاں

[illegible] پارٹی سیکریٹری کا خط پہلے سٹیشن ہی پر مِل گیا تھا کہ مجھے اس سٹیشن پر اُترنا ہے اور یہ کہ تم مجھے لینے آؤ گی۔
یا چلتے۔"

بینا وجے سنگھ کو اپنے گھر لے آئی۔ کھانا تیار کر کے گئی تھی۔ وہ ایک تھالی میں پروس کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ بغیر ایک لفظ کہے اُس نے کھانا شروع کر دیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا "تم نہیں کھاؤ گی؟" بینا پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وجے سنگھ انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کتنے ہی دن کے فاقے کے بعد کھانا ملا ہے۔ بینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ سوچ کر کہ سولہ برس تک دُھول ملی روٹی اور تیل میں پکی ہوئی دال کھانے کے بعد اس کو آج انسانوں کی خوراک نصیب ہوئی تھی۔ وہ وجے سنگھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہی چوڑے چکلے سینے اُونچی پیشانی چکنے بالوں والا وجے سنگھ ہے جس کی تصویر پارٹی کے دفتر کی دیوار پر ٹنگی تھی؟ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا سر گنجا ہے اور اس پر مدتوں تک نہ نہانے کی وجہ سے پھنسیوں اور میل کے کھرنڈ جمے ہوتے ہیں۔ اس کی داڑھی ـــ آدھی کالی آدھی سفید ـــ خوفناک طریقے سے اُگی ہے۔ ہونٹوں کے اُوپر اور نیچے کے بال شاید دال کے دھبے لگتے لگتے زرد ہو گئے ہیں۔ دانت کچھ غائب ہیں اور کچھ زردی مائل۔ ناخن بڑھے ہوتے اور میل سے بھرے ہوتے۔ باوجود شدید احساسِ ہمدردی کے بینا یہ سوچ کر کانپ اُٹھی کہ ٹرین آنے سے چند سیکنڈ پہلے ہی وہ اِسی شخص کے ساتھ جنسی زندگی کی پہلی منزل طے کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

وجے سنگھ نے کھانا ختم کر لیا تو بینا نے کہا "اب آپ نہا کر کپڑے بدل لیجئے۔ پارٹی والوں نے آپ کے لئے یہ کپڑے بھیجے ہیں۔ میں غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیتی ہوں۔" یہ سُن کر وجے سنگھ نے اپنے پھٹے پُرانے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ جیسے اُس کو دفعتاً اپنی غلاظت کا احساس ہوا ہو۔ بغیر ایک لفظ بولے وہ غسل خانہ میں چلا گیا۔ سولہ برس کا طویل عرصہ اُس نے اکیلے کال کوٹھڑی میں گزارا تھا۔ اسی لئے اس کو انسان سے بات چیت کرنے کی عادت ہی نہ رہی تھی اور بینا جیسی نوجوان لڑکی کی موجودگی میں تو ایسا چُپ ہو گیا تھا جیسے گونگا ہے۔

نہا کر وجے سنگھ نے صاف کپڑے پہنے اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپنے لگا جو بینا نے سردی کے خیال سے جلا کر رکھی تھی۔ لال لال کوئلوں کی روشنی میں اُس کی آنکھوں میں بینا کو ہلکی سی مسرت کی جھلک دکھائی دی۔ جیسے انگاروں پر سے راکھ جھٹک دی گئی ہے۔ اُس نے بینا سے قینچی مانگ کر اپنے ناخون کاٹے اور پارٹی سکریٹری کا خط پڑھنے بیٹھ گیا۔ بینا کو معلوم تھا کہ اس خط میں پچھلے سولہ سال کے سیاسی واقعات پر تبصرہ ہے۔ انقلابی پارٹی کی کاروائی رپورٹ ہے۔ جوں جوں وجے سنگھ

کے دفتر میں لگی ہوئی وجے سنگھ کی تصویر دیکھی تھی۔ شاندار وجیہہ جوان، چوڑا چکلا سینہ اُونچی پیشانی اور چمکدار کالی آنکھیں جو تصویر کے پردے میں سے بھی دلوں کو برما دیتی تھیں۔ خوبصورت آنکھیں خوفناک آنکھیں۔ اُن کی گہرائی میں جُنون تھا۔ مگر اُن کی سطح پر بچوں کی سی سادگی کھیل رہی تھی۔ ناممکن تھا کہ کوئی اِن آنکھوں کو دیکھے اور اُن کا شکار نہ ہو جائے۔ بینا نے اِن آنکھوں سے انقلاب کا سبق سیکھا تھا۔ اپنے اصولوں کے لئے مر مِٹنے کی تمنّا اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قُربان کرنے کی حسرت۔ سب کچھ جان ـــ مال ـــ عزّت۔ ہاں عزّت بھی۔ جب کبھی اس کا قدم انقلاب کی دُشوار گذار راہوں پر ڈگمگاتا، بینا اِن آنکھوں کی طرف دیکھتی اور ایک لمحے میں اُس کا دِل ایک نامعلوم طاقت سے بھر جاتا اور پھر اُس میں ہر مشکل، ہر مصیبت کا سامنا کرنے کی ہمّت پیدا ہو جاتی۔ مگر یہ آنکھیں ایک انقلابی ہی کی نہیں۔ ایک مرد کی آنکھیں بھی تھیں ـــ اُن میں ایک حیوانی کشش بھی تھی، ایک جُنون انگیز شرارہ، ممنوعہ لذّتوں کا ایک اِشارہ۔ اُس دِلفریب دُنیا کی ایک جھلک، جس کا دروازہ سماج نے بینا جیسی غیر شادی شُدہ لڑکیوں کے لئے بند کر رکھا تھا۔ مگر یہ دروازہ توڑا بھی جا سکتا ہے۔ بینا اپنی پارٹی ہی میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی جنہوں نے اِس خیالی دروازے کو توڑ کر آزاد جنسی تعلقات کی زمین سر میں قدم رکھا تھا۔ کیا آج کی رات وہ بھی وجے سنگھ کی مدد سے ...... وہ اس خیال ہی سے شرما گئی۔ ایسی باتیں سوچنی بھی نہیں چاہئیں، مگر کیوں نہیں۔ وجے سنگھ خوبصورت ہے، جوان ہے، تندرست ہے، اور اُس کی آنکھوں میں دِلفریب مسرّتوں کا پیغام ہے۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ بینا کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا اور وہ وجے سنگھ کی تلاش میں ایک سِرے سے دُوسرے سرے تک دوڑنے لگی۔ کہیں اُس کا پتہ نہ ملا۔ کسی درجے میں بھی پارٹی کے دفتر والی تصویر سے مِلتا جُلتا مسافر نہ تھا۔ ٹرین سے اُترا تو بس ایک مجہول شخص، بڈھا فقیر۔ دونوں کسان برآمدے سے اُٹھ کر ایک تھرڈ کلاس کے بھرے ڈبے میں گُھس گئے۔ اِنجن نے سیٹی دی اور ٹرین چلدی۔ تو کیا وجے سنگھ اس گاڑی سے نہیں آیا؟ کیا اس کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا؟ مگر وہ بڈھا کیوں پلیٹ فارم کی لالٹین کے نیچے بینا کو گھُور گھُور کر دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ مِس بینا ہیں؟" فقیر کی آواز میں نفاست تھی۔

اور جب بینا نے "ہاں" کہا تو اس کی نگاہ بڈھے کی آنکھوں پر پڑی ـــ آنکھیں جو ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں سے اس طرح چمک رہی تھیں جیسے گھنے جنگل میں کسی خوبصورت مکان کی دو کھڑکیاں جگمگا رہی ہوں۔

"آپ ...... ہی ... کامریڈ وجے سنگھ ہیں؟"

بڑا کام کرنے کو تیار تھی۔ اُسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی اور یہ بالکل معمولی کام تھا۔ لیڈر نے جو ہدایات دی تھیں وہ اب تک بینا کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

" دیکھو ہمارا پُرانا ساتھی وِجے سنگھ سولہ برس کی جیل کاٹ کر آ رہا ہے۔ مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہر پہنچتے ہی اُس کو پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیونکہ پولیس ڈرتی ہے کہ اُس کی واپسی سے انقلابی، پارٹی کا اثر اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ اِس لئے تم اُسے رام نگر کے اسٹیشن ہی پر اُتار لینا۔ رات بھر وہ تمہارے مکان پر ٹھہرے گا اور صبح کو وہ شہر جا کر اپنے آپ کو پولیس کے سامنے گرفتاری کے لئے پیش کر سکتا ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ جیل جانے سے پہلے وہ کم از کم بارہ گھنٹے تو آزاد رہے۔ یہ خط تم اُسے دے دینا اور اِس کا جواب جو وہ لکھے پارٹی کے دفتر میں پہنچا دینا۔"

" رات بھر وہ تمہارے مکان پر ٹھیرے گا"۔ مگر بینا کا مکان تو دو چھوٹے چھوٹے کمروں سے زیادہ نہ تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار پانے والی سکول کی اُستانی اس سے بڑے مکان کا خرچ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ پھر وہ رہتی بھی تھی اکیلی۔ نہ کوئی رشتہ دار۔ نہ نوکر۔ اپنا کھانا بھی خود ہی پکاتی تھی۔ اِن حالات میں ایک غیر مرد کا اکیلے مکان میں اس کے ساتھ رات گزارنا —— بینا کی پرورش ایک مذہبی رواج پرست گھرانے میں ہوئی تھی۔ اگرچہ کالج کی تعلیم اور انقلابی خیالات نے اُس کا دماغ کافی حد تک آزاد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کے دِل کی نچلی تہ میں سماج کا خوف سمایا ہوا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اور ساتھ ہی ایک جوان مرد کی قربت کی ناقابلِ بیان کشش جنسی تجربے کی دبی ہوئی خواہش۔ خواہش بھی اور خوف بھی۔ وہ جوان تھی مگر مرد کی آغوشِ محبت سے ناآشنا۔ وہ کتابی علم کی مدد سے جنسیات پر اصولی بحث کر سکتی تھی مگر اس کے عملی پہلوؤں سے بالکل ناواقف تھی۔ ہاں قدرت نے خود اس کے بدن میں ایک عجیب سی گدگدی، ایک عجیب سی چبھن، ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ایک ہی دوا ہے مگر شادی سے پہلے اس دوا کی خوراک پینا یہ بھی تو اتنا آسان نہ تھا۔

دُور اندھیرے میں سگنل کی لال روشنی سبز روشنی میں تبدیل ہو گئی۔ پلیٹ فارم کے سامنے کی ریل کی پٹریاں اپنی جھنجھناہٹ سے ہونے والی ٹرین کی خبر دینے لگیں۔ بینا کی توجہ جنسی مسائل سے ہٹ کر وجے سنگھ کی طرف مبذول ہو گئی جو ابھی چند منٹ میں رام نگر پہنچنے والا تھا جو رات بھر —— بارہ گھنٹے —— کے لئے اُس کا مہمان تھا۔ وجے سنگھ انقلابی پارٹی میں اس نام کی دھوم تھی۔ اس کے انقلابی کارناموں کو آج تک یاد کیا جاتا تھا۔ آج وہ سولہ برس کی قید کاٹ کر واپس آ رہا ہے۔ کل شاید پھر کسی کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے گا۔ یہی اُس کی زندگی تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر جان کی بازی لگا چکا تھا۔ وہ نہ قید خانے سے ڈرتا تھا۔ نہ پھانسی کے تختے سے۔ بینا نے پارٹی

۱

بارہ گھنٹے

دسمبر کا مہینہ!

سٹیشن ماسٹر کا گھنٹہ ـــــ پونے آٹھ بجا رہا تھا۔ گاڑی کے آنے میں اب بھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ بینا نے سوچا اور پلیٹ فارم کے چکر لگانے لگی۔

چھوٹا سا اسٹیشن۔ نہ کتابوں اور اخباروں کی دوکان۔ نہ کوئی ہوٹل۔ چائے کی ایک پیالی بھی ملنی ممکن نہیں۔ بس دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت۔ ایک کمرے میں سٹیشن ماسٹر کا دفتر۔ دوسرے میں ٹکٹ گھر۔ ٹکٹ گھر پر بیئر تو نہیں تھی۔ دو کسان گاڑھے کی چادروں میں لپٹے، کانوں کو رات کی ٹھنڈی ہوا سے بچانے کے لئے ڈھاٹا باندھے برآمدے میں سکڑے بیٹھے تھے۔ دور سگنل کی لال روشنی اندھیرے میں چمک رہی تھی۔

بینا ساڑھی پر ایک سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ اس پر ایک اونی چادر۔ مگر اس وقت اُس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ جب سے وہ انقلابی پارٹی میں شامل ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک اہم کام اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اِسی خیال سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور باوجود برفیلی ہوا کے اُس کے گال تمتا رہے تھے۔ کیا وہ یہ کام بہ خوبی انجام دے سکے گی؟ کوئی گڑبڑ تو نہ کرے گی؟ گھبرا تو نہ جائے گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اُس نے سوچ سمجھ کر انقلابی پارٹی میں شرکت کی تھی۔ وہ انقلاب کے لئے بڑے سے

جج کے چہرے پر ایک گہرے اطمینان اور فتح مندی کے احساس کے آثار تھے۔ آج قانون اور انصاف کی بہت بڑی جیت ہوئی تھی۔

اور اُوپر آسمان میں اُڑتی ہوئی سفید بطخوں کی ڈار ایک سوالیہ نشان کی شکل میں دکھائی دی — اور اس سوالیہ نشان کی پرچھائیں جب اُس جیل پر سے اُڑتی ہوئی گزری تو ایسا لگا کہ جیسے پھانسی گھر اور پھانسی کی جھولتی ہوئی رسّی پر ایک لمحہ کے لئے یہ سوالیہ منجمد ہو گیا ہو۔

۱

بارہ گھنٹے

دسمبر کا مہینہ!

سٹیشن ماسٹر کا گھنٹہ ——— پونے آٹھ بجا رہا تھا۔ گاڑی کے آنے میں اب بھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔ بینا نے سوچا اور پلیٹ فارم کے چکر لگانے لگی۔

چھوٹا سا اسٹیشن۔ نہ کتابوں اور اخباروں کی دوکان۔ نہ کوئی ہوٹل۔ چائے کی ایک پیالی بھی ملنی ممکن نہیں۔ بس دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت۔ ایک کمرے میں سٹیشن ماسٹر کا دفتر۔ دوسرے میں ٹکٹ گھر۔ ٹکٹ گھر پر ہیٹر تو نہیں تھی۔ دو کسان گاڑھے کی چادروں میں لپٹے، کانوں کو رات کی ٹھنڈی ہوا سے بچانے کے لئے ڈھاٹا باندھے برآمدے میں سکڑے بیٹھے تھے۔ دور سگنل کی لال روشنی اندھیرے میں چمک رہی تھی۔

بینا ساڑھی پر ایک سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ اس پر ایک اونی چادر۔ مگر اس وقت اُس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ جب سے وہ انقلابی پارٹی میں شامل ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک اہم کام اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اسی خیال سے اُس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور باوجود برفیلی ہوا کے اُس کے گال تمتا رہے تھے۔ کیا وہ یہ کام بہ خوبی انجام دے سکے گی؟ کوئی گڑبڑ تو نہ کرے گی؟ گھبرا تو نہ جاتے گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اُس نے سوچ سمجھ کر انقلابی پارٹی میں شرکت کی تھی۔ وہ انقلاب کے لئے بڑے سے

جج کے چہرے پر ایک گہرے اطمینان اور فتح مندی کے احساس کے آثار تھے — آج قانون اور انصاف کی بہت بڑی جیت ہوئی تھی۔

اور اوپر آسمان میں اُڑتی ہوئی سفید بطخوں کی ڈار ایک سوالیہ نشان کی شکل میں دکھائی دی — اور اس سوالیہ نشان کی پرچھائیں جب اُس جیل پر سے اُڑتی ہوئی گزری تو ایسا لگا کہ جیسے پھانسی گھر اور پھانسی کی جھولتی ہوئی رسّی پر ایک لمحہ کے لئے یہ سوالیہ منجمد ہوگیا ہو۔

کہا جو آدمی کے ساتھ آتے تھے اور ٹھنڈی سانس لے کر باہر چلا گیا۔

قیدی! دفعتاً آدمی کو احساس ہوا کہ وہ ابھی تک حکومت کا قیدی ہے۔ اُس کا ماتھا گرم ہوا اور دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

قیدی کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ ایک پادری کہیں سے نمودار ہوگیا اور جلوس چل پڑا۔ یہ سب اُس کو کہاں لے جا رہے تھے؟ اور کیوں؟

جیل کے وارڈ۔

آدمی۔

وہ دونوں کانسٹبل جن کو دھوکا دے کر وہ بھاگا تھا۔ چھوٹا والا خاموش اور مغموم تھا۔ بڑا والا مسکرا کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اُسی کی پستول کی گولیوں نے قیدی کے دِل کو چھلنی کیا تھا۔

جیلر۔

ڈاکٹر

اور سب سے پیچھے وہی جج جس نے اُس کو سزائے موت کا حکم سُنایا تھا۔

اور سو یہ سب جلوس کی شکل میں آدمی کو پھانسی کے تختے تک لائے۔

جلّاد اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے آدمی کے سر اور چہرے پر کالا غلاف چڑھا دیا۔ آدمی نے اپنی گردن کے گرد پھانسی کا پھندہ تنگ ہوتا محسوس کیا۔ اُس کے دماغ میں موت کا ڈر اتنا نہیں تھا، جتنی ایک عجیب بے چینی تھی۔ ایک مبہم سا سوال تھا ــــ وہ کیا سوال تھا۔ اُس کا جواب کیا تھا؟ اب یہ سوچنے کا وقت نہیں رہ گیا تھا ــــ شاید اس کی موت کے بعد دُوسرے آدمی اُس سوال کو دنیا کے سامنے پیش کریں گے ــــ شاید کوئی اُس کا جواب بھی دے سکے۔ لیکن اُس وقت وہ اس دنیا میں نہیں ہوگا......

جیلر نے اشارہ کیا، جلّاد نے ایک ہتھہ دبایا۔ آدمی کے پیروں کے نیچے سے تختہ گر گیا اور آدمی پھانسی پر لٹک گیا۔ چند لمحوں میں اُس کی زندگی کا افسانہ ختم ہوگیا۔

ڈاکٹر نے لاش کا لاش کا معائنہ کیا، سیتھوسکوپ لگا کر سینے کا معائنہ کیا۔ جب اُسے اطمینان ہوگیا کہ دل کی حرکت ــــ اُسی دل کی حرکت جو ایک مرتے ہوتے آدمی کے کلیجے میں سے نکال کر دوسرے آدمی کے سینے میں لگایا گیا تھا ــــ ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی ہے تو اس نے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیئے۔ "میری موجودگی میں پھانسی دیدی گئی اور وہ پھانسی پر لٹکا رہا۔ جب تک مجرم کے دِل کی حرکت ہمیشہ کے لئے بند نہ ہوگئی۔"

”کیا محسوس کرتے ہیں آپ؟“ ایک نے پوچھا۔

”اچھا ہوں۔“ آدمی نے جواب دیا۔ ”مگر کمزوری محسوس کرتا ہوں۔“

”کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں یہ پہلا آپریشن ہے جس میں ایک دِل دُوسرے کے سینے میں کامیابی سے لگایا گیا ہے؟“

”جانتا ہوں۔ یہ سوچ کر ہی میرے سر میں چکر آجاتا ہے۔“

”کیا آپ جانتے ہیں کہ حکومت نے آپ کے آپریشن پر لاکھوں روپے خرچ کئے ہیں؟“

”جی ہاں۔ یہ بھی جانتا ہوں اور میں حکومت کا شکرگذار ہوں کہ میری جان بچانے کے لئے اُنہوں نے اتنا خرچ کیا۔ اُن کے ڈاکٹروں نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔“

”آپ کو اپنا پُرانا دل پسند تھا یا یہ نیا دِل پسند ہے؟“

”مجھے یہ نیا دِل پسند ہے۔ پُرانے دِل میں بہت سی بُرائیاں آگئی تھیں۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً نفرت، تشدد پسندی، شبہ، وہم۔ نئے دل کے ساتھ میں نئی زندگی شروع کرسکتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے اشارہ کیا کہ کافی وقت ہوگیا ہے اور اخبار نویس اُٹھ کھڑے ہوتے۔ مگر جانے سے پہلے ایک جرنلسٹ نے پوچھا ”بس ایک آخری سوال، ہسپتال سے نکلنے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”زندہ رہنا۔ بس یہی میری زندگی کا پروگرام ہے اور اب میں اس پروگرام کو پورا کرسکتا ہوں۔“

◆

تین مہینے کے بعد آدمی کو ہسپتال سے چھٹی دیدی گئی۔

”اب تم گھر واپس جاسکتے ہو۔“ ڈاکٹر نے کہا ”خدا حافظ اور گڈ لک۔“

ایک بڑی آرام دہ، گدّے دار موٹر میں بٹھا کر آدمی کو ایک نئی اور انجانی بلڈنگ میں لایا گیا۔ یہاں بھی ایک ڈاکٹر اُس کا معائنہ کرنے کے لئے انتظار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر نے آدمی کے دل کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ بلڈ پریشر کا آلہ لگا کر دیکھا۔ سینے میں ”سٹیتھو سکوپ“ لگا کر دیکھا۔ ”سانس اندر سانس باہر“ کرایا۔ امتحان کے لئے اُس کی اُنگلی میں پن چُبھا کر خون نکالا۔ اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر اعلان کیا کہ آدمی کا دِل اور دماغ دونوں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔

”قیدی اپنی سزا بُھگتنے کے لئے پوری طرح سے قابل ہے۔“ اُس نے اُن وارڈروں سے

تکلیف محسوس ہوئی مگر یہ تکلیف اصلی تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو خواب کی تکلیف تھی۔

اور پھر بے ہوشی کی صدیاں گزر گئیں اور وہ درد کی لہروں میں ڈوبتا رہا، ڈوبتا رہا اور اُسے یہ یاد بھی نہ رہا کہ یہ سمندر ہے جس کی تہہ میں وہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ یا وہ دلدل ہے جو اُس کی ٹانگ گھسیٹ کر قبر میں اُتارنا چاہتی ہے اور پھر اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی اُس نوجوان سے کہہ رہی ہے۔ جو وہ خود تھا — ‘مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل توڑ دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اتنا نازک ہے۔ لو میں تمہیں ایک نیا دل دیتی ہوں۔ یہ تمہارے سینے میں فٹ آتے گا۔ تمہارے بہترین دوست کا دل ہے ”۔ اور اس نے وہ دل لے لیا اور اپنے سینے میں جو جگہ خالی تھی وہاں رکھ لیا مگر جگہ تنگ تھی، دل بڑا تھا، بڑی مشکل سے اِدھر اُدھر سے دبا کر اس کو جگہ پر لگایا مگر تکلیف اتنی ہوئی کہ اس نے سوچا میں مر جاؤں گا۔

بے ہوشی کے سمندر میں بڑی دُور سے تیرتی ہوئی جج کی آواز آئی "شاباش، ڈاکٹر۔ تم نے آپریشن نہیں کیا ایک چمتکار کیا ہے"

اور پھر اُس کے بازو میں ایک سُوئی چُبھی اور پھر وہ بے ہوشی کے اندھیرے سمندر میں ڈوب گیا۔

جب درد اور بے ہوشی کی صدیاں گزریں اور اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ہر طرف سفیدی ہی سفیدی پھیلی ہوئی ہے۔ سفید دیواریں، سفید دروازے، سفید کھڑکیوں میں سفید پردے لگے ہوتے ہیں، فرشتوں کی طرح سفید فراک پہنے ہوئی نرسیں اور سفید کپڑے پہنے ہوتے سفید داڑھی والا ڈاکٹر جو اس وقت اُسے خدا نظر آ رہا تھا۔

جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ آدمی کو ہوش آ گیا ہے تو وہ چلتا ہوا اُس کے پلنگ کے پاس آیا اور مُسکرا کر کہا "شکریہ میرے دوست۔ اگر تمہاری قوتِ ارادی زندگی کا دامن چھوڑ دیتی تو آپریشن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔"

آدمی کمزوری کے مارے زیادہ بول نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی وہ ہلکے سے بڑبڑایا "کیا آپریشن کر کے میرے دل میں سے گولیاں نکال دیں آپ نے؟"

ڈاکٹر کے سنجیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی "نہیں، میرے دوست۔ ہم نے تمہارے گولیوں سے چھلنی دل کو نکال کر اس کی جگہ ایک نیا دل لگا دیا ہے یہ پہلا ایسا آپریشن ہمارے ملک میں ہوا ہے"

●

ایک اور ہفتہ گزر گیا۔ اب آدمی تکیوں کے سہارے پلنگ پر بیٹھ کر اخبار نویسوں کے سوالوں کا جواب دے سکتا تھا۔

نے ٹٹول کر وہ رگ ڈھونڈ نکالی جس کو دبانے سے نرخرہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کُتّا بے جان ہو کر گر پڑا۔ کُتّا "کراٹے" نہیں جانتا تھا۔

اب وہ دونوں ختم ہو چکے تھے مگر اُس کی اپنی جان اب بھی خطرے میں تھی اور اُس دشمن کے مقابلے میں نہ "کراٹے" کام آ سکتے تھے نہ "جیو جِتسو"۔ یہ دشمن وہ دلدل تھی جس نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ اُس نے اب تک اِس کا خیال نہیں کیا تھا مگر وہ کمر تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔ ایک کتے کی لاش تو آدمی سے زیادہ دلدل کی قبر میں اتر چکی تھی۔ دوسرے کے مُردے کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا اور (اس نے ایک جھرجھری لے کر سوچا) میری قبر بھی ان دونوں کے ساتھ ہی بنے گی۔

موت کا خوف جو عدالت میں جج کا فیصلہ سُن کر بھی اس کی آنکھوں میں نہیں جھلکا تھا اُس وقت اُس کے سارے شعور پر چھا گیا۔ اُس نے انتہائی مایوسی سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید بچنے کی کوئی صورت دکھائی دے جائے ـــــ تو سامنے پولیس کا کانسٹبل کھڑا نظر آیا۔ موٹا، بھدّا، چاند کی روشنی میں چہرے پر نفرت اور غصّہ۔ پاس آیا تو اُس کا گلا بھی دبا دُوں گا۔ آدمی نے سوچا۔ مگر پاس آئے گا کیوں۔ اس کے ہاتھ میں تو پستول ہے۔

اسی پستول سے اُس کی طرف نشانہ لگاتے ہوئے وہ دانت بھینچ کر بولا "تو نے میرے پیارے کالو اور لالو کو مار ڈالا۔ کمبخت۔ انہیں اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا میں نے۔ ابھی تجھے بھی اُن کے پاس پہنچاتا ہوں۔ ہاتھ اُوپر کر۔"

اور جب آدمی نے ہاتھوں کو سر کے اوپر اُٹھایا تو کانسٹبل بولا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ گولی سیدھی دل کے پار ہوگی۔" پستول نے اپنی نال میں سے آگ کا شعلہ اُگلا، ایک تڑاخہ ہوا ـــــ اور اس کے بعد آدمی کو نہ کوئی تکلیف محسوس ہوئی نہ کہیں درد ہوا۔ صرف ایک میٹھی سی ٹیس کلیجے میں اُٹھی، اور اُسے ایسا لگا جیسے وہ نیند کے گہرے سمندر میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

خواب میں اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا اور پھر پہچانا کہ یہ نوجوان وہ خود ہے اور ایک چھوٹی سی خوبصورت سی لڑکی ہے۔ جو ہنستی ہوئی بھاگ رہی ہے اور وہ اُس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اس کے ہاتھوں میں اُس کا اپنا دل ہے اور اِس دل کو وہ اُس لڑکی کی نذر کرنا چاہتا ہے۔ "دل دینا چاہتے ہو؟" لڑکی نے کہا اور اب اس نے دیکھا کہ یہ لڑکی اُس کی بیوی ہے جو پھر زندہ ہو گئی ہے۔ "دِل دینا چاہتے ہو تو لاؤ۔" اور اُس نے اپنا دِل اُس لڑکی کو دے دیا۔ "ذرا سنبھال کر۔ میرا دل بڑا نازک ہے۔" ابھی اُس نے کہا ہی تھا کہ لڑکی نے دِل کو زمین پر دے مارا اور جو کانچ کا بنا ہوا تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور کانچ کا ایک تیز ٹکڑا اُڑ کر اُس کو چُبھ گیا عین اُس جگہ جہاں کبھی اس کا دِل تھا اور بڑی سخت

بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کی حفاظت کرتے ہوئے اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ سارجنٹ نے ایسے موقع کے لئے کیا بتایا تھا۔ "یاد رکھو کہ شکاری کتا شیر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اُس کو اپنے قریب نہ آنے دو۔ ٹھوکر سے کام لو۔ تمہارے فوجی جوتوں میں اسی لئے نیچے موٹی موٹی کیلیں لگی ہوئی ہیں۔ وقت پڑے تو ان جوتوں کی مار سے ہتھیار کا کام لو۔" مگر اس وقت اُن کو ٹھوکر کیسے مارے؟ اُس کے تو ننگے پیر بھی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ اُس کی ٹانگوں کو اپنے اندر کرتی جا رہی تھی۔

اُس کے پاس تو اِس وقت دو ہاتھ تھے جن سے وہ اپنے چہرے کی حفاظت کر رہا تھا۔ جہاں چھلانگیں لگا لگا کر وہ دونوں شیطان اُس کی آنکھیں نکالے لیتے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت صرف مدافعت سے کام نہیں چلے گا۔ زہریلے پنجوں اور خونی دانتوں کی مار سے دونوں ہاتھ لہولہان ہو چکے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ہاتھوں کی کھال اُتر جاتے گی اور خون بہہ کر اُن کی ساری طاقت نکل جاتے گی۔ اُس سے پہلے ہی اُسے ان ہاتھوں سے کچھ اور کام لینا ہے۔ اُس نے ایک کُتّے پر ساری توجہ مبذول کر دی اور اگلی بار وہ اس کی طرف اُچھلا تو اس کے ہاتھوں نے "کراٹے" کے ایک پینترے سے اس کا گلا پکڑ لیا اور زور ـــــ سے دبایا ـــــ دوسرا کُتّا اب اپنے ساتھی کو بچانے کے لئے اس پر حملہ کر رہا تھا ـــــ اُس کی ننگی پیٹھ اور اس کا سینہ لہولہان ہو گئے مگر اس نے کُتّے کا گلا نہ چھوڑا۔ دباتے ہی چلا گیا جب تک کہ دشمن بے جان نہ ہو گیا۔

اور اب صرف ایک دشمن باقی رہ گیا تھا۔ پہلا کُتّا زمین پر پڑا تھا اور دَل دَل اُس کی لاش کو بھی اپنے اندر جذب کرتی جا رہی تھی۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر کُتّے میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اب اُس کی شکاری حس میں ایک زہر بھری نفرت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

یہ لڑائی ایک آدمی اور ایک جانور کی نہیں تھی۔ دو جانوروں کا خونی مقابلہ تھا۔ آدمی بھی اُس وقت ایک کُتّا ہی ہو گیا تھا۔ اگر کُتّا اُسے کاٹ سکتا تھا تو اُس کے دانت بھی مضبوط اور نکیلے تھے ـــــ اُس کے ہاتھ کُتّے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہے تھے، اُس کے دانت کُتّے کی گردن کو کاٹ رہے تھے۔ جیسے وہ کُتّے کا خون پی جاتے گا۔ اگر کُتّا خوفناک طریقے سے بھونک رہا تھا تو اس وقت آدمی بھی چیخ رہا تھا، چلّا رہا تھا، گالیاں دے رہا تھا۔ یہاں تک کہ کُتّے کی طرح ہی بھونک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ خونم خون ہو گئے تھے۔ اُس کے منہ سے تھوک کے ساتھ خون بہہ رہا تھا ـــــ اُس کا اپنا خون اور ساتھ میں کُتّے کا خون ـــــ مگر اس وقت یا اُس کی جان تھی یا کُتّے کی۔ اور کُتّا اگر حیوان تھا تو وہ بھی حیوان تھا ـــــ مگر ساتھ میں وہ انسان بھی تھا اور سو حیوانی طاقت کے ساتھ انسانی دماغ بھی شامل تھا۔ ایک دفعہ چار ٹانگ کے دشمن کی گردن اس کے ہاتھوں میں آگئی تو اس کے انگوٹھے

چھاپہ ماروں کو دشمن کی فوج اور پولیس کے شکاری کُتوں سے بھی سابقہ پڑ سکتا ہے اور اسی لئے کمانڈو سکول میں اُس نے یہ بھی سیکھا تھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ بھاگتے بھاگتے اُس نے اُن سب ہدایات کو یاد کیا جو ایسے وقت کے لئے اُن کو دی گئی تھی۔ پل بھر کے لئے رُکے بغیر اُس نے اپنی قمیص اُتاری اور اُس کا گولا بنا کر دُور ایک طرف پھینکا اور پھر پسینے میں شرابور بنیان کو دوسری طرف چٹانوں میں گرا دیا۔ کچھ دیر کے لئے تو شکاری کُتے قمیص اور بنیان کے درمیان گڑبڑا گئے۔ غصّہ اُنہوں نے کپڑوں پر نکالا۔ سونگھتے سونگھتے اُن کو اپنے بھیانک دانتوں اور پنجوں سے تار تار کر ڈالا۔ اب وہ اُن سے کوئی سو گز آگے تھا اور سامنے ہی جھیل کا پانی چاندنی میں چمک رہا تھا۔ یہی اُس کی نجات کا ایک راستہ تھا۔ اُس کو معلوم تھا کہ شکاری کُتے پانی میں اپنے شکار کی بُو نہیں سُونگھ سکتے۔

نکیلے پتھروں پر سے ننگے پیر بھاگتے ہوئے اُس کے تلوے لہولہان ہو گئے تھے۔ اُس کے اپنے پیروں کے نیچے خون نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر وہ ایک لمحے کے لئے بھی رُک نہیں سکتا تھا۔ کتوں نے پھر اُس کی بُو سونگھ لی تھی اور اب وہ تیزی سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ اُس وقت اُس ہرن کے مانند تھا جس کی ٹانگ میں گولی لگی ہو اور وہ شکاری کُتوں سے بچنے کے لئے لنگڑاتا ہوا بھاگتا جا رہا ہو، بھاگتا جا رہا ہو۔ کیونکہ رُکنے میں اُس کی موت ہے۔

اور اب جھیل کا پانی اس سے چند قدم ہی رہ گیا تھا۔ زمین جو یہاں تک پتھریلی تھی، اب نرم ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے گھاس کی نرمی جو اس کے زخمی پیروں کو ایسی لگی جیسے کسی نے اس کے تلوؤں کے زخموں پر مرہم کا پھایہ رکھ دیا ہو۔ پھر پھسلواں کیچڑ۔ ہوشیاری سے قدم رکھنا چاہیئے ورنہ پھسل کر گر گیا تو کُتے اس کا تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ مگر اب اُس کے پیر ایک دلدل میں پھنس گئے تھے جو ہر لحظہ اس کو دھیرے دھیرے نیچے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ دلدل سے پاؤں باہر نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ اب وہ کتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ کاش اس وقت اُس کی سنگین اُس کے پاس ہوتی تو وہ ان کُتے کے بچوں سے نپٹ لیتا۔ مگر اب تو اُس کی دونوں ٹانگیں بھی بیکار ہو گئی تھیں۔ گھٹنوں تک دلدل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اب تو اُس کے صرف دو ہاتھ تھے اور دو خونی کُتے تھے جو اپنے خوفناک دانت نکالے اس پر حملہ کر رہے تھے!

کہتے ہیں بھونکنے والے کُتے کاٹتے نہیں۔ مگر ان دونوں کتوں نے شاید یہ مثل نہیں سُنی تھی۔ وہ خوفناک آواز میں بھونک بھی رہے تھے اور پنجوں اور دانتوں سے اس کو کاٹ بھی رہے تھے اور اُس کے پاس اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف دو ہاتھ تھے۔ مگر کمانڈو سکول میں اس کو یہ بھی سکھایا گیا تھا کہ دشمن کے شکاری کتوں کو بغیر گولی چلاتے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔

اُس نے سنا تھا کہ نیند سُولی پر بھی آجاتی ہے۔ میلوں تک دوڑنے کے بعد جنگل میں رات ہو گئی، اور آدمی تھک ہار کر پیڑوں کے ایک جُھنڈ تلے سو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ کُتوں کے بھونکنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھُل گئی۔ پہلے تو اُس نے اس آواز کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ جھیل کے کنارے مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ دلدل میں جھینگر آواز کر رہے تھے، گھاس میں مچھر بھِن بھِن کر کے اُس کو کاٹ رہے تھے ـــــ اور دُور کسی گاؤں میں کُتّے بھونک رہے تھے۔ کُتّے تو رات کو بھونکتے ہی ہیں مگر تھوڑی ہی دیر میں اُس کو محسوس ہوا جیسے کُتّوں کے بھونکنے کی آواز تیزی سے قریب ہوتی جا رہی تھی جیسے کُتّے اُس کی طرف دوڑتے ہوئے آ رہے ہوں۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کو احساس ہوا کہ یہ پولیس کے شکاری کُتّے ہیں جو اُس کی بُو کا پیچھا کرتے ہوئے اُس کا شکار کرنے دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔ اب تو اُن کی آوازیں خطرناک حد تک قریب آ رہی تھیں۔ دفعتاً اس کی سب حِسیں بیدار ہو گئیں اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چاند کمبخت کو بھی آج رات ہی نکلنا تھا شاید گیارھویں رات تھی اور آسمان پر بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر وہ پیڑوں کے سائے سے نکل کر بھاگا تو میلوں سے کُتّے اُسے دیکھ لیں گے اور اگر نہیں بھاگا تو بُو سونگھتے سونگھتے وہیں پہنچ جائیں گے اور منٹوں میں اُس کا تِکّا بوٹی کر ڈالیں گے۔ دونوں حالتیں خطرناک تھیں مگر بھاگنے میں بچاؤ کی ایک صورت ہو سکتی تھی۔ اگر وہ سامنے والی جھیل تک پہنچ گیا اور تیر کر اُس کو پار کر گیا تو شکاری کُتّوں سے اس کا پیچھا چھُوٹ سکتا تھا۔

اُس کے تمام احساس، اُس کے گھٹے ہوئے بدن کی تمام طاقت، اُس کی تمام قوّتِ اِرادی سمٹ کر اِس وقت اُس کی بھاگتی ہوئی ٹانگوں میں آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا اِس وقت کے لئے فوج کے کمانڈو سکول میں اُس کو چھاپہ ماروں کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے مُڑ کر چاند کی روشنی میں دیکھا کہ شکاری کُتّے دو ہیں اور اُنہوں نے اپنے ساتھ کے پولیس کانسٹبلوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور اِس وقت وہ چھلانگیں بھرتے ہوئے اُس کی طرف آ رہے ہیں۔ ایک کے مقابلے میں دو۔ مگر وہ کُتّے تھے اور وہ آدمی تھا۔ وہ بے عقل جانور تھے اور اُس کے پاس دماغ تھا اور اِس دماغ کو وہ سب چالیں اور گھاتیں یاد تھیں جو ایسے موقع کے لئے اس کو سکھائی گئی تھیں اور سو اُس نے اُن کو تگنی کا ناچ نچایا ـــــ سیدھا دوڑنے کی بجائے کبھی اِدھر گیا کبھی اُدھر گیا۔ پیڑوں کے گرد گھوم کر ٹیلوں پر سے گھوم کر، کھیتوں میں سے، کاشت کاروں کے جھونپڑوں کے آنگن میں سے ہو کر۔ اُس کو معلوم تھا کہ شکاری کُتّے ایک آدمی کا پیچھا نہیں کرتے۔ وہ تو ایک خاص بُو کو سونگھتے سونگھتے اپنے شکار تک پہنچ جاتے ہیں اور اِس لئے وہ ہر اُس جگہ جانے کے لئے مجبور تھے جہاں اُس کے بھاگتے ہوئے چک پھیریاں کھاتے ہوئے قدم ایک پل کے لئے بھی گئے تھے۔

”ٹو“ ....

”تھری“

”فور“

فادر کی چھڑی چار بار ہوا میں اٹھی اور چار بار موہن کے ہاتھ پر پڑی، اور ہر بار موہن اپنے درد کو پی گیا اور ہر بار للی بے اختیار چلا پڑی۔

”دیٹ ول وڈ“ (THAT WILL DO) فادر نے چھڑی واپس میز پر رکھتے ہوتے موہن سے کہا اور پھر اپنی لمبی سفید داڑھی پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ اب کبھی کوئی میری داڑھی کی تصویر بنائے تو یاد رکھے کہ میری داڑھی اتنی چھوٹی نہیں ہے جیسی موہن نے بنائی ہے۔ پورے ساڑھے تیرہ انچ لمبی ہے“ یہ سُن کر سب بچے ہنس پڑے۔ فادر ولیم بھی ہنس پڑے۔ موہن ہنس کر جلدی جلدی بلیک بورڈ کپڑے سے صاف کرنے لگا۔ تب فادر ولیم نے للی کو دیکھا جو آنکھیں پھاڑے فادر کو دیکھ رہی تھی۔

”ویل۔ للی تم کو کیا چاہیئے“ فادر نے نرمی سے پوچھا۔

”فادر......“

”یس مائی چائلڈ!“

للی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیدھی بلیک بورڈ کے پاس گئی اور موہن سے چاک چھین کر خود اسی جگہ فادر ولیم کی تصویر بنانے لگی۔

سب حیرت سے دیکھتے رہے کہ للی کو دفعتاً نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

للی کی بنائی ہوئی تصویر نہ صرف اچھی نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے فادر ولیم کی تصویر نہیں لگتی تھی۔ نہ فادر ولیم اتنے موٹے تھے، نہ وہ اتنے لمبے تھے، نہ اُن کے گلے میں اتنا بڑا کراس لٹکا رہتا تھا۔ نہ اُن کی آنکھیں اتنی بڑی اور ایسی بھیانک تھیں جیسی للی نے اپنی تصویر میں بنائی تھیں۔ مگر داڑھی کو للی نے بڑی احتیاط سے بنایا اور تصویر ختم کرتے ہوتے فادر ولیم کی طرف مڑ کر بولی۔ ”اب آپ فٹ رول لے کر اپنی داڑھی کو ناپ لیجئے۔“

اس پر ساری کلاس کھکھلا کر ہنس پڑی اور باوجود فادر ولیم کے اپنی بید سے میز کو دھڑ دھڑانے کے بچے ہنستے ہی رہے۔

اس سے خفا ہو کر فادر نے للی کی طرف مُڑ کر پوچھا ”کون ہو تم؟“

للی نے کہا۔ ”للی“

ایک چھوکرا کلاس کے پیچھے سے چلایا۔ ”للی نہیں فادر، لیلی!“

رہا ہو یا جن کے ماں باپ سرکاری یا بیوپاری سکولوں کی فیس نہ دے سکتے ہوں۔ فادر ولیم کے اسکول کا نہ کوئی نام تھا نہ اس میں میز کرسیاں، بنچ اور ڈیسک تھے۔ بس ایک تین ٹانگ کے کٹہرے پر لگا بلیک بورڈ تھا جس پر اس وقت موہن چاک سے فادر ولیم کی اُڑتی ہوئی سفید داڑھی کی تصویر بنا رہا تھا۔

اور دُور اپنی جگہ پر بیٹھی للی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے بلیک بورڈ کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں کالے تختے پر دھیرے دھیرے فادر ولیم کا گول چہرہ اور اُن کی ہوا میں بکھری ہوئی سفید داڑھی اُبھر رہی تھی مگر دراصل وہ اپنے موہن کی طرف دیکھ رہی تھی اور اب بغیر تتلاتے دل ہی دل میں سوچ رہی تھی "میرا موہن کتنا اچھا ہے۔ اُس نے تصویر بھی بنائی ہے تو کتنی اچھی بنائی ہے۔ ایسا لگتا ہے فادر ولیم کی داڑھی اب اُڑی اَب اُڑی!"

ابھی موہن نے تصویر پُوری نہیں کی تھی کہ فادر ولیم جاگ پڑے اور سب بچے جو اب تک شور مچا رہے تھے یا آپس میں دھول دھپا کر رہے تھے، ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور زور زور سے سی اے ٹی کیٹ۔ کیٹ معنی بلی" کرنے لگے۔ مگر موہن کا منہ ابھی تک بلیک بورڈ کی طرف تھا۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ فادر ولیم کے ساتھ ساتھ ان کی تیل میں بھیگی ہوئی چھڑی بھی اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مُ - م - م - موہن!" للی اب ساڑھے سات برس کی ہو چکی تھی۔ اور اس نے تتلانا بند کر دیا تھا مگر موہن کو مار پڑے گی اس ڈر سے وہ ہکلاتی ہوئی چلائی۔ "م - م - موہن - ف - ف - ف - ا - در - !"

موہن گھبرا کر مڑا اور ساتھ ہی اس کی کمر پر چھڑی کی مار پڑی۔

یہ دیکھ کر سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ سب، سوائے ایک للی کے۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے فادر ولیم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ہاتھ باہر نکالو موہن!" فادر ولیم نے ڈانٹ کر کہا، اور جب ڈر کے مارے موہن ہچکچایا تو انھوں نے ایک عجیب انداز سے (جس میں حکم بھی تھا اور التجا بھی) کہا۔

"ہاتھ نکالو، یو فول، ہاتھ باہر نکال اور کہیں مار پڑی تو کسی ہڈی پر چوٹ آجائے گی۔"

سو موہن نے ہاتھ آگے کر دیا۔

فادر ولیم کی چھڑی ہوا میں اُٹھی اور سڑاپ سے موہن کے ہاتھ پر پڑی۔

موہن نہیں چاہتا تھا کہ للی کے سامنے وہ کسی کمزوری یا بودے پن کا اظہار کرے۔ چھڑی کا نشان اس کے ہاتھ پر پڑ گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہتھیلی پر کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو مگر اُس نے دانت کچکچا لیے اور اُس کے منہ سے اُف نہ نکلی۔

مگر چلتے چلتے للی چلا پڑی جیسے مار اُس کو پڑی ہو۔

دیکھ رہی ہے وہ بڑی بڑی اور خوبصورت ہیں جیسے اس ہرن کی آنکھیں جو اُس نے چڑیا گھر میں دیکھی تھی اور جس کے تختے پر لکھا ہوا تھا "عربستان کی ہرن"۔

اور للی نے موہن کی طرف دیکھا جو ایک میلی نیکر پر اپنے باپ کا پھٹا ہوا ایک بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس نے خاموش مسکراہٹ سے اپنے دل میں سوچا "یہ چھوکا مجھے اچھا لگتا ہے، اچھے چپے میں دو چھتی کلوں گی۔ اب میں اچھے ڈنڈا نہیں مانگوں گی۔"

روشنی کے دائرے میں وہ دونوں ایسے کھڑے تھے جیسے ان کے اردگرد کسی نے قسمت کا ایسا حصار کھینچ دیا ہو جس سے باہر نکلنا اب اُن کے بس میں نہ ہو —— اور پھر وقت رُک گیا اور وہ دونوں وہاں خاموش کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک......

شاید صرف ایک منٹ۔
شاید ایک سو برس۔
شاید پانچ منٹ۔
شاید پانچ سو برس۔

◆

فادر ولیم کی لمبی سفید داڑھی ہوا میں ایسے اُڑ رہی تھی جیسے وہ اُڑتا ہوا کبوتر ہو، اور سامنے بیٹھے ہوئے سب بچے حساب کا سوال کرنے کی بجائے فادر ولیم کی داڑھی کا کھیل دیکھ رہے تھے جو کبھی ہوا کے جھونکے سے اپنے پر پھیلا لیتی تھی اور کبھی پامفریٹ مچھلی کی طرح گول اور سپاٹ ہو جاتی تھی۔ اُن کی کرسی کے پاس اُن کی بید کی چھڑی رکھی تھی۔ جس کی مار کا مزا ہر بچہ چکھ چکا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ فادر اُسے روز تیل میں بھگو کر لاتے ہیں، مگر اس وقت کسی کو مار کھانے کا ڈر نہیں تھا کیونکہ فادر ولیم کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ رہے تھے بلکہ شاید سو رہے تھے۔ صرف اُن کی داڑھی جاگ رہی تھی ——

فادر ولیم دراصل "فادر" کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ کسی زمانے میں وہ پادری ضرور تھے، مگر انہیں رومن کیتھولک چرچ سے نکالا ملا ہوا تھا کیونکہ انھوں نے لاٹ پادری سے کہہ دیا تھا کہ چرچ کا کام عیسیٰ مسیح کا امن اور محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ نہ ہندوؤں مسلمانوں یا ہریجنوں کو مختلف قسم کے لالچ دے کر اُن کو عیسائی بنانا۔ سو اُن کا پادریوں والا لمبا چوغہ اُن سے چھین لیا گیا تھا مگر اُن کی لمبی داڑھی لاٹ پادری بھی اُن سے نہ چھین سکے تھے اور اب وہ اس جھونپڑیوں کی بستی میں آسمان کے نیچے اپنا اسکول چلاتے تھے۔ جس میں وہ بچے پڑھتے تھے جن کو کسی سرکاری اسکول میں داخلہ نہ

میلا پھٹا فراک پہنے ہاتھ میں اپنے قد سے بڑا بالنس کا ڈنڈا لئے کھڑی ہے۔

”چھالا بے ایمانی کرتا ہے۔“ بچی ڈنڈا لئے موہن کی طرف بڑھی۔ ”چل لکھ اپنی گاگل، لائن میں چھپ چے پیچھے۔“

موہن کو اُس تو تلی چھوکری کی بات سُن کر ہنسی آ گئی۔ ” اری جا جا۔ میں جہاں جی چاہے اپنی گاگر رکھوں گا۔ تو کون ہوتی ہے مجھے روکنے والی۔“

یہ کہہ کر وہ گاگر رکھنے والا ہی تھا کہ وہ بولی ” تو پھل میں چھول مچا کے چھپ کو بُلاتی ہوں۔ چھپ مال مال کے تمھالا بھُلکس بنا دیں گے۔“

موہن کا ہاتھ رُک گیا۔ وہ جانتا تھا اگر اُس چھوکری نے سچ مچ شور مچایا تو کیا ہوگا۔ ہر جھونپڑی سے لوگ لاٹھیاں، ڈنڈے، چاقو، چھرے، پتھر لئے ہوئے نکلیں گے اور کوئی سوال و جواب کئے بنا اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ صحرائے عرب کی طرح اس بستی میں بھی ایک چلو پانی کے لئے دس چلو خون بہایا جا سکتا تھا۔

سو اس نے کہا ” اچھا بابا تو چلا مت۔ میں اپنی گاگر لائن میں سب سے پیچھے رکھ دیتا ہوں۔“

مگر بچی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنا ڈنڈا گھسیٹتی ہوئی موہن کے پیچھے پیچھے آئی تاکہ وہ کوئی بے ایمانی نہ کر سکے۔

موہن نے لائن کے اخیر میں اپنی گاگر زمین پر رکھ دی اور بولا ” بس اب تو ٹھیک ہے ؟“

” ہاں، چھپ ٹھیک ہے۔ اب تم جا کے چھو جاؤ۔“

” پر یہ جگہ سڑک کے پاس ہے۔ کوئی راستہ چلتا میری گاگر اٹھا کر چلتا بنا تو ؟ “

” تم پھکل نہ کرو۔ میں جو ہوں۔“ اور یہ کہہ کر اس نے چوکیداروں کی طرح ڈنڈے کو زمین پر مار کر کہا ” کوئی تمہالی گاگل کو ہاتھ بھی لگائے گا تو اُچھ کا چھل پھول دوں گی۔ ہاں!“

اور اتنی سی بچی کی اتنی بڑی بڑی باتیں سُن کر موہن بے اختیار مسکرا دیا۔

بستی کے کنارے جہاں وہ کھڑے تھے۔ وہاں سڑک پر بجلی کا کھمبا لگا ہوا تھا اور اس کی روشنی کے دائرے میں وہ دونوں نیچے کھڑے تھے۔ ساری دنیا اُس وقت سو رہی تھی، صرف محبت جاگ رہی تھی اور وہ دونوں۔ .... ایک نو برس کا لڑکا ایک چھ برس کی لڑکی۔

للی اور موہن۔

موہن اور للی۔

موہن نے اس تو تلی کالی دُبلی چھوکری کی طرف دیکھا، جو پھٹا فراک پہنے، ننگے پاؤں، اپنے قد سے بڑا ڈنڈا لئے کھڑی تھی اور کھمبے کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جن آنکھوں سے وہ اُسے ٹکٹکی باندھے

دوڑتا بھاگتا رہا ہو، بڑی پکی نیند آتی ہے۔ آدھی رات کو اُسے اُٹھانا آسان نہیں ہے۔

"ارے او موہن۔ اُٹھتا ہے یا نہیں۔" ماں نے ایک بار پھر اُسے جھنجھوڑا ـــــ

"سونے دو نہ ماں۔ ابھی تو آدھی رات ہوئی ہے۔ نل میں پانی تو صبح آٹھ بجے آئے گا۔"

"اچھا تو سوتا رہ۔ ابھی تیرا بابا آتا ہے وہ اُٹھائے گا تجھے۔"

بابا کا نام سنتے ہی موہن ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دُنیا میں وہ کسی سے ڈرتا تھا تو اپنے باپ سے اور خاص کر رات کو جب وہ دارو پی کر گھر لوٹتا تھا۔

"اچھا ماں، میں جاتا ہوں۔" آنکھ ملتا ہوا وہ اُٹھا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر گاگر اُٹھائی اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

ساری بستی اندھیرے میں سوئی ہوئی تھی۔ مگر سڑک کی پیلی روشنی نل کے پاس زمین پر رکھے ہوئے کنستروں، گاگروں اور گھڑوں پر پڑ رہی تھی۔

موہن نے سوچا سچ مچ مجھے بڑی دیر ہوگئی۔ یہاں تو سب پہلے ہی اپنے اپنے برتنوں کی لائن لگا گئے ہیں۔ اس طرح تو نل میں پانی آٹھ بجے آیا تو اپنا نمبر آتے آتے دس بج جائیں گے اور اس وقت تک پانی آنا بند ہوگیا تو ......؟

موہن نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ صرف نل سے لے کر بستی کے پچھلے کونے بلکہ سڑک تک پانی کے برتنوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ پہلے ایک چمکتی ہوئی گاگر، پھر ایک لال مٹی کا گھڑا، پھر ایک پرانا زنگ لگا کنستر، پھر ایک ڈالڈا کا خالی ٹین، پھر ایک صراحی، ایک بالٹی، ایک کنستر، ایک گھڑا، دو گاگریں، تین ٹین کے ڈبے، دو بالٹیاں، ایک گاگر......

موہن نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر سوچا، کسی کا برتن ہٹا کر اپنی گاگر آگے رکھ دوں۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ بستی کے قانون کے مطابق ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں، تب ہی تو لائن میں اپنا برتن رکھ کر چین سے سو جاتے ہیں۔ نہیں تو ہر کسی کو رات بھر پہرہ دینا پڑے۔ پانی کے لئے لائن توڑنے پر تو مار پیٹ کیا خون خرابے ہو جاتے ہیں۔ سو اپنی گاگر کو سب سے پیچھے لائن میں ہی رکھنا چاہیئے۔ مگر پھر اُسے یاد آیا کہ اس کا نمبر آنے سے پہلے نل بند ہوگیا اور گھر میں پانی نہ پہنچا تو اُس کا باپ ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دے گا۔

کوئی پرواہ نہیں۔ اُس نے سوچا۔ سب سو رہے ہیں، میں چپکے سے اپنی گاگر آگے بڑھا دیتا ہوں اور وہ نل کی طرف بڑھا، مگر وہ کسی کا کنستر سرکانے والا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"اے چھالا کیا کلتا ہے؟"

موہن گھبرا کر مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کالی سی، دُبلی سی، چھوٹی سی چھ سات برس کی بچی ایک

آج کے لیلیٰ مجنوں

ایک تھی لیلیٰ، ایک تھا مجنوں۔

مگر لیلیٰ کا نام لیلیٰ نہیں تھا، للی تھا، للی ڈی سوزا۔

اور مجنوں کا نام مجنوں نہیں تھا۔ موہن تھا۔ موہن ماہیکر۔

وہ دونوں اور اُن کے قبیلے صحرائے عرب میں نہیں رہتے تھے۔ ماہم اور باندہ کے بیچ میں سڑک کے نیچے اور کھاری پانی کی کھاڑی کے کنارے جو جھونپڑیوں کی بستی ہے وہاں رہتے تھے۔

مگر صحرائے عرب کی طرح اس بستی میں بھی پانی کی کمی تھی۔ ڈیڑھ سو جھونپڑیوں میں جو سات سو مرد عورتیں اور بچے رہتے تھے اُن سب کے لئے میٹھے پانی کا صرف ایک نل تھا اور اس نل میں صرف دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے شام کو پانی آتا تھا۔ ایک کنستر یا ایک گھڑا پانی لینے کے لئے کئی کئی گھنٹے پہلے سے لائن لگانی پڑتی تھی۔

ایک رات کو موہن جھونپڑی میں اپنے باپ کی کھٹیا کے نیچے سو رہا تھا کہ اس کی ماں نے اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔

"موہن، اے موہن اجا، نل پر اپنی گاگر لائن میں رکھ کے آ، نہیں تو پانی نہیں ملے گا۔"

موہن کی عمر اس وقت مشکل سے نو برس کی ہوگی اور نو برس کے بچے کو جو دن بھر کیچڑ مٹی میں

پڑی تھی۔

ایک اور بار شاٹ دہرایا گیا۔ ایک بار پھر ہیروئن نے کہا۔ "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

اسی وقت ایک ہوائی جہاز سٹوڈیو کے اُوپر سے گونجتا ہوا گزر گیا۔ لاؤڈ سپیکر میں سے ساؤنڈ رکارڈسٹ کی آواز آئی۔ "کٹ کٹ۔" ہوائی جہاز۔

کسی نہ کسی وجہ سے تین بار اور شاٹ دہرایا گیا۔ ٹیک نمبر نو کو "او کے" کیا گیا۔

ہیرو نے بچہ پروڈکشن مینیجر کے حوالے کیا۔ بچہ اب تک سو رہا تھا۔

پروڈکشن مینیجر نے بچہ اکسٹرا سپلائر کی گود میں دیا۔

اکسٹرا سپلائر نے چاوُلی کی گود میں بچہ دیا اور ساتھ ہی چالیس روپے دے کر اُس سے پچھتر روپے کی رسید پر انگوٹھا لگوا لیا۔

"جا اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا اور اچھی طرح علاج کروا۔"

"بابوجی۔ سیدھی وہیں جاتی ہوں۔ ٹیکسی کر کے۔ آپ کی کرپا سے اِس کا اِلاج ہو جاتے گا۔ آپ کے بچے جئیں۔"

بچوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر کے سکریٹری نے پہلے فیس لے لی۔ پھر ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کیا۔

"مگر یہ تو مر چکا ہے۔" ڈاکٹر نے ہاتھ لگاتے ہی کہا۔ اور چاوُلی کو ایسے لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔ پھر بھی وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "ڈاکٹر صاحب کیا ہوا میرے لال کو۔ اُسے تو صرف بخار آ رہا تھا۔"

"بخار سے نہیں، لگتا ہے تمہارا بچہ زہر سے مرا ہے۔ کیا دیا تھا اسے کھانے کو؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! جرا سی افیم دی تھی چُپ کرانے کو۔"

— — — — — — — — —

سال بھر بعد "ماں کا دِل" کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک بڑے نیتا نے تقریر کرتے ہوئے کہا "میں اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ہیرو اور ہیروئن کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُن کی فلم میں سچ مچ ایک ہندوستانی ماں کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔"

چاؤلی اپنے جھونپڑے میں گئی۔ بچہ جھنگا چارپائی پر اکیلا لیٹا رو رہا تھا۔ چاؤلی نے بیٹے کو گود میں لے لیا۔ بدن جل رہا تھا۔ روئے ہی جا رہا تھا۔ چاؤلی نے بھینچ کر بچے کو پیار کیا۔ "نا رو میرے لال۔ چل میں تجھے فلم کمپنی میں لے چلتی ہوں۔ میرا بیٹا فلم کا ہیرو بنے گا۔ پھر تجھے بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤنگی۔"

"نا رو میرے لال۔۔۔۔ نہ رو۔" یہ کہہ کر اس نے پانی میں گھلی ہوئی کالی کالی دوا بچے کو چٹا دی۔ بچہ روتے روتے ہلکان ہو کر اب ہچکیاں لینے لگا تھا۔ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہو کر سو گیا۔ چاؤلی نے بچے کو چند چیتھڑوں میں لپیٹا اور سٹوڈیو کی طرف چل دی۔

اکسٹرا اسپلائر نے کہا۔ "روئے گا تو نہیں؟"

چاؤلی نے کہا۔ "نہیں بابو جی مجے سے سو رہا ہے۔

ڈائرکٹر نے پوچھا۔ "اے یہ روئے گا تو نہیں؟"

پروڈکشن مینجر نے کہا "نہیں صاحب۔ بڑا شریف بچہ ہے۔ ماں کا دودھ پی کر مزے سے سو رہا ہے آپ جتنے چاہیں شاٹ لیجئے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لینے سے پہلے پوچھا۔ "روئے گا تو نہیں؟"

"نہیں کمار جی۔" ڈائرکٹر نے اُسے یقین دلایا۔ بڑا خاموش بچہ تلاش کر کے منگوایا ہے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لے لیا اور سوچا۔ "شکر ہے اس کا وزن زیادہ نہیں ہے۔" پھر وہ بولا۔ "جلدی شاٹ لے لو۔ ابھی تو سو رہا ہے اُٹھ گیا تو یہ بھی ناک میں دم کرے گا۔"

"ریڈی فار ٹیک۔"

"ریڈی فار ٹیک۔"

"آل لائٹس۔"

"ساؤنڈ ریڈی؟"

"سٹارٹ ساؤنڈ۔"

"کیمرہ۔"

"رننگ۔ کلیپ"

ماں کا دل۔ سین نمبر ۵۵ پچپن۔ ساٹ نمبر سیون۔ ٹیک نمبر فور۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے کو دیکھا۔ بچہ اطمینان سے آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ اُس کے معصوم چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ہیرو نے کیمرہ کی طرف دیکھ کر دل کی گہرائی سے آواز نکالی۔ "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

شاٹ کٹ ہو گیا۔ مگر کیمرہ مین نے کہا ایک ٹیک اور چاہیئے۔ بچے کے چہرے پر روشنی ٹھیک نہیں

بھیجتی۔ یہی دو چار لوگ ہیں جو اپنے بچوں کا دھندا کرتے ہیں۔"

"ارے بھئی پیسوں کی خاطر کوئی بھی اپنے بچے کا دھندا کر سکتا ہے۔"

یہ بات کرتے کرتے وہ سٹوڈیو کے باہر نکل آئے تھے۔ جہاں ایک بھنگن سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔

"اری ذرا ٹھہر۔" پروڈکشن مینیجر چلّایا۔ "سارے میں مٹی اُڑا رہی ہے۔ یہ وقت ہے جھاڑو دینے کا۔ صبح سویرے کیوں نہیں جھاڑو دی۔"

"بابو جی۔ آج مجھے دیر ہو گئی تھی۔"

"دیر ہو گئی تھی تو پگھار کٹے گی۔ کوئی مفت کام کرتی ہے کیا؟"

"بابو جی۔" بھنگن کام بند کر کے گڑگڑاتی ہوئی بولی۔ "میرا بچہ بیمار ہے۔"

"بیمار ہے۔ کیا بیمار ہے؟"

"بابو جی۔ پتہ نہیں کیا بیمار ہے۔ دس دن سے بُکھار نہیں اُترا۔"

"تو پھر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتی؟"

"محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا، بابو جی۔ دو روپے فیس بھی دی تھی۔ وہ کہیں اِسے بچوں والے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اُن کی فیس بیس روپے ہے۔ پھر دوا انجکشن کے لئے بھی دام چاہئیں۔ اگلے مہینے کی پگھار رِل جاتی ـــــ تو بچے کا اِلاج ہو جاتا۔"

"جا، بچے کو لے آ۔ اس کے علاج کے لئے روپے رِل جائیں گے۔ پورے چالیس۔" ایکسٹرا سپلائر نے پروڈکشن مینیجر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

پروڈکشن مینیجر بولا "اری تیرے بچے کا فلم میں فوٹو آ جائے گا کمار جی کے ساتھ اور پیسے بھی ملیں گے جلدی سے لے آ۔"

"ابھی لاتی ہوں، بابو جی . . . . ." بھنگن نے جھاڑو ٹوکری پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر سن، بچہ روئے گا چلّائے گا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ چُپ چاپ رہنا چاہئے۔"

بھنگن سٹوڈیو کے پیچھے ہی ایک جھونپڑیوں کی بستی میں رہتی تھی۔ اپنی جھونپڑی میں جانے سے پہلے اس نے پڑوسن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کیا ہے چاؤلی؟"

"بچہ بہت روتا ہے بہن۔ مجھے کام پر جانا ہے۔ وہ دوا دے دو جو تم کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو دیتی ہو۔"

پڑوسن نے ایک پُڑیا پکڑا دی۔ "بس تھوڑی سی پانی میں گھول کر دیجیو۔"

مختلف آوازیں سٹوڈیو میں گونجیں "ریڈی فار ٹیک۔ آل لائٹس۔ میک اپ ہیر ڈریسر۔ ساؤنڈ لسٹ"۔

ہیرو نے کہا۔ "ٹھہرو بھائی۔ پہلے میں اس پہلوان کو اٹھا کر دیکھتا ہوں۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھا لیا ــــ لیکن بچہ پتھر کا بنا ہوا تھا۔ ہیرو ہانپنے لگا۔

"ساؤنڈ اسٹارٹ" ڈائرکٹر نے آواز دی۔

"کیمرہ" ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی آواز آئی۔

"رننگ!" (RUNNING) کیمرہ مین نے اعلان کیا۔

ہیرو نے بچے کی طرف پیار بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بچے نے آنکھ ماری۔ ہیرو کی زبان سے نکلا۔

"یہ بچہ بھی۔۔۔۔ یہ بچہ بھی۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے بجائے بچہ بولا۔ "کیوں بیٹا ڈائلاگ بھول گئے نا؟"

ہیرو کو ایسا لگا جیسے اس کی گود میں آدمی کا بچہ نہ ہو کسی راکشس کا بچہ ہو اور اس نے "کٹ اِٹ" کہہ کر بچے کو اس کے باپ کی طرف پھینکا۔

اور سو پہلوان صاحب بھی دس دس روپے کے چھ نوٹ جیب میں ڈال کر بچے کا ہاتھ پکڑے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تیسرا بچہ لایا گیا۔ اس نے شاٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ہیرو کے سوٹ پر پیشاب کر دیا ــــ ہیرو نے کہا میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔"

چوتھا بچہ لایا گیا۔ یہ دیکھنے میں بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ سب کو یقین تھا۔ اب شاٹ بخیر و خوبی ہو جائے گا لیکن جیسے ہی ہیرو نے اُسے گود میں لیا، بچہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بچے کو ماں کی گود میں واپس دیا گیا تو فوراً چپ ہو گیا۔ دوبارہ ہیرو کی گود میں دیا تو چپکے سے چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی کیمرہ چلنا شروع ہوا اور ہیرو نے ڈائلاگ بولا۔ "یہ بچہ بھی۔۔۔۔۔" کہ بچے نے نہ صرف رونا شروع کر دیا بلکہ اپنے ننھے سے پاؤں سے اتنے زور کی لات ماری کہ ہیرو کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی ــــ ہیرو نے فیصلہ سنا دیا۔

"میں اس بچے کے ساتھ بھی کام نہیں کروں گا۔ یا تو کوئی سیدھا سادا چُپ چاپ بچہ لاؤ۔ نہیں تو سین کینسل کرو۔ گھنٹہ بھر میں شوٹنگ شفٹ بھی ختم ہونے والی ہے۔"

سپلائر نے کہا۔ "اب میں کب تک بچے لاتا رہوں۔ اس طرح تو ساری بمبئی کے بچے ختم ہو جائیں گے۔"

پروڈکشن مینجر نے کہا۔ "بچے کیا؟ تیری تو چاندی ہو رہی ہے۔۔۔۔"

"اور تمہاری نہیں؟" سپلائر نے چڑ کر کہا۔

"اچھا بھئی ہم دونوں کی۔ اب ایک چپ چاپ سا بچہ لے آ کہیں سے۔"

"میں تو جتنے فلمی بچوں کو جانتا ہوں سب کو لے آیا۔ ہر ماں اپنے بچے کو فلم میں کام کرتے ہیں

"بچہ بھی حاضر ہے، سرکار" یہ کہہ کر پہلوان نما آدمی نے بچے کو آگے کر دیا۔

"اسے ڈائرکٹر صاحب کو سلام کرو۔"

بچہ ہرے رنگ کی مخمل کا نیکر اور بش شرٹ پہنے تھا۔ ہاتھ میں ایک جھنجھنا لیے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو چھوٹے قد کا بنا دیا ہو۔ باپ کا حکم سنتے ہی اس نے بھی ایک فوجی سلام کیا اور ماتھے سے ہاتھ نہ ہٹایا جب تک باپ نے اگلا حکم نہ سنایا۔

"ابھی صاحب کو ٹوسٹ کر کے بتاؤ بیٹا"

اور وہ بچہ جس کا چہرہ بچوں جیسا نہیں تھا۔ دفعتاً ٹوسٹ کرنے لگا جیسے وہ چابی والی گڑیا ہو۔

"شاباش بیٹا۔ شاباش" باپ ٹوسٹ کی لے پر تالیاں بجاتا ہوا بولا۔ بچہ تھرک رہا تھا۔ اپنے کولہے مٹکا رہا تھا۔ کبھی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی پیچھے ہٹتا تھا۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔

آہستہ آہستہ سیٹ پر جتنے لوگ جمع تھے وہ بچے کا ٹوسٹ ڈانس دیکھنے لگے۔ کیمرہ مین۔ اس کے اسسٹنٹ۔ لائٹوں والے چھوٹے موٹے کیرکٹر ایکٹر۔ اکسٹرا۔

تب پروڈیوسر نے ڈائرکٹر کے کان میں کہا "یہ سب بند کرو۔ کمار جی کو دن بھر کی شوٹنگ کا دس ہزار دینا ہے اور شاٹ اب تک ایک نہیں ہوا۔"

ڈائرکٹر نے چلا کر کہا۔ "کٹ اِٹ۔"

ٹوسٹ ڈانس کرتے کرتے بچہ ایک دم رُک گیا جیسے اس کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

ڈائرکٹر نے پہلے اسسٹنٹ کو حکم دیا "کمار جی کو بلاؤ۔"

پہلے اسسٹنٹ نے دوسرے اسسٹنٹ کو حکم دیا "کمار جی سے کہو بچہ آگیا ہے۔ شاٹ تیار ہے۔"

تیسرا اسسٹنٹ میک اپ روم کی طرف بھاگا۔

ہیرو نے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "بچہ کہاں ہے؟"

ہری رنگ کی نیکر والے بچے نے ہیرو کو فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ، ہاؤ ڈو یو ڈو؟" اور یہ کہہ کر ہیرو کی طرف دیکھ کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ ہیرو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ہیرو نے بچے سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں پہلوان کام کرو گے؟ گھبراؤ گے تو نہیں۔"

بچے نے تتلاتے ہوئے جواب دیا "گھبلائیں گے تو آپ؟" اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہیرو نے کھسیانا ہو کر پوچھا۔ "کیا اس آفت کے پرکالے کو مجھے گود میں اٹھانا ہوگا؟"

کیمرہ مین چلایا۔ "ریڈی فار ٹیک!"

کمار غصے میں سیدھا سٹوڈیو کے باہر جا چکا تھا اور اب اُس کے پرائیوٹ میک اَپ روم میں ہیرڈریسر دوبارہ اُس کی "وِگ" کو فٹ کر رہی تھی۔

"اس بار میں چار ہیر کلپ لگا دیتی ہوں تاکہ کھینچنے پر بھی وِگ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

مگر کمار نے غصے سے کہا "میں اُس بچے کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔"

جب دوبارہ وِگ لگوا کر ہیرو واپس سٹوڈیو میں پہنچا تو ڈائرکٹر بے بی کی ممی سے کہہ رہا تھا۔ "سوری میم صاحب۔ آپ کے بچے کو اب چھٹی۔ آگے کسی سین میں ہم ضرور اس کے لئے کوئی کام نکالیں گے۔"

"دیٹس آل رائٹ (THATS ALL RIGHT) میم صاحب بولیں۔" ہم کو مالوم ہے شوٹنگ میں ایسا گول مال ہو جاتا ہے۔ اپنے مینجر کو بولو ہمارا چکتا کر دو۔"

پروڈکشن مینجر نے اکسٹرا سپلائر کو ساٹھ روپے دے کر بہتر روپے کی رسید لی۔ سپلائر نے میم صاحب کو چالیس روپے دے کر پچپن کی رسید لی۔ میم صاحب بچے کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہی تھیں کہ بے بی نے ایک اور چھپٹا مارا اور اپنی ماں کے سر سے اس کی "وِگ" بھی کھینچ لی۔ میم صاحب نے جلدی سے اپنے نقلی بالوں کو دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا اور جب اطمینان ہو گیا تو بولیں "یو ناٹی بے بی۔ ڈرائیور ہم کو دادر سٹیشن چھوڑ دینا۔ اُدھر سے ہم بائیکلہ ٹرین میں جائے گا۔"

سٹوڈیو میں پھر ہنگامہ تھا۔

ڈائرکٹر پہلے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پہلا اسسٹنٹ پروڈکشن مینجر سے کہہ رہا تھا "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پروڈکشن مینجر نے اکسٹرا سپلائر کو کونے میں لے جا کر کہا "آج تو تیری چاندی ہو رہی ہے۔ ایک بچہ اور لے آ۔ جتنا شریر ہو اچھا ہے۔ ایک دو اور بچوں کا بھی انتظام کر رکھنا۔"

اکسٹرا سپلائر پروڈیوسر کی موٹر لے کر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک تین چار برس کا موٹا تازہ بچہ لے کر آ گیا۔ ساتھ میں ایک کالا سا موٹا سا لمبے لمبے بالوں والا پہلوان نما آدمی۔ دھاریوں والی بنیان اور چار خانے کا تہمد باندھے۔

"ہم حاضر ہیں جی۔" پہلوان نما آدمی نے ڈائرکٹر کو ایک فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"آپ نے نہیں پہچانا۔ میں ماسٹر گگل ہوں۔ انڈسٹری کا پرانا آدمی ہوں۔ شہزادہ گلفام میں و [illegible] باغی شہزادی میں سائڈ ہیرو تھا۔ لال گھوڑا میں سائڈ ولین۔ اب بھی کیرکٹر کر لیتا ہوں

ہم [illegible]

[illegible] س وقت صرف ایک بچے کی ضرورت ہے۔"

ڈال کر کہا "ہمارا بے بی سویٹ ہے نا؟ بڑا ہو کر یہ بھی فلم کا ہیرو بنے گا۔"

کیمرہ مین نے ایک لائٹ کو بائیں سے ذرا دائیں سرکایا پھر واپس بائیں کو سرکا کر اسی جگہ رکھ دیا پھر کیمرہ کی آنکھ میں جھانک کر دیکھا۔ "کمار صاحب ذرا آگے...... بس بس بس...... بالکل ٹھیک ہے۔" اور پھر چلا کر۔ "ریڈی فار ساؤنڈ ٹسٹ۔"

ساؤنڈ اسسٹنٹ نے مائکروفون آگے بڑھایا۔ "کمار صاحب۔ ڈائلاگ بولئے گا ایک بار۔"

ہیرو نے مائیکروفون کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھا اور کہا۔ "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

"ہاوز یٹ؟" تینوں اسسٹنٹ ایک ساتھ چلاتے جیسے کرکٹ کے میدان میں کسی کھلاڑی کو (L.B.W) کرنے کے لئے سب فیلڈرز چلا کر امپائر سے پوچھتے ہیں۔ "ہاوز دیٹ"

ساونڈ روم سے لاوڈ سپیکر کے ذریعے جواب آیا۔ "اوکے۔ ریڈی فار ٹیک۔"

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔ "خاموش۔"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔ "سائلنس!"

تیسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا "بات چیت بند۔"

ڈائرکٹر نے کہا۔ "ساؤنڈ سٹارٹ۔"

ساؤنڈ روم سے جواب آیا "کیمرہ"

کیمرہ مین نے بٹن دبا کر کہا۔ "رننگ" (RUNNING)

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ پھر کیمرے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر بولا —— "یہ بچہ بھی کسی ...."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بچے نے ہیرو کے ماتھے پر گری بالوں کی لٹ پر ایک جھپٹا مارا اور وِگ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ ہیرو کی گنجی چندیا سٹوڈیو لائٹس کی روشنی میں چمک اٹھی۔

ڈائرکٹر گھبرا کر چلایا "کٹ! کٹ!"

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔ "کٹ اِپ!"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔ "کٹ اِپ!"

تیسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔ "میک اَپ۔ ہیر ڈریسر کو بلاؤ۔"

تین نوجوان کالج کی لڑکیاں جو کمار کی "فین" (FAN) تھیں اور خاص طور سے اُس کی شوٹنگ دیکھنے آئی تھیں یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئیں کہ اُن کے محبوب ایکٹر کے سر کی چندیا بالکل صاف تھی —— اور انڈے کی طرح سفید۔

"ہائے رام"! ایک نے دوسری سے کہا۔ "یہ تو گنجا ہے!"

دوسری نے "ش ش ش" کر کے کہا "آہستہ بولو کہیں سن نہ لیں۔"

"بچہ لاؤ" پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی آواز گونجی۔

"بچہ لاؤ" دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔

"بچہ لاؤ" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے آواز دی۔

"سپلائر!" پروڈکشن مینجر نے نعرہ لگایا "بچہ کہاں ہے؟"

"مسز جانسن!" اکسٹرا سپلائر چلایا۔

ایک موٹی تازی اینگلو انڈین عورت جو نہ جوان تھی، نہ بوڑھی آگے بڑھی۔ اس کی گود میں ایک بھورے بالوں والا گول گول چہرے گول گول آنکھوں والا بچہ تھا جو نائلون کا فراک پہنے ہوئے تھا۔

"اس کا فراک تو بہت بڑھیا لگتا ہے۔ غریب بچے کا فراک ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے اعتراض کیا۔ "ستیہ جیت رے کی فلموں میں دیکھئے کتنی ریالزم (REALISM) ہوتی ہے۔"

"ڈریس مین!" دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔

"جی صاحب" ڈریس مین نے جواب دیا۔

"بچے کا فراک بدلی کرو۔ کوئی میلا پھٹا ہوا کپڑا پہناؤ۔" پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے حکم دیا۔

ڈریس مین نے ایک بکسے میں ہاتھ ڈالا اور چند میلے گندے چیتھڑے لئے ہوئے بچے کی طرف بڑھا۔ بچے کی ماں نے جیسے ہی ان گندے چیتھڑوں کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "نو۔ نو۔ ہمارا بے بی ایسا ڈرٹی کپڑا نہیں پہنے گا۔ کوئی بیماری لگ گئی تو....."

"مگر میم صاحب دیکھئے ریالزم (—— REALISM ——) کے لئے ضروری ہے —" تیسرے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کہنا شروع کیا۔

بچے کی ماں بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "ہمارا بے بی اونلی ہائی کلاس پکچرز میں کام کرتا ہے۔ ہم سپلائر کو پہلے ہی بولا تھا ہمارا بے بی گندا کپڑا نہیں پہنے گا۔"

ڈائرکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا "رہنے دو۔ آج کل غریبوں کے بچے بھی نائلون کے کپڑے پہنتے ہیں۔"

کیمرے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیرو نے میم صاحب کی گود کی طرف ہاتھ پھیلاتے۔ "کم آن بے بی۔" بچہ ہمک کر ہیرو کی گود میں چلا گیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ فلمی دنیا کا محاورہ ہے کہ شوٹنگ کرتے وقت تین مصیبتیں آ سکتی ہیں۔ گھوڑا، کتا، اور بچہ۔"

میم صاحب نے اپنے بھورے گھنے بالوں کو تھپکی دیتے ہوئے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں

"سین کون سا ہے؟"

"جی یہ وہ بچے والا سین ہے۔"

"بچے والا سین؟ مگر اس فلم میں تو میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ بچہ کیسے ہوگیا؟"

"جی نہیں یہ آپ کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ راستہ چلتے آپ کو ایک لاوارث بچہ مل جاتا ہے۔ بچے کو دیکھ کر آپ کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے، اپنی ماں یاد آجاتی ہے، آپ بچے کو گود میں اٹھا لیتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو جاتے ہیں اور آپ بولتے ہیں۔۔۔۔۔"

"ہاں تو ڈائیلاگ سناؤ۔" اور یہ کہہ ہیرو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈائیلاگ ڈائرکٹر نے فوراً فائل کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھ کا نور ہے۔۔۔۔"

ہیرو نے پوچھا۔ "نور؟ نور کیا ہوتا ہے؟"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے پنسل سے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی۔ نور۔ نور تو بس نور ہوتا ہے۔ جیسے نور محمد، نور الحسن وغیرہ۔ دراصل رائٹر نے نور کا قافیہ سرور سے ملایا ہے۔"

"پورا ڈائلاگ پڑھو۔"

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھوں کا نور ہے، کسی کے دل کا سرور ہے، اگر آج یہ بھوکا ہے، مجبور ہے تو یہ سماج کا قصور ہے۔ کل یہی بچہ بڑا ہو کر ڈاکٹر، وکیل یا پلیڈر بن سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔"

"یہ سب کیا بکواس ہے؟" ہیرو نے کہا اور پھر ڈائرکٹر کی طرف مخاطب ہو کر "اتنا بڑا ڈائلاگ مجھے یاد بھی نہیں ہوگا۔"

ڈائرکٹر نے کہا۔ "مجھے بھی ڈائلاگ ضرورت سے زیادہ لمبا لگتا ہے۔" اور پھر ڈائلاگ ڈائرکٹر سے: "کمار صاحب جیسا کہتے ہیں اسے چھوٹا کر دو۔"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے ڈائلاگ کے پورے صفحے پر نیلی پنسل سے کاٹنے کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ "کمار صاحب آپ ہی بتائیے نا۔"

ہیرو نے سوچ کر کہا۔ "تو لکھو۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔۔۔۔۔۔"

"جی؟ آگے؟"

"بس اور کچھ نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے۔ "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔ واہ واہ کیا بات کہی ہے۔ کمار صاحب آپ کو تو رائٹر ہونا چاہئے تھا۔" اور پھر ڈائرکٹر سے مخاطب ہو کر "سر یہ تو پکچر کا تھیم ڈائلاگ ہوگیا۔"

"تو پھر چلئے شاٹ تیار ہے۔" ڈائرکٹر نے ہیرو کو اشارہ کیا اور جیسے ہی ہیرو اپنی کرسی سے اٹھا اور سب بھی کھڑے ہو گئے۔

ماں کا دِل

ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

سٹوڈیو میں حسبِ معمول ہنگامہ تھا۔ ہیرو کے سر پر نقلی بالوں کی ''وگ'' بٹھائی جا رہی تھی — ہیروئن بار بار آئینہ میں اپنی لپ سٹک کا معائنہ کر رہی تھی۔ ڈائریکٹر کبھی ڈائیلاگ رائٹر سے اُلجھ رہا تھا کبھی کیمرہ مین سے۔ پروڈکشن مینجر اکسٹرا اسپلائر سے ایک کونے میں اپنی کمیشن طے کر رہا تھا۔

کیمرہ مین کے اسسٹنٹ نے روشنیوں کے کالے شیشے میں سے دیکھ کر کیمرہ مین سے کہا۔ "شاٹ ریڈی۔" کیمرہ مین نے اپنے کالے شیشے میں سے سین کا معائنہ کر کے ڈائرکٹر سے چلا کر کہا "شاٹ ریڈی"

ڈائرکٹر نے ہیرو کی کرسی کے پاس جا کر دھیرے سے کہا۔ "شاٹ ریڈی۔"

ہیرو نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر دو آئینوں میں اپنے سر کو آگے پیچھے سے دیکھا۔ وگ کو دو تین بار تھپ تھپایا۔ نقلی بالوں کی ایک لٹ کو ماتھے پر گرایا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی طرف دیکھ کر (جو ڈائلاگ کا فائل لئے کھڑا تھا) ہیرو نے پوچھا۔ "پکچر کون سی ہے؟"

"ماں کا دِل۔"

ٹوپی میں سے خرگوش نکالتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک لوتھڑا۔ مگر بے جان ـــ کوئی حرکت نہیں، کوئی آواز نہیں۔ ماں کی آنکھیں بھی بند۔ شاید وہ بھی مرگئی اور پھر ڈاکٹر نے اس گوشت کے لوتھڑے کو زور سے ایک تھپیڑ مارا اور جھونپڑے میں ایک ننھی سی آواز نے اپنی زندگی کا اعلان کیا۔ مری ہوئی ماں کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ خوشی سے چمک اٹھیں ـــ ڈاکٹر سے اس ننھے سے زندہ پتلے کو لے کر اس نے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

سلمہ نے اپنے گال پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔

"مر مر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے۔" وہ آنسوؤں کو پیتے ہوئے بولی "جھنیا کے بابو سچ کہیں تھے۔"

"ازھے بابا؟" مچھرن نے مرہٹی میں سوال کیا۔

وہ پوچھتی ہے کہ اس کے بابا کا کیا ذکر ہے" انور نے ترجمہ کیا۔

اور اب سلمہ نے زمین پر بیٹھتے ہوئے مچھرن کا سیاہ مگر چکنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہاتھ لے کر پوچھا ـــ

"بہن! تمہارا نام کیا ہے؟"

"ازھا نام؟" اس نے دہرایا اور سلمہ نے دوستی محبت اور تشکر کی ایک گرم اور نرم لہر کو اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں دوڑتے ہوئے محسوس کیا اور اسے ایسے لگا جیسے اپنے بچپن سے اس کا بیس برس پہلے کا ٹوٹا ہوا رشتہ آج پھر سے قائم ہو گیا ہے۔ پھر مچھرن بولی "ماز ھا نام۔ جھنیا ـــ"

"سمندر سے تمہاری دوستی جو کہانی تھی؟"

"اور جو میں سچ مچ ڈوب جاتی؟"

"جس پانی میں تم ڈوبنے والی تھیں وہ صرف چار فٹ گہرا ہے اور تمہارا قد ساڑھے پانچ فٹ ہے۔"

●

تم بڑے فراڈ ہو۔"

"بڑا فراڈ تو فرائیڈ ہے۔"

"اور یہ مچھیرن کی زچگی کا بہانہ؟ یہ سب بھی فرضی تھا؟ تمہارا تو ڈاکٹری بیگ بھی ڈوب گیا۔"

"وہ تو خالی تھا ـــــ اصل بیگ لے کر میرا اسسٹنٹ پہلے ہی یہاں آچکا ہے۔"

●

مچھیرن کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔ جیسے وہ مر رہی ہو۔

سلمہ باہر کھڑی دروازے کی ریخ میں سے جھانک رہی تھی اور خوف سے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔

"سلمہ اندر آجاؤ۔"

اور پھر انور نے مراٹھی میں مچھیرن سے کچھ کہا۔

بیس برس سے جس دروازے کے باہر وہ بچی کھڑی تھی، اُسے کھول کر آج وہ اس کے اندر چلی گئی۔

●

مچھیرن پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب سے گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ مگر سلمہ کو دیکھ کر اپنی تکلیف کے باوجود وہ مسکرادی اور اندھیرے جھونپڑے میں اُس کے دانت ایسے چمکے جیسے سمندر کی تہ میں سیپ۔ مچھیرن نے مراٹھی میں کچھ کہا۔

انور نے ترجمہ کیا۔

وہ کہہ رہی ہے ـــــ "بہن بھگوان کرے یہ دن تمہیں بھی جلدی نصیب ہو۔"

●

اور مچھیرن پھر اپنے حیات آفریں کرب میں مُبتلا ہو گئی۔ پسینہ، خون اور پھر جیسے مدادی

میرے سائیکوانالیسس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا۔"

اور پھر لہروں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور وہ ٹاپو کے ساحل پر پایاب پانی میں کھڑی ہوئی اپنے بھیگے ہوئے، تھکے ہوئے، چوٹ کھاتے ہوئے بدن میں ایک نئی طاقت ایک نئی تازگی محسوس کر رہی تھی۔ سامنے سرسبز ٹاپو تھا۔ ناریل کے کمان کی طرح بَل کھاتے ہوئے پیڑ تھے۔ ساحل پر مچھیروں کے جال سُوکھ رہے تھے اور دُور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔

"دنیا کتنی خوبصورت ہے"۔ اس نے سوچا۔ "آج سے پہلے تو مجھے کبھی اتنی خوبصورت نہ لگی تھی۔"

پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سمندر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پر لہریں دوڑ بھاگ کر رہی تھیں جیسے باپ کے سینے پر بچے کھیلتے ہیں۔ کیا یہی وہ سمندر ہے جس سے وہ کبھی ڈرتی تھی! مگر اسے اس کی کوئی وجہ یاد نہ آئی۔

زمین خوبصورت تھی۔ آسمان اور آسمان پر بکھرے ہوئے بادل خوبصورت تھے، نیلا سمندر خوبصورت تھا۔ حسن کے اس پھیلاؤ میں بس ایک ہی کمی تھی۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

"انور ـــــ!"

ہائے اس ظالم نے مجھے ڈبونے کی کوشش میں کہیں خود تو جان نہیں دیدی؟

اور اسی دم سامنے سے آتی ہوئی ایک لہر ٹوٹی اور اس میں سے ایک گھنے سیاہ بالوں والا سر نکلا اور دو چوڑے چکلے شانے نکلے اور ایک لمبا تڑنگا جسم نکلا۔

"ہائے اللہ! یہ سمندر کتنا اچھا ہے کہ اس میں سے آج میرے انور نے جنم لیا ہے!"

"انور ڈارلنگ!"

اور وہ بھاگ کر اس سے چپٹ گئی۔

"تو تم میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے؟ اور میں سمجھی تم مجھے ڈوبنے کے لئے چھوڑ کر چل دیئے۔"

"ارے، تم تو رو رہی ہو۔۔؟"

"خوشی کے مارے۔"

"تم سچ مچ بچی ہو۔"

"اب تم مجھے جو چاہے کہو۔ میں بچی کہلانے سے نہیں چڑتی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اب میں بچی نہیں رہی۔ آج میں جوان ہوگئی ہوں۔ اچھا ہی ہوا وہ کشتی ڈوب گئی۔"

"اُسے تو ڈوبنا ہی تھا۔ پورے ڈیڑھ سو روپے دیئے ہیں۔"

"تو تم نے جان بوجھ کر یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا؟"

سب بھید بتا دیتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس ٹاپو پر ایک مچھیرن کا بچہ جنوانے جا رہا ہے۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے، پھر بھی وہ جا رہا ہے کیونکہ اس وقت ہسپتال میں کوئی دوسرا ڈاکٹر موجود نہیں ہے ــــ میرا شوہر بہت بڑا آدمی ــ"

نہیں۔ نہیں۔ میرا شوہر بہت بُرا آدمی ہے۔ وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اور کیا۔ مگر میں اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔"

اور یہ سوچ کر اس نے اتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارے کہ سمندر کی سطح سے باہر نکل آئی ــــــ سامنے ہی ٹاپو کی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔

سامنے سے ایک لہر آئی اور اتنے زور سے اس سے ٹکرائی کہ ایک لمحہ کے لئے سلمہ چکرا گئی۔

مگر اگلے لمحے ہی وہ سوچ رہی تھی۔

"وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ مہاوت کا بیٹا ہے تو ہوا کرے۔ میرے باپ سر عظیم اللہ بھی تو کبھی معمولی وکیل تھے اور ان کے باپ سلیم اللہ اودھ کے لیفٹننٹ گورنر کے منشی تھے اور اُن کے باپ نعیم اللہ واجد علی شاہ کا حُقّہ بھرا کرتے تھے، تو اس میں شیخی کی بات کون سی ہے؟"

اور اس بار جو ایک لہر جبڑا کھولے اس کی طرف بڑھی تو اس نے عین وقت پر ڈبکی لگا دی اور لہر اُس کے اُوپر سے گزر گئی۔

"ہونہہ!" اس نے سوچا "یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی لوگ کو کھانا مانگتا ہے۔ ابے انگریز کے بچے۔ جا اپنے بابا لوگ کو ڈرا۔ چلا ہے مجھے ڈرانے!"

اور اگلی لہر جو مس میری کی طرح موٹی تازی تھی، جھومتی جھامتی اُس کی طرف آئی تو ایسے ایسا لگا، جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو۔

"اِدھر کہاں جا رہی ہو، بے بی۔ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں تم اُدھر لندن میں فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔"

مگر سلمہ اس لہر کے جبڑوں میں سے یہ سوچتی ہوئی صاف نکل گئی ــ

"ٹاٹا مس صاحب۔ مگر میں تو اب گھر جاؤں گی، اور جُگنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

اور پھر ایک اور لہر آئی۔ اس کیمبرج والے سائیکاٹرسٹ جارج رُسل کی طرح دھیمی چال چلتی ہوئی۔

"سلمہ ڈارلنگ! یو آر ریپرسڈ۔ ڈیٹ از وہاٹ یو آر!" تم قدرت کی گنہ گار ہو کیونکہ تم جنسی، اخلاط سے ڈرتی ہو۔"

اس لہر کے اُوپر سے تو وہ ایسی آسانی سے گزر گئی جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"جاؤ جاؤ جیورجی لوا تے۔ پہلے اپنے دانتوں کے پائیریا کا علاج کروا کے آؤ۔ پھر ذرا افور سے

لگا اور پھر ایک اونچی سی لہر آئی اور وہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

بچی لہروں کو گن رہی تھی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی موٹی کوئی پتلی۔ کوئی رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی چنگھاڑتی ہوئی اور کوئی دہاڑتی ہوئی اور پھر ان سب لہروں کی ایک نانی اماں آئی اور اس کے ساتھ سمندر سچ مچ کشتی میں آ گیا اور بیس برس کے بعد بھی آج پھر بھوکی لہروں کے بھیانک جبڑوں میں جا پڑی۔

دور کہیں سے ایک آواز گونجی۔

"یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا۔"

"چھوٹا بے بی!

نمکین پانی چکھتے ہوئے بچی اندھیرے کنوئیں کی تہ کی طرف جا رہی تھی، کہ اس کے شعور میں کوئی چیز یکایک بیدار ہو گئی۔ جیسے سویا ہوا شیر جاگ اٹھتا ہے، غراتا ہوا۔

تو یہ لہریں چھوٹے چھوٹے بے بی کھاتی ہیں مگر میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔ بندر کی طرح لال منھ والے صاحب، کان کھول کر سن لو۔ میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔"

اور اسی وقت اس کے دونوں ہاتھوں نے اس لال منھ والے صاحب کو اس زور سے دھکا دیا کہ نیچے جانے کی بجائے وہ اوپر کی طرف اٹھنے لگی۔

پھر اس کے شعور میں قریب ہی سے ایک جانی پہچانی پیار بھری آواز نے چڑایا۔

"تم سچ مچ بچی ہو، بچی ہو۔ بچی ہو۔"

"میں بچی نہیں ہوں"

سمندر کی تہ سے اوپر اٹھتے ہوتے اس کا دل دھڑکتا ہوا چلایا۔

"میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں ڈگری لی ہے۔۔۔ میں نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ میں نے ماضی اور مستقبل، ہر دروازے اور تہذیب و تمدن کے ہر دریچے میں جھانک کر دیکھا ہے۔"

مگر ایک آواز جو انور کی سی آواز تھی، اسے چڑائے جا رہی تھی ۔۔۔

◆

مگر تم نے اپنے اصطبل کے دروازے میں سے جھانک کر نہیں دیکھا کہ گھوڑی کے بچہ کیسے ہوتا ہے؟"

"وہ سب بھی مجھے معلوم ہے۔ جانتے ہو میرا شوہر کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھے زندگی کے

سب بھید بتا دیتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس ٹاپو پر ایک مچھیرن کا بچہ جنوانے جا رہا ہے۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے، پھر بھی وہ جا رہا ہے کیونکہ اس وقت ہسپتال میں کوئی دوسرا ڈاکٹر موجود نہیں ہے ——— میرا شوہر بہت بڑا آدمی ——"

نہیں۔ نہیں۔ میرا شوہر بہت بُرا آدمی ہے۔ وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اور کیا۔ مگر میں اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔"

اور یہ سوچ کر اس نے اتنے زور سے ہاتھ پاؤں مارے کہ سمندر کی سطح سے باہر نکل آئی ——— سامنے ہی ٹاپو کی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔

سامنے سے ایک لہر آئی اور اتنے زور سے اس سے ٹکرائی کہ ایک لمحہ کے لئے سلمہ چکرا گئی۔

مگر اگلے لمحے ہی وہ سوچ رہی تھی۔

"وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ مہاوت کا بیٹا ہے تو ہوا کرے۔ میرے باپ سر عظیم اللہ بھی تو کبھی معمولی وکیل تھے اور ان کے باپ سلیم اللہ اودھ کے لیفٹنٹ گورنر کے منشی تھے اور اُن کے باپ نعیم اللہ واجد علی شاہ کا حُقّہ بھرا کرتے تھے، تو اس میں شیخی کی بات کون سی ہے؟"

اور اس بار جو ایک لہر جبڑا کھولے اس کی طرف بڑھی تو اس نے عین وقت پر ڈبکی لگا دی اور لہر اُس کے اُوپر سے گزر گئی۔

"ہونہہ!" اس نے سوچا "یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی لوگ کو کھانا مانگتا ہے۔ ابے انگریز کے بچے۔ جا اپنے بابا لوگ کو ڈرا۔ چلا ہے مجھے ڈرانے!"

اور اگلی لہر جو مس میری کی طرح موٹی تازی تھی، جھومتی جھامتی اُس کی طرف آئی تو ایسے ایسا لگا، جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو۔

"اِدھر کہاں جا رہی ہو، بے بی۔ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں تم اُدھر لندن میں فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔"

مگر سلمہ اس لہر کے جبڑوں میں سے یہ سوچتی ہوئی صاف نکل گئی ——

"ٹاٹا مس صاحب۔ مگر میں تو اب گھر جاؤں گی، اور جھُنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

اور پھر ایک اور لہر آئی۔ اس کیمبرج والے سائیکا ٹرسٹ جارج رُسل کی طرح دھیمی چال چلتی ہوئی۔

"سلمہ ڈارلنگ! یو آر ریپرسڈ۔ دیٹ از وہاٹ یو آر!" تم قدرت کی گنہگار ہو کیونکہ تم جنسی اخلاط سے ڈرتی ہو۔"

اس لہر کے اُوپر سے تو وہ ایسی آسانی سے گزر گئی جیسے اس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

"جاؤ جاؤ جیورجی لوائے۔ پہلے اپنے دانتوں کے پائیریا کا علاج کروا کے آؤ۔ پھر ذرا اقد سے

لگا اور پھر ایک اونچی سی لہر آئی اور وہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

بچی لہروں کو گن رہی تھی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی موٹی کوئی پتلی۔ کوئی رنگتی ہوئی آ رہی تھی۔ کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی چنگھاڑتی ہوئی اور کوئی دہاڑتی ہوئی اور پھر ان سب لہروں کی ایک نانی اماں آئی اور اس کے ساتھ سمندر سچ مچ کشتی میں آ گیا اور بیس برس کے بعد بھی آج پھر بھوکی لہروں کے بھیانک جبڑوں میں جا پڑی۔

دور کہیں سے ایک آواز گونجی۔

”یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا۔“

”چھوٹا بے بی!

نمکین پانی چکھتے ہوئے بچی اندھیرے کنوئیں کی تہہ کی طرف جا رہی تھی، کہ اس کے شعور میں کوئی چیز یکایک بیدار ہو گئی۔ جیسے سویا ہوا شیر جاگ اٹھتا ہے، غراتا ہوا۔

تو یہ لہریں چھوٹے چھوٹے بے بی کھاتی ہیں مگر میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔ بندر کی طرح لال منھ والے صاحب، کان کھول کر سن لو۔ میں چھوٹا بے بی نہیں ہوں۔“

اور اسی وقت اس کے دونوں ہاتھوں نے اس لال منھ والے صاحب کو اس زور سے دھکا دیا کہ نیچے جانے کی بجائے وہ اوپر کی طرف اٹھنے لگی۔

پھر اس کے شعور میں قریب ہی سے ایک جانی پہچانی پیار بھری آواز نے چڑایا۔

”تم سچ مچ بچی ہو، بچی ہو۔ بچی ہو؟“

”میں بچی نہیں ہوں“

سمندر کی تہہ سے اوپر اٹھتے ہوئے اس کا دل دھڑکتا ہوا چلایا۔

”میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں ڈگری لی ہے — میں نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ میں نے ماضی اور مستقبل، ہر دروازے اور تہذیب و تمدن کے ہر دریچے میں جھانک کر دیکھا ہے۔“

مگر ایک آواز جو انور کی سی آواز تھی، اُسے چڑاتے جا رہی تھی —

●

مگر تم نے اپنے اصطبل کے دروازے میں سے جھانک کر نہیں دیکھا کہ گھوڑی کے بچہ کیسے ہوتا ہے؟“

”وہ سب بھی مجھے معلوم ہے۔ جانتے ہو میرا شوہر کتنا بڑا ڈاکٹر ہے۔ اُس نے مجھے زندگی کے

نہیں چاہتی۔ مجھے ماضی کے دروازے کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"اس لئے کہ تم ماضی سے ڈرتی ہو...... جیسے تم سمندر سے ڈرتی ہو، جیسے تم زندگی سے ڈرتی ہو، جیسے تم محنت اور مفلسی سے ڈرتی ہو، جیسے تم سچائی سے ڈرتی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔"

"تو سنو۔ میرا باپ تمہارے باپ سر عظیم اللہ کے دوست راجہ جےپال سنگھ تعلقدار کے فیل خانے میں مہاوت تھا۔ میں اسی فیل خانے میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے سائیسوں اور بھنگیوں کے بچوں کے ساتھ پرورش پائی ہے اور یہ ڈاکٹری، یہ تعلیم، یہ نام، یہ عزت مجھے بخششیں ملی ہے اپنے باپ کی جان کے عوض۔ اس لئے کہ وہ راجہ صاحب کا نمک حلال ملازم تھا اور اس نے مالک کی اولاد کی جان بچانے کے لئے اپنی جان دے دی۔"

"یہ سب مجھے کیوں سُنا رہے ہو۔ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم سے شادی کی ہے، تمہارے خاندان سے نہیں۔"

"اسی لئے سنا رہا ہوں کہ جو سچائی سے ڈرتا ہے، وہ مجھ سے کیا کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتا ــــ اور اسی لئے آج میں تمہیں یہاں......"

سلمٰی کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اسی دم اس نے دیکھا کہ کشتی آدھی سے زیادہ پانی سے بھر چکی ہے۔

"انور ــــ!"

وہ چلائی

یہ کیا؟ ــــ کیا تم مجھے یوں مارنے کے لئے یہاں لائے تھے؟"

انور نے اطمینان سے چپّو سمندر میں پھینک دیئے۔

"تمہیں تیرنا تو آتا ہوگا ڈارلنگ!"

"آتا ہے ــــ مگر تالاب میں ــــ سمندر میں نہیں۔"

"اسے بھی ایک لمبا چوڑا تالاب ہی سمجھو ــــ صرف گہرائی ذرا زیادہ ہے۔ دو چار ہاتھی ڈباؤ پانی ہوگا۔ وہ سامنے والی چٹانیں زیادہ دور نہیں ہیں۔"

اور اب سلمٰی کی ہیبت زدہ نگاہوں نے دیکھا کہ کشتی تین چوتھائی پانی سے بھر چکی ہے اور کسی دم میں ڈوبنے ہی والی ہے۔

"ٹاٹا ڈارلنگ!"

اور یہ کہہ کر انور نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور ٹاپو کے کنارے کی چٹانوں کی طرف تیر کر جانے

"کیا بھیانک کہانی یاد آئی ہے تمہیں؟ بھلا یہ بھی کوئی موقعہ ہے ایسی کہانی سنانے کا؟"

"اس سے بہتر کونسا موقعہ ہو سکتا ہے۔ ہم دونوں کشتی میں ہیں۔ کشتی سمندر میں ہے اور کون جانتا ہے تھوڑی دیر میں سمندر ہماری کشتی میں ہو۔"

"بھئی مجھے ڈراؤ مت۔ خدا کے لئے کوئی اور بات کرو۔ تمہارا سمندر مجھے بور کرتا ہے۔"

"تو سمندر تمہیں بور کرتا ہے؟" انور نے چپوؤں کو پورے زور سے چلاتے ہوئے دانت پیس کر پوچھا اور اپنی آواز میں سے اس نے محبت کے شائبے کو بھی نکال پھینکا۔

"ہاں ہاں۔ بور کرتا ہے۔" سلمہ چلائی اور اسی وقت ایک لہر کا طمانچہ اس زور سے پڑا کہ وہ سر سے پیر تک شرابور ہو گئی۔

"جیسے میں بور کرتا ہوں؟"

اور انور کی آواز کا طمانچہ سمندر کی لہر سے بھی بہت زیادہ خوفناک تھا۔

"انور ڈارلنگ! تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ تم کیسے سوچ سکتے ہو۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تم سے۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی۔ نہ مجھ سے، نہ جُھنیا سے۔"

"جُھنیا ـــ!"

دفعتاً سلمہ کے لاشعور کی تہ میں ہزاروں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ماضی کے پُر اسرار دروازے آپ سے آپ کُھلنے لگے۔

وہ چلائی۔

"جُھنیا کے بارے میں تم کیسے جانتے ہو؟"

"ایسے کہ تم ہمیشہ خواب میں چلاتی رہتی ہو۔ جُھنیا مجھے معاف کر دو۔ جُھنیا میں مجبور تھی۔ جُھنیا میں تم تک نہیں آسکتی۔ بیچ میں سمندر ہے اور مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔ تقریباً ہر رات کو تم سوتے سوتے یہ بڑبڑاتی ہو لیکن سلمہ جو ڈرتے ہیں، وہ محبت نہیں کر سکتے۔ نہ اپنی بچپن کی سہیلی سے نہ اپنے شوہر سے۔"

"انور تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو ـــ؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟"

"جانتی ہو میں کون ہوں؟"

"تم میرے شوہر ہو۔ تم ایک مشہور ڈاکٹر ہو۔۔۔۔۔"

"مگر جانتی ہو، میرا باپ کون تھا؟ میں کہاں پیدا ہوا تھا؟ کس خاندان میں؟"

"میں نہیں جانتی اور نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں جانتی ہوں انور ـــ اور میں کچھ جاننا!

علاج

سمندر میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ لہروں میں کشتی ڈول رہی تھی اور کشتی پر ایک سرے پر انور بیٹھا تھا اور دُوسرے پر سلمہ۔

(سلمہ سوچ رہی تھی —— کہتے ہیں ایسے بھی سچے عاشق ہوتے ہیں جو محبت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ چلو جی انور میاں، آج تمھاری خاطر ہم بھی جان دیئے دیتے ہیں۔)

(اور انور سوچ رہا تھا —— بڈھا ڈاکٹر باسو ہے تو بڑا عقلمند آدمی اور نفسیات کا مانا ہوا اُستاد۔ مگر بڑے میاں نے کہیں مجھے اُلٹا سبق تو نہیں پڑھا دیا۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔)

سمندر میں لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ہر اُٹھتی لہر کے ساتھ سلمہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کا تخیل اُسے سمندر کی اندھیری گہرائی میں لے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا اور جب ڈر کے مارے وہ آنکھیں کھول دیتی تو دیکھتی کہ ایک لہر کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لہر منہ پھاڑے اس کو نگلنے کے لئے چلی آ رہی ہے۔

(ہائے اللہ۔ اس نے سوچا۔ میں نے کمزوری کے کس لمحے میں اس کشتی میں بیٹھنا منظور کر لیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں پہلے ہی کہہ دیتی کہ جاؤ بھائی تم ٹاپو پر جا کر مچھیرن کا بچہ جنواؤ۔ اُس کا آپریشن کرو، جو چاہے کرو۔ تم کہو گے تو جہنم میں چلی جاؤں گی مگر اس کشتی میں نہیں بیٹھوں گی۔ سمندر کمبخت میں بھی تو طوفان آ رہا ہے۔ ہائے اللہ؟ تو کیا میں اللہ کو مانتی ہوں؟ کون جانتا ہے، شاید مانتی ہی ہوں۔ کیمبرج میں پڑھا ہوا فلسفہ تو کہتا ہے، اللہ صرف ایک واہمہ ہے، مگر یہاں سمندر کی اِن خونخوار لہروں میں تو مجھے ہر طرف خدا کا قہر ہی قہر نظر آ رہا ہے۔ نہ جانے کون کون سے گناہ میرے نامۂ اعمال میں لکھے ہوتے ہیں، جن کی سزا میں مجھے اس سمندری قبر میں آج دفن کیا جاتے گا مگر کیا منکر نکیر سمندر کی تہہ میں پڑے ہوئے مُردوں سے بھی سوال و جواب کرتے ہیں؟)

(اور انور سوچ رہا تھا، کمال ہے کہ سلمہ سوئٹزرلینڈ کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی خطرناک ڈھلوانوں پریکٹنگ کر آئی ہے۔ درجنوں بار ہوائی جہاز میں سفر کر چکی ہے۔ خود ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے لیکن ایک کشتی میں دو میل کے سمندری سفر سے اُس کی رنگت پیلی پڑ گئی ہے۔ سمندر کی یہ ہیبت تو اُس کے شعور میں چھپی بیٹھی ہے نہ جانے کتنے برسوں سے۔ کیا اس ہیبت کو کوئی بھی وہاں سے نکال سکتا ہے؟ شاید محبت نکال سکتی ہے۔ آج بے چاری میری خاطر اس کشتی میں بیٹھ ہی گئی نا۔ بڑا ظلم کیا ہے میں نے اُس کے ساتھ۔

اُس دن سویرے جب وہ سو کر اُٹھے تھے تو انور کو یقین نہیں تھا کہ سلمہ اس کے ساتھ آنے

کو تیار ہو جائے گی۔

ناشتے کی میز پر سلمہ نے حسبِ معمول پہلا سوال یہی کیا تھا "ڈارلنگ! وہ فلیٹ ہمیں کب تک مل جائے گا؟"

اور حسبِ معمول انور نے جواب دیا تھا "بہت جلد۔ شاید اگلے مہینے ہی ہم شفٹ کر جائیں۔ شاید۔۔۔"

"یہ شاید کیوں؟"

اس لئے کہ شاید اس عرصے میں تمہارے دِل سے سمندر کی ہیبت نکل جائے اور تم سمندر سے ڈرنا چھوڑ دو۔"

"کون کہتا ہے میں سمندر سے ڈرتی ہوں؟"

"تو پھر یہ گھر کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

"بس مجھے سمندر پسند نہیں ہے۔"

یہ انور کے لئے ایک اور حیرت کی بات تھی۔ رات کو وہ سمندر سے ڈرتی تھی لیکن دن کے اُجالے میں وہ اس خوف کا اقرار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

"بس مجھے سمندر پسند نہیں۔"

وہ کہے جا رہی تھی۔

"مجھے سمندر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تمہارا سمندر بور کرتا ہے ـــــ"

اس کی آواز اُونچی ہوتی گئی تھی۔ اس میں ہسٹریا کی کیفیت آ گئی تھی اور انور نے دیکھا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں ایک ایسے خوف کی چمک ہے جیسے دن دہاڑے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔۔۔

"دھیرے دھیرے چھری چلاتے ہوئے انور نے کہا۔

"سلمہ تم نے وہ پکچر دیکھی تھی؟"

"کون سی پکچر؟"

"کیا نام تھا اُس کا؟ ہاں۔ اب یاد آیا۔ لیون ہرٹو ہیون۔"

"ہاں دیکھی تھی۔ مگر اس وقت اس کی یاد کیسے آئی؟"

"اس میں بھی تو سمندر کا ایک سین ہے۔ ایک شکی مزاج بیوی ہے جو دوسری لڑکی کو کشتی میں بٹھا کر سمندر میں لے جاتی ہے۔"

"ہاں۔ شاید کوئی سین تھا تو ایسا۔ اچھی طرح یاد نہیں۔"

اور بیچ سمندر میں جا کر بیوی اطمینان سے کہتی ہے کہ کشتی کے تختوں میں اُس نے ایک سُوراخ کر رکھا ہے، جس میں سے پانی بھرتا جا رہا ہے اور اب تھوڑی دیر میں دونوں ڈوب جائیں گی۔"

علاج

سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لہروں میں کشتی ڈول رہی تھی اور کشتی پر ایک سرے پر انور بیٹھا تھا اور دوسرے پر سلمہ۔

(سلمہ سوچ رہی تھی — کہتے ہیں ایسے بھی سچے عاشق ہوتے ہیں جو محبت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ چلو جی انور میاں، آج تمھاری خاطر ہم بھی جان دیے دیتے ہیں۔)

(اور انور سوچ رہا تھا — بڈھا ڈاکٹر باسو ہے تو بڑا عقلمند آدمی اور نفسیات کا مانا ہوا اُستاد۔ مگر بڑے میاں نے کہیں مجھے اُلٹا سبق تو نہیں پڑھا دیا۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔)

سمندر میں لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ہر اُٹھتی لہر کے ساتھ سلمہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کا تخیل اُسے سمندر کی اندھیری گہرائی میں لے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا اور جب ڈر کے مارے وہ آنکھیں کھول دیتی تو دیکھتی کہ ایک لہر کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لہر منہ پھاڑے اس کو نگلنے کے لئے چلی آ رہی ہے۔

(ہائے اللہ۔ اس نے سوچا۔ میں نے کمزوری کے کس لمحے میں اس کشتی میں بیٹھنا منظور کر لیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں پہلے ہی کہہ دیتی کہ جاؤ بھائی تم ٹاپو پر جا کر مچھیرن کا بچہ جنواؤ۔ اُس کا آپریشن کرو، جو چاہے کرو۔ تم کہو گے تو جہنم میں چلی جاؤں گی مگر اس کشتی میں نہیں بیٹھوں گی۔ سمندر کمبخت میں بھی تو طوفان آ رہا ہے۔ ہائے اللہ؟ تو کیا میں اللہ کو مانتی ہوں؟ کون جانتا ہے، شاید مانتی ہی ہوں۔ کیمبرج میں پڑھا ہوا فلسفہ تو کہتا ہے، اللہ صرف ایک واہمہ ہے، مگر یہاں سمندر کی اِن خونخوار لہروں میں تو مجھے ہر طرف خدا کا قہر ہی قہر نظر آ رہا ہے۔ نہ جانے کون کون سے گناہ میرے نامۂ اعمال میں لکھے ہوتے ہیں، جن کی سزائیں مجھے اس سمندری قبر میں آج دفن کیا جائے گا مگر کیا منکر نکیر سمندر کی تہہ میں پڑے ہوئے مُردوں سے بھی سوال و جواب کرتے ہیں؟)

(اور انور سوچ رہا تھا، کمال ہے کہ سلمہ سوئٹزرلینڈ کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی خطرناک ڈھلوانوں پر سکیٹنگ کر آئی ہے۔ درجنوں بار ہوائی جہاز میں سفر کر چکی ہے۔ خود ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے لیکن ایک کشتی میں دو میل کے سمندری سفر سے اُس کی رنگت پیلی پڑ گئی ہے۔ سمندر کی یہ ہیبت تو اُس کے شعور میں چھپی بیٹھی ہے نہ جانے کتنے برسوں سے۔ کیا اس ہیبت کو کوئی بھی وہاں سے نکال سکتا ہے؟ شاید محبت نکال سکتی ہے۔ آج بے چاری میری خاطر اس کشتی میں بیٹھ ہی گئی نا۔ بڑا ظلم کیا ہے میں نے اُس کے ساتھ۔

اُس دن سویرے جب وہ سو کر اُٹھے تھے تو انور کو یقین نہیں تھا کہ سلمہ اس کے ساتھ آنے

"یہ سمندر کا ہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔"

اور اب وہ خوفناک لہریں جو ہاتھی کی طرح موٹی تھیں اور اُونٹ کی طرح اونچی تھیں اور شیر کی طرح دہاڑتی تھیں اور کہانیوں والے اژدہوں کی طرح پھنکارتی تھیں۔ بچی کے چاروں طرف شیطانوں کی طرح ناچ رہی تھیں۔ چلاّ چلاّ کر کہہ رہی تھیں ـــــ

"ہم تمہیں کھا جائیں گے، ہم تمھیں کھا جائیں گے۔"

اور نہ جانے کہاں سے اُن کے اصطبل کا دروازہ بہتا ہوا وہاں آ گیا اور جب بچی نے وہ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چنبیلی گھاس پر لیٹی ہوئی زور سے سانس لے رہی ہے اور اس کا پیٹ کسی نے کاٹ ڈالا ہے اور پیٹ میں سے اور بھی بھیانک سمندری لہریں باہر نکل رہی ہیں اور پھر ایک سمندر، اور دوسرا سمندر اور تیسرا سمندر سب ایک ہو گئے اور سب مل کر بچی کا گلا گھونٹنے لگے اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھانے لگا۔ مگر اس اندھیرے میں گم ہوتے ہوتے اس نے محسوس کیا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اُسے پکڑ لیا ہے اور اب وہ کنوئیں میں نیچے کی طرف نہیں جا رہی، کسی زینے پر چڑھتی ہوئی اُوپر کی طرف جا رہی ہے۔

جب کئی گھنٹے بعد بچی کو ہوش آیا اور لہروں کے جہاز سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی، تو اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور دہشت زدہ آواز میں چلاّئی؛

"مس صاحب! مجھے سمندر سے بچاؤ۔"

●

"ارے بھئی یہ مس صاحب کون ہیں، جنھیں آواز دے رہی ہو؟"

سلمیٰ نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ دھوپ کمرے میں پھیل چکی ہے اور انور اپنی پیار بھری نگاہوں سے اُسے چوم رہا ہے۔

"پیاری بچی! خواب میں پھر ڈر گئیں!"

"نہیں۔" اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا: "تم میرے پاس رہو گے تو میں کسی چیز سے نہیں ڈروں گی۔"

"سمندر سے بھی نہیں؟"

"نہیں!"

مگر نہ جانے کیوں انور کو محسوس ہوا کہ اس "نہیں" میں یقین اور قطعیت کی کسی قدر کمی ہے۔

چڑھی بلکہ اکڑی رہتی تھیں۔ اس وقت غصے سے ہل رہی ہیں جیسے شکار کو دیکھ کر اُن کے شکاری کتے شیرو کی دُم ہلنے لگتی ہے۔

سلمہ کو پھر اس کے کمرے میں قید کر دیا گیا۔ جھنیا کے بابا کو کہہ دیا گیا کہ اُس کی چھوکری نے پھر کبھی چھوٹی بی بی سے بات کی تو اُس کی ہنٹر سے خبر لی جاتے گی۔

اگلے ہفتے ہی سلمہ کو مسوری پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا اور ایک برس بعد مس میری کی تجویز پر اُن کے ساتھ اسے انگلستان بھیج دیا گیا اور جب اُن کی بیوک کار احاطے سے باہر سڑک پر آئی تو سلمہ نے دیکھا کہ جھنیا پیچھے دوڑتی ہوئی آرہی ہے۔ سلمہ چلائی "ڈیدی۔ ڈیڈی۔ میں جھنیا سے مل لوں۔" مگر سر عظیم اللہ نے ڈرائیور کو کار نہ روکنے دی اور جھنیا موٹر کے پہیوں سے اڑتی ہوئی دھول کے بادلوں میں کھو گئی اور اس کے بعد صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی۔ جو ہر لمحے کھلنے والے جیبی فیتے کی طرح لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

اور اب یہ سڑک جہاز کے پیچھے پیچھے آرہی تھی اور ہر لمحہ سلمہ اور جھنیا کے درمیان کا فاصلہ لمبا کرتا جا رہا تھا۔

مگر بچی نے سوچا یہ سڑک یہاں سے ہمارے گھر تک جاتی ہے۔ اگر میں یہاں سے اس سڑک پر چلنا شروع کردں، اور چلتی رہوں، چلتی رہوں، اس وقت سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک چلتی ہی رہوں، راستے میں ایک بار بھی نہ رکوں، تو ابھی اصطبل کے پچھواڑے مرغی خانے میں مرغے اذان دے رہے ہوں گے کہ میں گھر پہنچ جاؤں گی اور پیچھے سے جا کے سوتی ہوئی جھنیا کی آنکھیں بند کر لوں گی اور کہوں گی "جھنیاری جھنیا۔ بول تو سہی میں کون ہوں۔" اور جب وہ میری آواز پہچان کر میرے پیچھے بھاگے گی تو میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی اور سارے باغ میں اُسے دوڑاؤں گی اور اس کے ہاتھ نہ آؤں گی۔ مگر اس وقت تو ڈیڈی وہاں اپنا بھورے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے ٹہل رہے ہوں گے۔ تو پھر کیا ہوا۔ میں اُن سے کہہ دوں گی "ڈیڈی۔ میں لندن وندن نہیں جاؤں گی۔ میں تو یہاں رہوں گی اور جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی اور اُس کے ساتھ اصطبل میں جا کر دیکھوں گی کہ ہماری چنبیلی کے بچہ کیسے ہوتا ہے۔"

جہاز کے پیچھے پانی پر سفید جھاگوں کی سڑک سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سلمہ کو ایسا لگا جیسے سڑک مسکرا کر اُسے بلا رہی ہے۔ جیسے سڑک کہہ رہی ہے "چل سلمہ۔ میں تجھے جھنیا سے ملا دوں۔"

اور سو بچی نے اس سڑک کی طرف قدم بڑھا ہی دیا۔

مگر وہ سڑک نہیں تھی۔

وہ ایک کنواں تھا، اندھیرا اور ٹھنڈا۔ اور دم گھوٹنے والا اندھا کنواں۔

وہ نیچے جا رہی تھی اور اس کے کان میں ایک لال منہ والے انگریز کی آواز گونج رہی تھی۔

"بچہ کیسے ہوتا ہے؟"

"یہی تو میں دیکھنے گئی تھی چھوٹی بی بی۔"

"پھر دیکھا نہیں؟"

"نہیں۔ بابا کہویں ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر ہے ___ پر چنبیلی بڑے جور جور سے سانس لے رہی ہے میں تو بھی تھی، مر رہی ہے۔ وہ ہماری چت کبری کُتیا تھی نا، وہ جب مری تھی تو وہ بھی ایسے ہی سانس لے رہی تھی۔"

"تو کیا چنبیلی بھی مر جاوے گی؟"

"نہیں چھوٹی بی بی۔ پھکر نہ کرو۔ بابا کہویں ہیں کہ مر مر کے ہی جندگی پیدا ہووے ہے۔ اچھا، اب میں چلوں، پھر آؤں گی۔"

"اے جھُنیا ___!"

"ہاں چھوٹی بی بی ___"

"میں بھی چلوں تیرے ساتھ؟ دیکھوں گھوڑی کا بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟"

"اور جو کسی نے دیکھ لیا تو بڑے صاحب مجھے ہنٹر لگائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ ابا تو کورٹ گئے ہوئے ہیں اور مس میری اپنے کمرے میں پڑی سو رہی ہیں۔"

سو وہ کھڑکی سے کود گئی' اور اس کا نائیلون کا نائٹ گاؤن کانٹوں میں اُلجھ کر کئی جگہ سے پھٹ گیا اور اس کا ٹخنہ چھِل گیا۔ مگر اس کا دل ایک نامعلوم مسرت اور ایک عجیب خوف سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ دونوں باغ کی کیاریوں میں سے نہیں بلکہ گھنے اندھیرے جنگل میں سے ہوکر پریوں کے دیس کی طرف جا رہے ہوں۔ بالکل جیسے مس میری کی کہانیوں کی شہزادیاں جاتی تھیں اور پھر وہ دونوں اصطبل کے بالکل سامنے تھیں اور اندر سے چنبیلی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔

بلکہ ایک بار تو وہ اتنے درد بھرے انداز میں ہنہنائی کہ سلمہ ڈری کہ شاید اس کی پیاری گھوڑی سچ مچ مر رہی ہے مگر فوراً ہی اُسے جھُنیا کے بابا کا کہنا یاد آیا، کہ مر مر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اصطبل کا دروازہ کھلتے ہی زندگی کا سب سے بڑا اور خوفناک راز اس پر آشکار ہو جائے گا اور اس کا دل اور بھی زوردں سے دھڑکنے لگا۔

لیکن اصطبل کا دروازہ نہیں کھُلا۔ اس وقت نہیں کھلا۔ زندگی بھر نہیں کھلا۔ پیچھے سے اس بیوک کار کا ہارن سنائی دیا اور جب سلمہ اور جھُنیا نے گھبرا کے مڑ کر دیکھا تو سر عظیم اللہ موٹر سے اُتر کر اُن کی طرف آ رہے تھے۔ بدن پر چیری والا کالا کوٹ اور دھاریوں والی پتلون۔ سر پر سفید ہیٹ، اور سلمہ نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی کی مونچھیں جو ولایتی گوند سے نکیلی بنائی جاتی تھیں اور ہمیشہ نہ صرف

"پھر تم دن بھر کیا کرتی ہو؟"

"کھیلتی ہوں اور بابا کہیں تو گھوڑوں کو پانی پلا دیتی ہوں۔"

"اور جب تمھیں بخار آتا ہے تب کیا کرتی ہو؟"

"جب مجھے بخار آتا ہے تو میں کھوب دھوپ میں بھاگتی ہوں۔ پسینہ آ کے بخار آپ سے آپ بھاگ جاتا ہے۔ پر چھوٹی بی بی تم کیوں کمرے میں بند رہتی ہو؟"

"ڈاکٹر اور ڈیڈی کا حکم نہیں ہے باہر نکلنے کا۔"

"ڈاکٹر بہت برا آدمی ہے چھوٹی بی بی۔"

"کیوں؟"

"وہ سوئی لگاتا ہے۔ ایک بار میرے سوئی لگائی تھی تو تین دن تک بانہہ سوجی رہی تھی۔"

اور سو اُن کی دوستی ہو گئی۔ میلے پیوند لگے فراک پہننے والی سائیں کی بیٹی جھنیا اور نائیلون کا نائٹ گاؤن پہننے والی سر عظیم اللہ کی بیٹی سلمہ سہیلیاں بن گئیں۔

روز جھنیا سلمہ کے لئے باغ میں سے تُڑا کر پھول، کچی کیریاں اور کچے پکے امرود لاتی اور اُن کے بدلے میں سلمہ اُسے اپنے بالوں میں لگانے کے لئے ریشمی ربن اور رنگین تصویروں والی کتابیں، اور بولنے والی گڑیاں دیتی اور گھنٹوں سلمہ کھڑکی میں بیٹھی جھنیا سے باتیں کرتی رہتی۔ سلمہ اکثر سوچتی جھنیا کتنی خوش قسمت ہے۔ دِن بھر کھیلتی گھومتی پھرتی ہے۔ کوئی اسے نہیں روکتا۔ دس دس دن نہاتی نہیں، کوئی اُسے زبردستی ٹب میں بٹھا کر صابن مل مل کر زبردستی نہیں نہلاتا۔ جو اس کا جی چاہتا ہے کھاتی ہے جب بی چاہتا ہے درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔ اُسے دُنیا کے بارے میں بھی تو کتنا کچھ معلوم ہے۔ وہ جانتی ہے کہ گھوڑی کی نال کیسے لگائے جاتے ہیں اور پن چکی پر آٹا کیسے پیسا جاتا ہے اور نوٹنکی میں لال پری کیسے ناچتی ہے اور کالا دیو کیسے دہاڑتا ہوا آتا ہے اور اُسے اُٹھا کر لے جاتا ہے اور مالی کا بیٹا کلوا جس کا پچھلے برس ہی بیاہ ہوا تھا، کیسے ٹھرا پی کر پہلے اپنی بہو کو مارتا ہے اور پھر پیار کرتا ہے اور اور ـــ جھنیا جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، یہ سب باتیں سلمہ کو سُناتی رہتی اور سلمہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک سُنسان ٹاپو میں قید ہے، زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف زندگی کا سمندر پھیلا ہوا ہے اور اس سمندر میں جھنیا مزے سے چھینٹے اُڑا رہی ہے، تیر رہی ہے ـــ ڈبکیاں لگا رہی ہے۔

ایک دن جھنیا دیر کر کے آئی تو سلمہ نے پوچھا "اری تو کہاں رہی؟ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"چھوٹی بی بی۔ میں تو ذرا اصطبل میں گئی تھی۔ آپ کی گھوڑی ہے نا چنبیلی، اُس کے بچہ ہونیوالا ہے۔"

سب چیزوں سے بچی کا جی اُکتا گیا۔ کیونکہ وہ چاہتی تھی کسی سے بات کرنا اور بات کرنے کی اُسے ڈاکٹر بینرجی کی طرف سے سخت ممانعت تھی۔ اسی لئے تو اس کے ڈیڈی نے مس میری کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو بچی کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے اور چونکہ بچی خود بہت باتونی تھی اور مس میری سے ہر وقت اوٹ پٹانگ سوال کرتی رہتی تھی اور ڈیڈی سے سوال کرتی تھی کہ مجھے کوئی پریوں کی کہانی سنائیے۔ اسس لئے ڈاکٹر اور ڈیڈی دونوں کے حکم سے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند رکھا جاتا تھا اور صرف دوا اور کھانے کے اوقات پر مس میری چند منٹ کے لئے اندر جاتی تھیں۔

اور سو جب اس نے باغ میں اپنی ہم عمر ایک بچی کو دوڑتے بھاگتے دیکھا تو سلمہ بے اختیار چلّا پڑی۔

"اے۔ اے۔ اِدھر آ۔"

"سلام چھوٹی بی بی۔"

"تم مجھے جانتی ہو؟"

"جرور جانتی ہوں۔ یہ فراک جو میں پہنے ہوں یہ تمھارا ہی تو ہے چھوٹی بی بی۔"

اور سلمہ نے پہچان لیا کہ میل اور پیوندوں کے نیچے جو نیلی دھاریوں کا فراک ہے وہ واقعی کبھی اس کا ہی تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جھُنیا۔"

"اور میرا نام ہے سلمہ۔"

"نہیں۔ تمھارا نام ہے چھوٹی بی بی۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بابا نے۔"

"تمہارے بابا کیا کرتے ہیں؟"

"آپ کے گھوڑوں کو دانہ کھلاتے ہیں، اُن کو نہلاتے ہیں، اُن کی مالش کرتے ہیں۔"

"تم تو سائیس رام دین کی بیٹی ہو؟"

"ہاں"

جاتیں؟"

کیلے۔ وہ جانتی تھی کہ جھُنیا کو کیلے بہت پسند ہیں۔

"اہاہا!" اس نے سوچا۔ "سویہ ہے گھر جانے کی سڑک۔"

جہاز کے پیچھے جہاں پانی کٹ رہا تھا سفید جھاگوں کی ایک لمبی سڑک بنتی جا رہی تھی۔ جو دُور تک چلی گئی تھی۔ حدِ نظر تک۔ بچی کے گھر تک۔

بچی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لال منھ والا انگریز اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو رہا تھا اور اس کا سِگار منھ میں لگا ہوا سُلگ رہا تھا اور اُس کی راکھ اس کے سفید سُوٹ پر گرتی جا رہی تھی اور کئی مسافر اپنی اپنی کُرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

جہاز کے نیچے اس کے پیٹ میں سے انجنوں کی دھڑدھڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ جہاز چلا جا رہا تھا۔ ساؤتھ ہیمپٹن کی طرف لندن کی طرف، اس اسکول کی طرف جہاں جھُنیا نہیں ہوگی۔

جھُنیا! ـــــ اپنی سہیلی کا خیال آتے ہی بچی مُسکرا دی۔

جھُنیا جو کالی تھی مگر جس کے چھوٹے چھوٹے دانت ایسے چمکتے تھے جیسے سچے موتی۔ جھُنیا جس کا شلوکہ اور لہنگا ہمیشہ گندا اور پھٹا رہا ہوتا تھا، جس کی آنکھوں میں ہمیشہ چیپڑ لگے رہتے تھے اور جس کے چہرے اور ٹانگوں پر ہمیشہ گرد کی تہ جمی رہتی تھی مگر جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھی، کھیلتی کُودتی اور شور مچاتی رہتی تھی اور جب اُس کا باپ گھوڑوں کو نہلاتا یا اُن کی مالش کرتا تو وہ ضد کر کے گھوڑے پر بیٹھ جاتی تھی، اور کہتی تھی "چل میلے گھوڑے چل چل چل۔"

دو برس ہوئے بچی کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ جب ڈیڑھ مہینے کے بعد اس کا بخار ٹوٹا تو اتنی کمزور ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے ہدایت کی ابھی مہینے بھر تک چلے پھرے نہیں، پلنگ پر لیٹی رہے اور سو کتنے ہی دن تک وہ لیٹے لیٹے چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے کے پروں کو گنتی رہتی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ، بیس، اٹھائیس، بیالیس ...... تین سو دس ...... آٹھ سو بارہ ـــ اور اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ پنکھے کے پروں کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ جانے کہاں سے ایک کے بعد ایک پنکھے کے پر ہوا میں سے نکلتے ہی آتے تھے۔ مگر پھر وہ اس کھیل سے اُکتا گئی اور دیواروں پر دوڑتی ہوئی چھپکلیوں کی دوڑ بھاگ میں دلچسپی لینے لگی۔ یہ چھپکلیاں بالکل سرکس کے مداریوں کی طرح تھیں۔ دیوار پر سیدھی اُوپر چڑھ جاتی تھیں مگر تھیں بہت گندی۔ کیڑے مکوڑے، مکھی، مچھر کھاتی رہتی تھیں۔ جس کو دیکھ کر بچی کا جی متلانے لگتا اور سو آخر کار اس نے سوچا کہ میں اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر باغ ہی کی سیر کر لوں۔"

باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور تتلیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں اور دُور لان پر اُن کا بوڑھا مالی گلاب کی کیاریوں میں فوارے سے پانی دے رہا تھا اور نیم کے پیڑ پر لال لال چونچ والے طوطے بیٹھے تھے اور دور آم کے پیڑوں میں ایک کوئل کُوکُو کر رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ان

اور یہ سُن کر بچی کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی اور مس میری نے لال منہ والے کو ڈانٹ کر کہا۔

"مسٹر ولیم۔ دیٹ از ویری بیڈ۔ آپ ایک بے بی کو ڈرانا مانگتا۔ ویری بیڈ۔ کم آن ڈارلنگ۔"

اور وہ بچی کو کیبن میں لے گئی اور اس کو تصویروں والی کتاب دی کہ یہاں بیٹھ کر تصویریں دیکھو۔

"مس صاحب۔"

"یس مائی ڈیر ——"

"یہ جہاز گھر کب پہنچے گا؟"

"یہ جہاز گھر نہیں جاتے گا بے بی۔ یہ تو ساؤتھ ہیمٹن جائے گا۔ وہاں سے ہم لوگ ریل سے لندن جائیں گے۔"

"لندن کیوں جائیں گے؟"

"اس لئے کہ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں، تم اُدھر فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔ اُدھر سب انگریز بے بی لوگ ہو گا۔"

"مگر میں تو جھنیا کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں مس صاحب۔"

"جھنیا —— وہ سائیس کا چھوکری —— چھی چھی چھی —— دیٹ ڈرٹی لٹل گرل۔ تمہارا جیسا ہائی، کلاس بے بی ایک سائیس کا گندا چھوکری کے ساتھ کس مانک پڑھ سکتا ہے۔ تمہارا ڈیڈی نہیں چاہتا کہ تم ایسا بچہ لوگ کے ساتھ کھیلے۔ اسی واسطے تم کو ہماری ساتھ انگلینڈ پڑھنے کو بھیجتا۔"

"تو پھر جھنیا کو بھی لے چلو مس صاحب۔"

"ہم بولا بے بی کہ وہ ڈرٹی چھوکری ہے۔ ایک دم گندا۔"

"تو اُدھر لندن میں ہم اُسے نہلائیں گے مس صاحب۔ باتھ ٹب ہو گا نہ اُدھر ——"

"ایسا چھوکری کا ڈرٹ باتھ ٹب میں نہیں دھو سکتا۔"

"تو پھر میں لندن نہیں جاتی۔ میں تو گھر جاؤں گی۔ جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

"گھر اِدھر سے چار ہزار میل ہے بے بی۔"

"مگر کدھر ہے؟"

"اُدھر، جہاز کے پیچھے، سمندر کے پار۔"

اور جب دوپہر کے کھانے کے بعد مس میری سو گئیں تو بچی دبے پاؤں کیبن سے نکلی اور ڈیک کے پچھلی طرف ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہاتھ میں اُس کے ایک گڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں دو

"چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ۔"

بچی سوچ رہی تھی کہ اتنی بہت سی لہروں کو اللہ میاں کون سے اصطبل میں رکھتے ہوں گے۔ ہمارے گھر میں تو تین گھوڑے ہیں۔ ایک جو فٹن میں جوتا جاتا ہے اور دو جو سواری میں آتے ہیں اور اُن کے لئے تین ہی اصطبل الگ الگ بنے ہوتے ہیں تو پھر جتنی لہریں یہ سمندر میں کودتی پھاندتی پھر رہی ہیں اُن کے لئے بھی اتنے ہی اصطبل چاہئیں اور پھر جیسے ہر گھوڑے کو کھانے کیلئے دانہ چاہئے، گھاس چاہیئے، پینے کو پانی چاہیئے۔ تو ان لہروں کو کھانا پینا کون دیتا ہے۔ پینے کو پانی تو سمندر میں بہت ہے مگر یہ لہریں کھاتی کیا ہیں؟ ابھی بچی اس اہم مسئلے پر غور کر ہی رہی تھی کہ مس میری اپنا نیلا فراک پہنے اپنی موٹی موٹی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں نارتی آگئیں۔ بچی نے اُن کے قدموں کی آہٹ سُن کر مڑ کر دیکھا کہ سمندر کی ہوا مس میری کے نیلے فراک کو اُڑا اُڑا کر اُن کے موٹے موٹے چربی چڑھے گھٹنوں سے اُوپر لے جا رہی ہے اور ان کے کھچڑی جیسے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔

"مس صاحب"۔ بچی نے اپنی انگریز گورنس سے کہا۔

"یس سلمہ"

"مس صاحب۔ سمندر میں اتنا بہت پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"یہ سب واٹر ندی اور دریا میں سے آتا ہے مائی چائلڈ"۔ مس میری نے جواب دیا اور جغرافیہ کی کتاب میں سے سمندر اور دریاؤں والا باب زبانی دُہرایا۔

"تو پھر اگر ہم سمندر میں چلتے چلے جائیں، تو دریا آ جائے گا؟"

"یس ـــ"

"وہی دریا جو ہمارے گھر کے پاس سے بہتا ہے۔"

"یس۔ وہ بھی آ جائے گا۔"

"مس صاحب۔ ایک بات اور پوچھنی ہے۔"

"پوچھو، مائی چائلڈ۔"

"یہ اتنی ساری لہریں جو ہیں، سمندر میں یہ کھاتی کیا ہیں؟"

مس میری جنہوں نے اس سوال کا جواب کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ سوچ میں پڑ گئیں لیکن ایک موٹا لال منہ کا مسافر جو دن بھر ڈیک چیئر پر لیٹا ہوا موٹا سگار پیتا رہتا تھا، ایک خوفناک قہقہہ مار کر بولا۔

"ویل ویل بے بی۔ ام تم کو بتاتا ہے۔ یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔ تم ریلنگ سے ہٹ کر کھڑا رہو، نہیں تو لہر تم کو بھی کھا جائے گا۔"

"اور ہماری محبت میں کبھی کوئی حائل نہیں ہوگا ــــ ؟" سلمیٰ نے پوچھا۔ اور اس کے ذہن میں وہ لمحے تھے، جب انور نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

"نہیں میری جان۔ دنیا میں کوئی ہماری محبت میں حائل نہیں ہوسکتا۔"

اور اسی وقت گڑگڑاتی، بھنکارتی، چنگھاڑتی ایک لہر آئی اور اتنے زور سے بندھ سے ٹکرائی کہ سارا مکان ہل گیا اور چھینٹے اُن کی کھڑکیوں تک پر پڑے۔

سلمہ کا چہرہ ایک بار پھر پیلا پڑ گیا۔

"انور ــــ مجھے ڈر لگ رہا ہے ــ :" اس نے شوہر کی آغوش میں بچوں کی طرح منھ چھپاتے ہوئے کہا۔

انور نے اپنے سینے پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔ سلمہ رو رہی تھی۔

"میری پیاری۔ میری جان۔" وہ کہے جا رہا تھا لیکن اس کا ڈاکٹری دماغ اس عجیب وغریب خوف کی تشخیص کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر سمندر غرا رہا تھا، چنگھاڑ رہا تھا، دھاڑ رہا تھا۔ ایک بپھرے ہوئے دیو کی مانند۔

اندر سلمہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ بلک ــــ بلک کر رو رہی تھی۔ ایک سہمی ہوئی بچی کی طرح۔

دیو غراتا رہا۔ چنگھاڑتا رہا، دہاڑتا رہا۔

بچی کانپتی رہی، روتی رہی، سسکیاں بھرتی رہی۔

یہاں تک کہ سمندر تھک کر ساحل سے لوٹ گیا۔

یہاں تک کہ بچی روتے روتے سو گئی مگر سوتے سوتے بھی وہ سسکیاں بھرتی رہی شاید خواب میں بھی وہ ڈر رہی تھی۔

(تشخیص)

بچی جہاز کی ڈیک پر کٹہرے کے سہارے کھڑی لہروں کو گن رہی تھی جو جہاز سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔

"ایک۔ دو۔ تین، چار، پانچ۔"

ایک لہر کے بعد دوسری ــــ ہر لہر پانی ہی کی بنی ہوئی تھی لیکن ہر لہر ایک دوسری سے مختلف تھی۔ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی مچھلی کی طرح سڈول، کسی کا اونٹ کی طرح کوہان نکلا ہوا، کوئی رینگتی ہوئی آتی تھی، کوئی دوڑتی ہوئی، کوئی جھاگوں سے بنا لیس کا سفید دوپٹہ اوڑھے۔ کوئی مس میری کی طرح نیلا فراک پہنے تھی تو کسی پر سورج کی روشنی سے ستارے جگمگا رہے تھے جیسے اماں کے کامدانی کے دوپٹے پر۔

اور اسی وقت اُن کے گھر کے باہر سمندر کے کنارے بنے ہوئے پتھروں کے بند سے ایک لہر اتنے سے آکر ٹکرائی کہ سلمیٰ اچھل پڑی۔

"میں نے کہا نہ کہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے ــــ بس ڈر لگتا ہے۔"

"کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔ کیا تم نے کبھی کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کی ہے؟"

"ہاں جب میں کیمبرج میں پڑھتی تھی۔ ایک نوجوان انگریز سائیکاٹرسٹ جارج رسل نے میرا نفسیاتی جائزہ کیا تھا۔"

"اور اس کی کیا رائے تھی؟"

"اس کا کہنا تھا کہ لاشعور کی دنیا میں سمندر سمبل (علامت) ہے جنسی فعل کی اور اس کا خیال تھا ضرورت سے زیادہ شریفانہ ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے میں اس قدرتی فعل سے خائف ہوں۔ اس لیے سمندر سے ڈرتی ہوں۔"

"اور کیا یہ سچ تھا؟"

"نہیں وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ خود مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ بہت خوبصورت تھا۔ سنہری گھونگھریالے بال تھے۔ اس کے۔ باتیں بھی بڑی اچھی کرتا تھا۔ مگر ــــ"

"مگر ــــ؟"

"مگر شراب اور سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اس کے دانت پیلے اور گندے تھے اور اس کے منہ سے پائیریا کی بو آتی تھی۔"

"اور کسی سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کوئی پسند نہیں آیا۔ کسی سے محبت کر سکتی تھی لیکن اس کی عزت نہیں کر سکتی تھی۔ کسی کی عزت کر سکتی تھی مگر محبت نہیں کر سکتی تھی۔ جب مجھے ایسا آدمی مل گیا جس سے میں محبت بھی کر سکتی ہوں، اور اس کی عزت بھی کر سکتی ہوں تو اس سے شادی کر لی۔ بس اتنی حقیقت ہے میری نفسیاتی الجھنوں کی۔"

"لیکن سمندر سے ڈر ــــ یہ بھی تو ایک نفسیاتی الجھن ہے۔"

"ہوگی ــــ مگر اب مہربانی کر کے سمندر کا ذکر مت کرو۔ کوئی اور بات کرو۔"

"تو سنو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں سلمیٰ۔ اگر میں ڈاکٹر نہیں شاعر ہوتا، تو خوبصورت

[illegible]

ہرج نہیں اور جب معائنے کے دوران میں انور کی سخت کھُردری ڈاکٹری انگلیوں نے سلمہ کے پیٹ کو چھُوا تھا تو اُن کے درد آشنا لمس میں ایسی عجیب ٹھنڈک، ایسی عجیب تسکین اور شفا تھی کہ سلمہ نے فیصلہ کر لیا کہ اب آپریشن کرواؤں گی تو اسی ڈاکٹر سے۔

اور سو وہ آپریشن کی میز پر لیٹی تھی اور کلوروفارم کے اثر سے بے ہوش ہونے سے پہلے اُس نے دیکھا کہ ڈاکٹر انور علی کی آنکھیں سرجن کی سفید نقاب میں سے مسکرا رہی ہیں اور یہ دیکھ کر اُس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور پھر کلوروفام کے بادل اُس کے شعور پر چھا گئے تھے مگر ان بادلوں میں بھی وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ جنرل وارڈ میں اَنی دوسری مریض عورتوں کے درمیان پڑی تھی اور اس کے برابر والی بیڈ کے چاروں طرف پہیوں والی سفید پردے دار دیواروں کو کھڑا کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ ایک بڑھیا بھکارن جو کسی کی موٹر کے نیچے آ گئی تھی، چل بسی تھی اور دوسری طرف ایک نوجوان مزدورنی جس کے شوہر نے جوشِ رقابت میں اس کی ناک کاٹ لی تھی، اُس شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اُسے تسلی دیتی رہی تھی ـــــ اور تین دن تک اس ماحول میں وہ پڑی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ ڈاکٹر انور علی اُسے دیکھنے آئے گا۔ مگر دُوسرے جونیئر ڈاکٹر آتے رہے اور وہ نہیں آیا کیونکہ سُنا تھا کہ وہ کسی بڑے نازک دل کے آپریشن کر رہا ہے۔ پھر چوتھے دن وہ آیا تھا اور اس نے سلمہ کو ڈانٹ کر کہا تھا "یہ کیا پلنگ پر کیوں لیٹی ہو۔ اُٹھو اور وارڈ کے اس کونے تک چل کر جاؤ۔ سلمہ نے کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب! میں کیسے چل سکتی ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری ٹانگوں میں دم ہی نہیں ہے۔ چلنا تو کیا۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جائے گا اور ڈاکٹر نے کہا تھا یہ سب بکواس ہے۔ چلو اٹھو" اور اس کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سلمہ سچ مچ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہوتے وارڈ کے کنارے تک چلی گئی اور وہاں سے بلا سہارا واپس بھی آ گئی تھی لیکن جیسے ہی وہ ڈاکٹر کے قریب آئی اس کو اپنی ٹانگوں میں دفعتاً لڑکھڑاہٹ اور کمزوری محسوس محسوس ہوئی اور وہ چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ انور نے اُسے سنبھال لیا اور سلمہ کو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی میں اُسے سہارا دینے والے ہاتھ یہی ہیں۔ دو ہفتے بعد اُن کی شادی ہو گئی تھی اور انور بیوی کو اپنے چھوٹے سے نئے مکان میں لے آیا تھا جو اُس نے کئی ہزار روپے قرض لے کر بالکل سمندر کے کنارے خریدا تھا، مگر اس وقت اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سمندر کی قربت سلمہ کے لئے اتنی بڑی سوہانِ روح ثابت ہوگی۔)

"مگر کیوں؟" اُس نے پوچھا سلمہ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔

"کیوں کیا؟"

"سمندر سے تم کیوں ڈرتی ہو؟"

محبت کو تہ و بالا کر دیں۔ نہیں، انور پیارے۔ میں تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتی۔" مگر پھر اس عورت نے جو کیمبرج کی پڑھی ہوئی یونانی فلسفہ کی ماہر کے لاشعور میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس کے کان میں گھس پھُسایا، "ہو سکتا ہے یہ کسی اور عورت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ شاید کوئی ڈاکٹرنی جو اُن کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہو۔ شاید کوئی ہسپتال کی نرس۔ یہ نرسیں بھی تو بعض بڑی حسین ہوتی ہیں اور پھر انہوں نے تو ایڈنبرا میں بھی پڑھا ہے۔ وہاں ضرور کسی بھورے بالوں والی انگریز یا سکاٹش لڑکی سے معاشقہ کیا ہوگا۔ اس وقت انہیں اس کی یاد تو نہیں آ رہی؟")

(انور سوچ رہا تھا کہ زندگی کے واقعات کا تسلسل بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ آج سے پچیس برس پہلے اگر اس دن لکشمی نے مست ہو کر راجہ صاحب کے بڑے لڑکے راجندر کا رُخ نہ کیا ہوتا، جو فیل خانے کے باہر کرکٹ کھیل رہا تھا۔ اگر انور کے بابا رمضان علی مہاوت نے راجندر کی جان بچانے کے لئے اپنی جان نہ دی ہوتی، اگر راجہ صاحب نے یتیم انور سے یہ نہ پوچھا ہوتا! کیوں بیٹا تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اور اگر نو برس کے بچے نے نہ جانے کیسے یہ نہ کہا ہوتا کہ 'راجہ صاحب میں تو پڑھنا چاہتا ہوں' تو آج وہ کسی سرکس میں ہاتھیوں کی دیکھ بھال کرتا ہوتا۔ یا کسی اصطبل میں، کسی سیٹھ کے ریس کے گھوڑوں کی مالش کرتا ہوتا اور اس کی ایک تھکی ہوئی مرجھاتے ہوئے جسم کی بیوی ہوتی اور آدھی درجن بچے ہوتے اور حسین سلمہ کا سر آج کسی اور ہی کی آغوش میں ہوتا۔ مگر راجہ صاحب نے مرتے ہوئے مہاوت سے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور انور اسکول سے کالج، کالج سے میڈیکل۔ کالج اور میڈیکل کالج سے ایڈنبرا یونیورسٹی اور لندن کے ہسپتالوں تک ہو آیا تھا۔ اب اس کا شمار ملک کے بہترین نوجوان سرجنوں میں ہوتا تھا مگر لوگ سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر انور علی کے دماغ کا کوئی سکرو ڈھیلا ہے کہ ہزاروں روپے کی پریکٹس کرنے کی بجائے سرکاری ہسپتال میں سات سو روپے ماہوار پر جنرل وارڈ میں پڑے ہوئے مریضوں کے مفت آپریشن کرتا ہے۔

(اور ایک دن اس ہسپتال میں اُس کے پاس سلمہ آئی تھی اپنڈکس کا آپریشن کرانے اور اُس نے کہا تھا میں تو اس آپریشن کے لئے ویٹینا یا جنیوا یا لندن جانے والی تھی، مگر گورنمنٹ ایکسچینج نہیں دیتی۔ آپ کی بڑی تعریف سُنی ہے کہ آپ اپنڈکس کا آپریشن کرتے ہیں تو چوتھے دن مریض خود چل کر گھر چلے جاتے ہیں۔ تو جس نرسنگ ہوم میں آپ کہیں، میں داخلہ لے لوں،' اور ڈاکٹر انور علی نے اُسے بتایا تھا کہ اگر مجھ سے آپ کو آپریشن کرانا ہے تو آپ کو اسی گورنمنٹ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں داخلہ لینا ہوگا اور سر عظیم اللہ مرحوم کی نفاست پسند اور نازک مزاج بیٹی جنرل وارڈ کے خیال ہی سے کانپ اُٹھی تھی اور اُس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ میں مر بھی جاؤں گی لیکن ان گندی مزدوروں اور بھنگنوں کے ساتھ جنرل وارڈ میں نہیں رہوں گی۔ پھر بھی ڈاکٹر انور علی سے معائنہ کروانے میں کوئی،

ہے لیکن اس کا خاندانی ماحول مجھ سے کتنا مختلف ہے۔ وہ سنگِ مرمر کے فرش اور سنگِ سیاہ کے ستونوں والی محل نما عظیم منزل میں پیدا ہوئی اور میں پیدا ہوا راجہ صاحب کرم پور تعلقہ دار کے ہاتھی کے اصطبل میں۔ وہ بچپن میں کھیلی انگریز کمشنر صاحب کے بچوں کے ساتھ اور میں کھیلا راجہ صاحب کے سائیسوں، پانی برداروں، کہاروں کے بچوں کے ساتھ۔" اور اپنا بچپن یاد کرکے وہ آپ سے آپ مسکرایا۔)

"کیوں، کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو؟" سلمیٰ نے انور کے بازو پر سر رکھے ہوئے نظر اٹھا کر پوچھا۔—

"میں سمندر سے ڈرتی ہوں، اسی لئے تم مجھے بے وقوف اور ڈرپوک سمجھتے ہو نا؟ شاید تم مجھے پاگل بھی سمجھتے ہو؟ شاید تم سوچتے ہو ایک دن اس پگلی کے دماغ کا آپریشن کرنا پڑے گا؟"

"نہیں میری جان!"

اس نے سلمیٰ کے گھونگھریالے کٹے ہوئے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"

اور وہ مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بدستور رہی۔

(وہ سوچ رہا تھا۔" میں بھی تم سے کم تھوڑا ہی ہوں۔ تم نے بچپن میں مسوری اور نینی تال میں گھوڑے کی سواری کی ہے تو میں نے ہاتھی کی سواری کی ہے۔ جب تمہارے بابا ولایت میں بیرسٹری پڑھنے کے لئے گئے ہوتے تھے اِن دنوں میرے بابا راجہ صاحب کے مہاوت تھے۔ اُن کی ہتھنی لکشمی اور اس کے نیچے راجہ کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ راجہ کی اور میری ایک ہی عمر تھی۔ جب میں گڈلیاں چلتا تھا۔ اُس وقت سے میں اصطبل میں اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو میرے بابا مہاوت رمضان علی اپنی پیلی پگڑی باندھ کر لکشمی کو راجہ صاحب کی سواری کے لئے تیار کرتے، سنہری جھول پہناتے، چاندی لگا ہودہ کستے۔ تو میں بھی کود کر راجہ پر سوار ہو جاتا اور بالکل جیسے بابا لکشمی کو لوہے کے انکش سے گود کر چلاتے، میں بھی ایک نیم کی ٹہنی کو توڑ کر راجہ کے ماتھے میں چبھوتا اور کہتا۔" چل رے ہاتھی کے بچے، چل چل چل"— پھر کسی دکھ بھری یاد نے اس کی مسکراہٹ کو اُس کے چہرے سے سمیٹ لیا اور انور کی سانولی مگر شفاف پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

(سلمیٰ نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں اپنے شوہر کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں اور برابر سوچ رہی تھی" اپنے خیالات میں کھو کر نہ جانے یہ کہاں چلے جاتے ہیں۔ مجھ سے دور، بہت دور، شاید اپنے ماضی میں، جس کے بارے میں وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ مگر میں ماضی سے ڈرتی ہوں۔ اپنے ماضی سے بھی اور اُن کے ماضی سے بھی۔ اس پُراسرار تہہ خانے کا دروازہ بند ہی رہے تو بہتر ہے۔ ایک بار کھُل گیا تو نہ جانے ماضی کی کیسی کیسی یادوں کے جن اور بھوت آزاد ہو کر ہماری خوشی اور

اور اُن میں سے ہر ایک سے اُس ہی کی دماغی سطح پر بات چیت کی ہے اور تم مجھے "بچی" کہتے ہو۔ اور جس طرح تم مجھے "بچی" کہتے ہو، اُس میں مجھے مذاق کا نہیں رحم اور ہمدردی کا جذبہ معلوم ہوتا ہے، بلکہ ہلکی سی حقارت کا شبہہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تمہاری رائے میں میں کم فہم ہوں۔ ناتجربہ کار ہوں، —— ضدی ہوں۔)

مکان کے باہر اور خود سلمہ کے من کے اندر لہروں کا شور بڑھتا ہی رہا۔

"انور! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"جو تم کہو ——"

"وعدہ کرو کہ یہ مکان چھوڑ دو گے۔ سمندر کے اتنے قریب میں نہیں رہ سکتی۔"

"میری جان! تو دوسرا مکان تلاش کریں گے۔ لیکن سمندر سے تمہیں اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس مجھے سمندر کے خیال ہی سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔"

"بڑی ہی عجیب بات ہے"

مکان کے باہر اور اس کے مَن کے اندر سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ سلمہ کا منہ چڑا رہی تھیں۔ "تم ہم سے بچنے کے لئے اپنے شوہر کی آغوشِ محبت میں چھپ جانا چاہتی تھیں نا۔ مگر ہم نے تمہیں وہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔ تم ہم سے نہیں بچ سکتیں۔ نہیں بچ سکتیں، نہیں بچ سکتیں۔ ہم تمہارے شوہر کو بھی تم سے چھین لیں گے۔ ہم تم دونوں کی محبت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ سمندر کی طاقت بے پناہ ہے۔"

(اور انور سوچ رہا تھا "سلمہ بہت حسین ہے۔ بہت ذہین ہے، بہت اچھی ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کی۔ لیکن کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکیں گے؟ مجھے سمندر کے قریب رہنا اتنا پسند ہے اور اُسے سمندر کی آواز سے بھی ڈر لگتا ہے۔ لاڈ پیار میں پلی ہوئی امیر لڑکیوں کو زیادہ ہی ڈر لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ وہ سر عظیم اللہ کی بیٹی ہے جو ہائی کورٹ کے جج تھے اور جنھوں نے لاکھوں روپے بیرسٹری سے کمائے تھے جنھوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو انگریز نرسیں رکھ کر پالا تھا اور بچپن ہی سے اُسے انگلستان کے اسکولوں میں اور پھر کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم دلوائی تھی۔ سلمہ میں سب اچھائیاں ہیں۔ وہ مجھ سے محبت بھی کرتی

وہ ایسے لگے جیسے دو سہمے ہوئے کبوتر کے بچوں نے باز سے ڈر کر ماں کے پروں میں پناہ لے لی ہو....

(انور نے سوچا کتنے ملائم، کتنے نازک ہیں سلمہ کے ہاتھ۔ ان ہاتھوں نے کبھی ترکاری نہیں چھیلی، کبھی مسالہ نہیں پیسا، کبھی بانوں کے پلنگ نہیں بُنے، کبھی برتن نہیں مانجھے، کبھی کپڑے نہیں دھوئے۔ ان ہاتھوں نے تو پارکر اور شیفر قلم سے فلسفے کے لیکچر نوٹ ہی لکھے ہیں۔ یہ ہاتھ صرف پیانو کے پردوں پر ہی پڑے ہیں۔ ان کی انگلیاں کبھی ستار کی مضراب سے زخمی نہیں ہوئیں۔)

(اور سلمہ نے سوچا انور اتنا بڑا ڈاکٹر ہے لیکن اس کے ہاتھ تو ایسے مضبوط اور کھُردرے ہیں، جیسے کسی لوہار کے ہوں، کسی کانکن یا سڑک کوٹنے والے کے۔ اگر، جب اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اندھیرے میں انور سے ہاتھ ملایا ہوتا اور اُس کے حساس چہرے کی نرم مسکراہٹ نہ دیکھی ہوتی۔ اس کی ہمدردی میں رچی ہوئی آواز نہ سُنی ہوتی۔ اُس کے سلجھے ہوئے دماغ کی تلوار جیسی کاٹ کا زخم نہ کھایا ہوتا۔ تو وہ کبھی ایسے غیر شاعرانہ ہاتھوں میں اپنی زندگی اور محبت نہ سونپتی! مگر کتنی پُر یقین محبت تھی ان سخت ہاتھوں کی گرمی میں۔ کتنی پُرسکون عافیت، کتنا پُرخلوص انداز اور عہد)

ٹھنڈے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ٹھہر گئی۔ دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کی لے پُرسکون ہو گئی، اور انور کی آواز سلمہ کو ایسے لگی جیسے زخم پر کوئی پھایہ رکھ دے (کیوں نہ ہو۔ اس نے سوچا۔ میرا شوہر ڈاکٹر جو ہے)

"کیا ہوا؟ کوئی ڈراونا خواب دیکھا تھا کیا؟"

"خواب نہیں۔ سمندر۔"

"سمندر؟"

"ہاں۔ سمندر مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"لہروں کے شور سے ڈر گئیں؟ تم سچ مچ بچی ہو!"

(سلمہ نے سوچا انور میری جان۔ میرے پیارے شوہر۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تب ہی تو میں نے نہ جانے کتنے رئیسوں، لکھ پتیوں، کرنیلوں، ادیبوں اور شاعروں کو چھوڑ کر تم سے شادی کی ہے۔ مگر خدا کے لئے مجھے "بچی" نہ کہا کرو۔ مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیئس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ میں اکیلی ساری دُنیا گھوم چکی ہوں۔ میں نے بین الاقوامی شہرت کے عظیم ترین فلسفیوں کی کانفرنس میں شرکت کی ہے۔ میری تقریر سُن کر ایک جرمن فلسفی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تم ایشیائی نوجوانوں کے دماغ کتنے سنجیدہ پُرسکون اور سُلجھے ہوتے ہیں۔ تمہارے مقابلے میں ہمارے نوجوان فلسفی تو ضدی بچے لگتے ہیں۔" میں دُنیا کے بڑے بڑے دانشوروں، ادیبوں اور فلسفیوں اور آرٹسٹوں سے مل چکی ہوں۔

انور نے جھک کر اپنی بیوی کی بند آنکھوں کو چوم لیا۔

سلمہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بڑے ہی خوبصورت اور میٹھے اور سُریلے احساس کی نرم نرم لہریں اُس کے اُوپر سے گزر رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی ہستی کو اس احساس کے سپُرد کر رہی ہے۔ وہ نرم نرم لہریں اُس پر سے گزر رہی ہیں۔ وہ ان میں ڈوب رہی ہے، وہ ان میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔

نرم نرم لہریں، اس کے تخیل کے کسی کونے میں، جہاں شعور اور لاشعور کی سرحدیں ملتی ہیں، ایک عجیب سی موسیقی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جیسے شہد کی مکھیاں بھیرویں کا الاپ گنگنا رہی ہوں — نہیں یہ شہد کی مکھیاں نہیں۔ یہ بھڑیں ہیں۔ لاکھوں بھڑوں کی اُفق تک پھیلی ہوئی لہر اور اُن کے ڈنکوں کے میٹھے زہر میں وہ ڈوب رہی ہے اور ڈوب جانا چاہتی ہے۔ مر رہی ہے اور مر جانا چاہتی ہے۔

اور پھر ایک مدھم شور، ماضی کے اُفق سے سرسراتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ سمندر کی اُٹھتی ہوئی لہروں کا شور، نرم نرم ریت پر متواتر پانی کی محبت بھری مار کا شور۔ مگر دیر تک محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی عورت یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ شور اُن کے مکان کے باہر ہے یا خود اُس کے مَن کے اندر ہے۔ شاید یہ میرے برانگیختہ دماغ کا واہمہ ہے۔ اُس نے سوچا۔ شاید میرے عمر بھر کے خوف اور خدشے اس عظیم اور عمیق مسرت کے لمحے میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے یہ شور کر رہے ہیں۔ میں آج ان کی آواز نہ سنوں گی۔ میں اِن سے نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی۔۔۔۔

اس کے دل کی دھڑکن کی لَے تیز ہو رہی تھی — نہیں سنوں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں سنوں گی، نہیں ڈروں گی۔ مگر سمندر کی طوفانی لہروں کی لَے بھی اتنی ہی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ لہریں نرم ریت ہی پر نہیں پھیل رہی تھیں، اب وہ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اُن کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب وہ لہریں خود اُن کے مکان کی دیواروں پر دستک دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں سمندر — اُس کا پُرانا دشمن — جو کب سے اُس کی جان کے درپے تھا، اس کمرے میں آن پہنچے گا اور سلمہ کو، اس کے شوہر اور اُن کے مسرت بھرے اس لمحے کو بہا کر لے جائے گا اور اُن کا گلا گھونٹ کر اپنی ہیبت ناک کالی گہرائی میں ہمیشہ کے لئے سُلا دے گا۔

محبت اور مسرت کے لمحے کی گہرائی سے سلمہ کی چیخ نیم اندھیرے کمرے میں گونجی اور پھر لہروں کے شور میں کھو گئی۔

"سلمہ! میری جان! کیا ہوا؟ ڈر گئیں —؟"

انور نے سرہانے رکھے ہوتے لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی کی اور اُس نے دیکھا کہ سلمہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اُس کی پیشانی پسینے سے چمک رہی ہے اور اُس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے ہیں، اور اس نے ان تھرتھراتے ہوتے نرم اور نازک چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تو

سلمے اور سمندر

"سلمہ۔"

"ہوں ــــ"

"خوش ہو ــــ؟"

"ہوں۔"

"کتنی خوش ہو؟"

"اتنی خوش ہوں،۔۔۔۔۔ اتنی خوش ہوں۔۔۔ کہ بتا نہیں سکتی۔

اور بڑی بڑی کالی آنکھیں جو کاجل کی غیر ضروری لکیروں کے بغیر بھی بہت خوبصورت تھیں، آہستہ آہستہ پلکوں کے پردے میں چھپتی گئیں۔ جیسے غلافی پپوٹے اتنی محبت، اتنی مسرت کا بوجھ نہ سنبھال پاتے ہوں۔

("ایشیائی آنکھیں" جن کے بارے میں ایک نوجوان انگریز شاعر نے ایک "سانیٹ" لکھا تھا۔ جہاندیدہ آنکھیں جنھوں نے لندن کا ویسٹ منسٹر اور روم کا بینٹ ہال اور پیرس میں سونائی زا اور قاہرہ کے اہرام مصر اور نیویارک کے فلک بوس سکائی سکریپر دیکھے تھے مگر جن میں محبت کی میٹھی آگ آج پہلی بار بھڑکی تھی۔

"غلام رسول!"

اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکہ کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔ ایک...... دو...... تین..... چار.... پانچ.....

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل ان سے کتنی ملتی تھی۔ چھ.......... سات....... آٹھ...... نو.....

جیسے وہ ہنس رہے ہوں، اُن کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس..... گیارہ...... بارہ

جیسے وہ کہہ رہے ہوں "جی اساں دے ہاں تو چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دُور سے آئی۔ میں کہتا تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ———— ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دیدی۔

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے۔ میں مرا تھا!

"چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔ بھاگ گیا نہ ڈرپوک کہیں کا۔ مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا۔"

ننھی موہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیص اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اُس نے یہ سُنا۔ وہ بولی "تم بڑے بہادر ہو! شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے۔ وہ تو کوئی بھی پاکستان نہیں گئے۔"

"نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منھ کالا کر گیا۔"

"مُنہ کالا کیوں کرتے وہ تو ہمارے ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لئے بند ہو گئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہو گئی۔ مگر ان بلوائیوں کے لئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہو گیا۔ انھوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہ ہوا۔ جھپٹروں کی آواز — پھر موہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی آواز۔ پنجابی گالیاں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا۔ اس لئے ٹھیک سُنائی نہ دیتا تھا۔

اور پھر — گولی چلنے کی آواز — سردارنی کی چیخ —

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ اور پھر تمام اسکوائر پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور اُن کے سینے کے قریب۔ سفید قمیص خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ اُن کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟ میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا خیالات، محسوسات، تعصبات کی دُنیا کھنڈر ہو گئی تھی۔

"سردار جی یہ تم نے کیا کیا؟"

"مجھے کرجا اُتارنا تھا بیٹا!"

"قرضہ؟"

"ہاں! راول پنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور عزت بچائی تھی۔"

"کیا نام تھا اس کا سردار جی؟"

"غلام رسول۔"

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے۔ یہ کون سے کم لٹیرے تھے، باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے "ٹھہریئے صاحب۔ اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے۔ ہمیں بھی س لوٹ میں حصہ ملنا چاہیئے اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی لوٹ میں امل ہوگئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آرہا ہے۔ کوٹ سوٹ کیس، کوئی میری بیوی بچوں کی صویریں بھی لا رہا ہے اور یہ سب مالِ غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار، زندہ رہا تو تجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انھیں کہیں معلوم ہوگیا کہ میں یہاں ہوں......

"ارے اندر آؤ تو سہی!"

دفعتاً میں نے دیکھا کر سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس ڈھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہوگیا تھا اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی، بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہوگی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا جھجکتا ہوا خاموش۔

"ایتھے نہیں۔ اوس اندر آؤ۔"

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چوندھیائی جا رہی تھی۔

"یہ لو جی۔ اپنی چیزیں سنبھال لو" یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انھوں نے اور اُن کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولی "بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے۔" میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اُس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی چابیاں مل جائیں تو سب معاملہ آسان ہوجاتا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ ممدو نے میری بندوق چُرا کر اپنے چند دوستوں کو دیدی تھی، جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

"کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں، دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھدیں گے۔ بھون کر،"

میں نے کہا "دریا گنج میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہوگی۔ میں تو یہاں ہنتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمّے دار ہوگا؟" میں نے ممدو سے کہا۔

وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لیکر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ اب اُن سے کبھی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے پراوڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔

"ست سری اکال۔۔۔۔ ہر ہر مہادیو"

دُور سے آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح ادھر اُدھر دیکھا۔ جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کُتّے لگے ہوں۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور اُن میں شیشے لگے ہوتے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آ سکتے تھے "ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو۔"

آوازیں اور قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے۔ "شیخ جی! تم ہمارے کوارٹر میں آ جاؤ۔ جلدی کرو۔" بغیر سوچے سمجھے اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چِکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گذر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آ کر رکی اور اس میں سے دس پندرہ نوجوان اُترے۔ اُن کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ کوارٹر مث۔ شیخ برہان الدین۔ اُس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گھر ہستی کی دُنیا میری آنکھوں کے سامنے اُجڑ گئی۔ لٹ گئی۔ کرسیاں، میزیں، صندوق، تصویر، کتابیں، دریاں، قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگریس کے نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہا سبھائی، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دُنیا کو دکھانے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتلِ عام شروع ہو گیا۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دیئے گئے۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دوکانیں لُوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا نئی دہلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا کیونکہ اس دن مجھے پراویڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لئے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اُس نے کہا "یہ کیا کر رہے ہو۔ جاؤ واپس جاؤ۔ باہر نہ نکلنا۔ کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے اسکوائر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مُڈبھیڑ ہو گئی۔ کہنے لگے۔ "شیخ جی فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہوا ہے۔ دل میں تو خوش ہے۔ چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے۔..... مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے بلکہ شاید مجھے چڑھانے کے لئے یہ کہہ رہا ہے کیونکہ سارے اسکوائر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تنِ تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے اِن کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہیئے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے، میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فسادات شروع ہوئے تھے۔ میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

"کیوں حضور! کیا ڈھونڈھ رہے ہیں آپ؟

"یہ میرا وفادار ملازم محمود تھا۔"

"میری بندوق کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے یا چُرائی ہے۔"

"بولتا کیوں نہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

دھلی میں آنے شروع ہوئے تھے۔ اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہوگیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی۔ اس لئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیجدیا۔ اور خود خدا پر بھروسہ کرکے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا، اس لئے میں نے پوری ایک ویگن بک کرالی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اس دن سنا کہ پاکستان جانے والی گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ اس لئے سامان گھر میں ہی پڑا رہا۔

۱۵ اگست کو آزادی کا جشن منایا گیا مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی۔ میں نے چھٹی منائی، اور دن بھر لیٹا ڈآن اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں نام نہاد — آزادی کے چیتھڑے اُڑائے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مِل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قائدِاعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے۔ اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آکر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کردیا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے، امرت سر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو (GOLDEN MOSQUE) کے نام سے دُنیا میں مشہور ہے ...... نہیں وہ تو گردوارہ ہے اور (GOLDEN TEMPLE) کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں، جامع مسجد بھی لال قلعہ ہے۔ نظام الدین اَولیا کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ۔ صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان، پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اُسی دہلی بلکہ کہنا چاہیئے شاہ جہان آباد پر ہندو سامراج کا جھنڈا بُلند کیا جارہا تھا۔ "روئے اب دِل کھول کے اے دیدۂ خُونبار ...... اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا، تہذیب و تمدّن کا گہوارہ تھا، ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اُجڈ اور غیر متمدّن علاقے میں زبردستی بھیجا جارہا ہے۔ جہاں کسی کو شُستہ اُردو زبان بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلواریں جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دِل کو مضبوط، کرکے قائدِاعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہوگی مگر پھر بھی دلی چھوڑنے کے خیال سے دِل مُرجھایا ہی رہا ...... شام کو جب میں باہر نِکلا اور سردار جی نے دانت نِکال کر کہا "کیوں بابو جی! تم نے آج کچھ خُوشی نہیں منائی؟" تو میرے جی میں آئی کہ اُس کی داڑھی میں آگ لگا دوں۔ ہندوستان کی آزادی اور دِل میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر ہی رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آتے ہوئے رِفیوجیز (REFUGEES) کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے اپنے گھربار چھوڑ کر، وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے۔ کانگریسی پراپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں

موت کے منہ سے بچ کر آتے تھے۔ مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے' جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بیوقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نہ جانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دیدی) پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوئی سوکھا سا جواب دیدیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لئے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پوچھ کر آئے کیا بجا ہے"؟" انہوں نے کہلوا دیا "بارہ بج کر دو منٹ ہوتے ہیں"۔ میں نے کہا "بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ" اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بے وقوف بنانے کے لئے سردار جی سے پوچھا "کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟" اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑ کر جواب دیتے "جی اساں دے تاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں"۔ اور یہ کہہ کر خوب ہنسے۔ گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اوّل تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں۔ کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیئے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ چند روز بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور ان کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی' سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی' اچھا ناک نقشہ' بڑی خوبصورت۔ کمبختوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں ان کو گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم ان کی ہمت نہ ہوئی کہ ادھر کا رخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہو گئی۔ راولپنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آتے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پا کر ان پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا—— ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں

نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نا جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں لائم جیوس گلیسرین لگاتا ہوں جو کسی قدر گاڑھے گاڑھے دُودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیوم فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا۔ مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکھڑ پن، بد تمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جُرأت کرتے تھے۔ اب دُنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر پھر یہ سکھ مسلمانوں کے رُعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکاتے، اکڑ اکڑ کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول کہتا اُن کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گزر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کر لیا۔ شادی ہو گئی۔ بچے ہو گئے مگر کتنی ہی مدت کے بعد۔ مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے ـــــ یہ راولپنڈی سے بدلی کرا کر آئے تھے کیونکہ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشن گوئی کے بموجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے اُن کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سورما بنتے تھے، کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے اُن کی ایک نہ بنی۔ اُن کی داڑھیاں مونڈ کر اُن کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی اُن کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسبِ عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جا رہی تھیں، وہ یا تو جعلی تھیں اور یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جوانمردی کی دھاک بیٹھی ہے اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو اُن کا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں اِن لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اُس کی خستہ حالی کو دیکھ کر میرا سینہ عظمتِ اسلام کی رُوح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی، حالانکہ

اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ کبھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ ...... میرے دادا جان ٹھیرے اور پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے، اُن کو ہم دہلی اور یو۔ پی والے پنج، جاہل اور اُجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب و تمدّن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار لٹھ۔ یہ بڑے بڑے لسّی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اسی، تسی، ساڈے، تہاڈے ...... لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انھوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دیدی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ ہی رہنا ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کرلی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا اور لطیفے خوب سُنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا۔ یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سُناتا تھا وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جن کو سُن سُن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات و خصائل، اُن کی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہوگیا تھا۔ بقول غلام رسول کے :۔

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو اُن کی عقل بالکل خبط ہوجاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرت سر کے ہال بازار سے گزر رہے تھے۔ چوراہے پر ایک سکھ کانسٹبل نے روکا اور پوچھا "تمہاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے؟" سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے "جمعدار صاحب ابھی ابھی بجھ گئی ہے، گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔" اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا۔ "چلو بھئی کوئی بات نہیں لائٹ بجھ گئی ہے تو اب جلا لو۔" اور اسی قسم کے سیکڑوں قصے غلام رسول کو یاد تھے اور انھیں جب وہ پنجابی مکالموں کے ساتھ سناتا تھا تو سُننے والوں کے پیٹ میں بل پڑجاتے تھے۔ اصل میں اُن کو سُننے کا مزہ پنجابی ہی میں تھا کیونکہ اُجڈ سکھوں کی عجیب و غریب حرکتوں کے بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اُجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔

سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے تھے جیسا کہ ایک ثبوت تو غلام رسول کا (جس نے سیکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے نمازی مسلمانوں کے جو ہر اٹھوارے جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں، یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے

کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار تھا۔ جب ہندو مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور اُن کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی، صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب، ڈر انگریز سے بھی لگتا تھا اور سکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا۔ ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا کہ اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدّوں پر خوب کودا، باتھ روم کے آئینے میں اُچک اُچک کر اپنا عکس دیکھا۔ سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا۔ روشنیوں کو کبھی جلایا کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلاڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھس آئے۔ اُن کو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفوچکر ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے، کچھے پہنے بیٹھے تھے مگر میں اُن سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف اُن سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ہاں تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا اور انگریزوں سے اُن سے زیادہ۔ مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے جو میں بھی پہننا چاہتا تھا اور ڈیم بلاڈی فول والی زبان بولتے تھے جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تاکہ دنیا مجھے بھی مہذب اور متمدن سمجھے مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا، وہ حقارت آمیز کتنے عجیب الخلقت تھے۔ یہ سکھ جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال منڈانا مگر مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ ابا کے اِس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں۔ میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے۔ ابا کہتے "یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں" مگر ابا تو تھے ہی پرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سنتا تھا۔ اُن کا بس چلتا تو سر پر اُسترا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے....

ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں اور پھر داڑھی، داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابا کی داڑھی جس کو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابا کی جو نکیلی اور چونچ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھتی ہی رہے بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا مل کر بڑھائی جاتے اور جب کئی فٹ لمبی ہو جاتے تو اس میں کنگھی کی جاتے جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں...... عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے

میری موت

لوگ سمجھتے ہیں کہ سردار جی مارے گئے۔

نہیں۔ یہ میری موت ہے۔ پرانے "میں" کی موت۔ میرے تعصبات کی موت۔ اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی؟ یہ بتانے کے لئے مجھے اپنے پرانے مردہ "میں" کو زندہ کرنا پڑے گا۔

میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم اور مسلمان کا خون سستا ہوگیا تو میں نے سوچا واہ ری قسمت پڑوسی بھی ملا تو سکھ۔ حق ہمسائیگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں سکھوں پر ہنستا بھی تھا، ان سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں بچپن سے۔ میں شاید چھ برس کا تھا۔ جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلا پڑا "ارے وہ دیکھو، عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی!" جیسے جیسے عمر گزرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں۔ مثلاً یہ کہ اسے نمونیہ ہوگیا تھا، یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں "اب سے دور کسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہوگیا تھا یا اب سے دور کسی سکھ فرنگی

تو پھر اُس نے ٹیلیفون اٹھایا اور ڈائل گمایا۔

چار۔

صفر۔

چھ۔

آٹھ— ۸-۶---۴

اُدھر سے آواز آئی۔ ”ہیلو! ہم پاگل خانے سے بول رہے ہیں۔“

اور سب انسپکٹر نے کہا۔ ”ارے بھئی، وہ بنارس کا ٹھگ پکڑا گیا۔ ٹھگ وگ نہیں ہے بڈھا بالکل پاگل لگتا ہے۔ سو اُسے بھیج رہے ہیں، کرپا کر کے ابھی داخلہ کر لو۔“

اُدھر سے آواز آئی۔ ”نام؟ نام کیا ہے؟“

سب انسپکٹر نے کہا۔ ”نام ہے کیرا!“ اور فون رکھ دیا مگر مسافر وہاں سے جا چکا تھا۔

ایک بار پھر مُسافر نے جواب دینے سے پہلے توقف کیا ـــ "جی نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا ہو؟"

"انسان ہوں!"

جواب میں ملّا نے دروازہ بند کردیا۔

اور اب رات تھی۔ اندھیرا تھا۔ سنّاٹا تھا۔ برفیلی سرد ہوا تھی اور ایک مسافر تھا۔ بے ٹھکانا۔ اور دُور سے شکاری کُتّوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔

ستاروں کی روشنی میں ایک سفید سفید عمارت جھلملائی۔ پاس ہی چند لوگ الاؤ جلا کر ہاتھ تاپ رہے تھے۔"

"کیوں بھائی یہ عمارت کیا ہے؟ ایک طرف سے مسجد لگتی ہے، ایک طرف سے مندر۔"

"جی یہ مسجد بھی تھی اور مندر بھی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں اسے بنایا گیا تھا کہ ہندو مسلمان سب دھرم والے ایک ہی جگہ اپنی اپنی عبادت یا پوجا پاٹھ کیا کریں۔ پھر اورنگ زیب نے اُسے توڑ کر مسجد بنا دیا۔ بعد میں کسی راجہ نے اُسے مندر بنا دیا۔

"اور اب یہ کیا ہے؟" مسافر نے پوچھا۔

"اب یہ نہ مندر ہے نہ مسجد۔ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بس تو میرے جیسے آدمی کے لئے جو سب کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے۔ جو ہر جگہ ہے اور کہیں نہیں ہے۔ یہی جگہ ٹھیک ہے۔"

ابھی وہ اس عمارت کے باہر ہی تھا کہ شکاری کُتّوں کی آواز قریب آ گئی۔ بہت قریب۔

(٦)

تھانے میں سب انسپکٹر پولیس نے پوچھا ـــ اے بُڈھے تمہارا نام؟"

مسافر نے اپنا نام بتا دیا۔

"کام کیا کرتے ہو؟"

پہلے بُنکر تھا۔ جسے آپ جیسے لوگ جلاہا بھی کہتے ہیں ـــ کپڑا بُنا کرتا تھا اور پریم کے تانے اور گیان کے بانے سے سچائی کی چادر بُننے کی کوشش کرتا تھا۔ پر میرا کرگھا تو کب کا ٹوٹ گیا۔ اُسی کی تلاش میں آیا تھا کہ شاید کسی اور کو مل گیا ہو اور میرا کام کر رہا ہو ـــ مگر آپ نے وقت ہی نہیں دیا۔"

"سچ مُچ پاگل ہے۔" سب انسپکٹر نے اپنے حولدار سے کہا۔ "ابھی بھیجدیتے ہیں، نہیں تو رات کو نہ جانے یہاں کیا گُل کھلائے۔"

اپنے بیٹے کی راکھ کُرید رہا ہے۔
"چلو چلو!" ایک نے کہا۔ "تھانے میں رپورٹ کریں کہ پگلا اِدھر ہی کہیں گھوم رہا ہے۔"
تھانیدار صاحب نے بڑے غور سے اُن کی رپورٹ کو سُنا اور پھر ٹیلی فون اُٹھا کر نمبر ملایا-۸-۶-۲۰۰

(۵)

جاڑے کی رات اندھیری تھی۔ کالے آسمان میں ستارے ایسے جھلملا رہے تھے جیسے جھک کر دیکھنا
چاہتے ہوں۔ نیچے زمین پر کیا ہو رہا ہے۔
ٹھٹھری ہوئی سنسان سڑکوں پر پولیس کے شکاری کُتّے ایک پاگل کی تلاش کر رہے تھے۔ جس
نے ایک دن میں سارے شہر کو تہ و بالا کر دیا تھا۔
ایک اُجاڑ سنسان مندر میں پجاری دروازہ بند کر رہا تھا کہ اُس نے ایک پرچھائیں دیکھی۔
"کون ہے؟" اس نے ڈانٹ کر کہا۔ کیونکہ اُسے ڈر لگ رہا تھا۔
"میں ایک مسافر ہوں۔ رات کے لئے ٹھکانا چاہتا ہوں۔ آگیا ہو تو مندر میں لیٹ رہوں؟"
"کون جات ہو؟"
"منشیہ جات ہوں، مہاراج!"
"وہ جاتی ہم نہیں جانتے۔۔۔ دھرم کیا ہے؟ ہندو تو ہو نا؟"
مسافر نے کئی پل سوچ کر گزارے۔ پھر بولا۔۔۔ "نہیں مہاراج، میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔
میں ہندو نہیں ہوں۔"
"پھر کیا ہو؟"
"انسان!"
"تو پھر جاؤ۔۔۔ انسانوں کا کوئی مندر کھوجو۔"
اور مسافر وہاں سے چل کھڑا ہوا۔
مسجد کا مُلا عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے حُجرے میں جا رہا تھا کہ اُس نے دیوار کے پاس ایک
سایہ دیکھا۔
"اے کون ہے؟"
"میں ہوں۔۔۔ ایک مسافر!"
"کیا چاہتے ہو؟"
"رات بھر کے لئے ٹھکانا۔ بہت تھک گیا ہوں مولوی جی۔"
"تم کون ہو؟ مسلمان ہو نا؟"

مسافر نے دیکھا کہ لکڑی کے ایک بڑے ڈھیر پر ایک چتا جل رہی ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں ہے کیونکہ سب بینڈ باجے والی ارتھی کو دیکھنے چلے گئے ہیں۔ اس نے ایک پل کے لئے کچھ سوچا اور اس کے بعد دبے پاؤں جلتی چتا کے پاس گیا اور وہاں بوڑھے کے لڑکے کی لاش کو جلنے کے لئے رکھ دیا۔ چند ہی لمحوں میں ایک کے بجائے دو لاشیں جل رہی تھی۔

بوڑھے نے کہا۔ "دھنیہ واد بھائی" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اُس کے رونے کی آواز سُن کر موت کے کئی ٹھیکیدار اُدھر دوڑ کر آتے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایک لاش کو بغیر فیس دیئے جلایا گیا تو انھوں نے لاٹھیاں سنبھال لیں۔

"کس نے بے اجازت یہ لاش اس چتا پر رکھی؟"

"میں نے!" مسافر نے کہا۔

"تو نکالو اکیاون روپے" ایک نے کہا۔

دُوسرے نے یاد دلایا — "اور پچیس نئے پیسے!"

پیسے ہمارے پاس نہیں ہیں"! مسافر نے کہا۔

"تو پھر ہم اس لاش کو چتا پر سے اُٹھا کر دریا میں بہا دیں گے۔"

مسافر نے بڑی نرمی سے کہا — "وہ اب بھی مُردہ ہے اور جب بھی مردہ رہے گا۔ جلنے نہ جلنے سے اُس کی آتما کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا مگر اس کے بوڑھے باپ کو دُکھ ہوگا —" اور پھر اُس کی آواز میں ایک سختی کا انداز آگیا۔ "سو میں یہ نہ ہونے دوں گا" اور وہ چتا اور موت کے ٹھیکیداروں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

"تمہیں بھی اس آگ میں جھونک دیں گے بڑے میاں۔"

"جھونک دو۔ میں اب جلنے، ڈوبنے، مرنے کے خطروں سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکا ہوں۔ مگر تم میں سے کم از کم ایک کو میں اپنے ساتھ اس آگ میں گھسیٹ لے جاؤں گا۔"

ٹھیکیل اس کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی نے چلا کر کہا — "ارے اس کے پاس نہ جانا۔ یہ تو پاگل ہے۔ بڑا خطرناک پاگل ہے۔ اسی نے آج بازار میں سیٹھ کروڑی مل بھوڑی مل کا دوشالا اُتار لیا۔ اب سُنا ہے سارناتھ میں جا کر بھگوان بدھ کی مورتی توڑ ڈالی۔ پولیس اور پاگل خانے والے سارے شہر میں اُس کی ڈھنڈیا مچا رہے ہیں۔ ایک اور آدمی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی یہی سُنا ہے۔ پاگل آدمی کا کیا ٹھیک، آگ میں کُود پڑے اور ساتھ کسی اور کو بھی لے مرے۔ میں نے تو سُنا ہے پولیس شکاری کتے لے کر اُس کا پیچھا کر رہی ہے۔" سو ٹھیکیل پیچھے ہٹ گئے اور بوڑھے کے نوجوان بیٹے کی لاش جل گئی اور جب چتا کے شعلے مدھم پڑے تو سب نے دیکھا کہ وہ پگلا غائب ہے اور بوڑھا اکیلا کھڑا

اب وہ دونوں گھاٹ کے کنارے ایک جگہ پہنچے، جہاں لوہے کے کٹہرے کے پاس لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"اے اے!" ایک پانڈا چلاتا ہوا آیا "تم لوگ اِدھر کیسے آ گئے؟ یہ راجوں مہاراجوں کے کریا کی جگہ ہے۔ یہاں انتم سنسکار کرنے کے پانچ سو روپے ہوتے ہیں۔"

"پانچ سو روپے!" مسافر نے دہرایا۔ "موت بھی اتنی مہنگی ہو گئی ہے!"

"ہاں ہاں، جانتے ہو، یہ چندن کی لکڑی ہے۔ راجوں مہاراجوں کے لئے منگائی جاتی ہے۔ جاؤ اُدھر کے گھاٹ پر جاؤ۔"

مگر دوسری طرف دوسرے پہرہ دار کھڑے تھے۔ موت کے محل کے چوکیدار۔

"چالیس روپے کی تو لکڑی ہی آ ئے گی۔" ایک نے کہا — "روپے نکالو۔"

"پانچ روپے کا گھی۔" دوسرے نے ہاتھ بڑھایا۔

"پانچ روپے پنڈت کو دان" تیسرے نے اپنی مٹھی کھولی۔

"کل پچاس روپے ہوں گے۔" چوتھے نے حساب بتلا دیا۔

"مگر سوا روپیہ ٹھیکدار کو دینا ہو گا۔"

"ٹھیکدار!" مسافر نے حیرت سے کہا۔ "کیا کسی نے موت کا ٹھیکہ بھی لیا ہوا ہے؟"

"ہاں، ہاں، ٹھیکیدار کو سوا روپے دیئے بنا یہاں کوئی کریا نہیں کر سکتا۔"

دوسرے نے کہا۔ "اکیاون روپے اور پچیس نئے پیسے نکالو۔"

تیسرے نے کہا — "نہیں دیں تو گھر کا راستہ لو۔"

چوتھے نے لاٹھی پٹختے ہوئے کہا۔ "چلو جلدی کرو۔ دھندے کا ٹائم ہے۔"

اور بوڑھا جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا جاری تھی۔ اُس نے مسافر کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، جو تھا وہ اس کی دوا دارو پہ لگا دیا۔"

اتنے میں کسی امیر آدمی کی ارتھی آئی۔ سیکڑوں آدمی ساتھ میں بینڈ باجہ، ہار پھول۔ لگتا تھا کسی کی برات ہے۔

موت کے سب ٹھیکیدار اُدھر بھاگے۔

اب یہ تین اکیلے رہ گئے۔

مسافر۔

بوڑھا،

اور بوڑھے کے جوان بیٹے کی لاش۔

مسافر آگے چلا تو ایک اور پنڈا اُسے ملا۔ وہ بولا — "مہاراج لگتا ہے، آج ہی آپ اس پوتر بھومی میں پدھارے ہیں۔ چلو تمھیں گنگا جی میں اشنان کروا لاؤں!"

مسافر نے پوچھا — "کیوں، گنگا میں اشنان کرنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"جیون کے سب پاپ دُھل جاتے ہیں۔ ایک بار گنگا اشنان کرو گے، سیدھے سورگ میں جاؤ گے۔"

مسافر نے ایک پل سوچ کر جواب دیا — "کیوں شریمان، جو کوئی بھی گنگا نہاتے وہ سچ مچ سورگ میں جاتا ہے؟"

پنڈے نے کہا — "بالکل سیدھا سورگ میں جاتا ہے!"

اور مسافر بولا — "تو پھر تو سب دھوبی اور دریا کے سب مچھوے سیدھے سورگ جانے چاہئیں!"

"پاگل ہے بیچارہ۔" پنڈے نے سوچا اور کسی اور شکار کی تلاش میں چل پڑا۔ گھومتے گھومتے مسافر اب شمشان گھاٹ پر پہنچ گیا — جہاں اُس نے دیکھا کہ لکڑی کے ڈھیروں پر چتائیں جل رہی ہیں۔ اُن پر گھی اور تیل ڈالا جا رہا ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ برہمن اشلوک پڑھ رہے ہیں۔ مرنے والے کے رشتہ دار برہمنوں کو دان دے رہے ہیں۔

مسافر نے ایک آدمی سے پوچھا جو جلتی ہوئی لکڑیوں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ "کیوں بھائی کیا حال ہے؟"

"دھندا بڑا مندا ہے آجکل بھائی!"

مسافر نے پوچھا — "کون سا دھندا؟"

"یہی کریا کرم کا دھندا۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے مرنا ہی کم کر دیا ہے۔ کہاں دس برس پہلے روز سو ڈیڑھ سو لاشیں آتی تھیں۔ اب مشکل سے پچیس تیس آتی ہیں۔ پہلے سارے دیش کے کونے کونے سے لوگ یہاں مرنے آتے تھے۔ اب اَدھرم پھیل رہا ہے اور کتنے ہی لوگ اپنے گھر میں مرنا ہی پسند کرتے ہیں۔"

مسافر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "بڑا افسوس ہے بھائی۔ پھر بھی بھگوان پر بھروسہ رکھو وہ سب کا پالن ہار ہے۔"

اتنے میں مسافر نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اکیلا اپنے بازوؤں پر کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کوئی ارتھی کو کندھا دینے والا نہیں ہے۔

مسافر نے بوڑھے کے پاس جا کر کہا — "تم تھک گئے ہو گے، لاؤ لاش کو مجھے دیدو!"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لاش کو مسافر کے سپرد کرتے ہوئے وہ بولا۔ "ذرا سنبھال کے بھائی۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔" اس کے لئے وہ اب تک "ہے" تھا، "تھا" نہیں ہوا تھا۔

اب وہ دونوں گھاٹ کے کنارے ایک جگہ پہنچے، جہاں لوہے کے کٹہرے کے پاس لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"اے اے!" ایک پانڈا چلاتا ہوا آیا "تم لوگ اِدھر کیسے آ گئے؟ یہ راجوں مہاراجوں کے کِریا کی جگہ ہے۔ یہاں انتم سنسکار کرنے کے پانچ سو روپے ہوتے ہیں۔"

"پانچ سو روپے!" مسافر نے دہرایا۔ "موت بھی اتنی مہنگی ہو گئی ہے!"

"ہاں ہاں، جانتے ہو، یہ چندن کی لکڑی ہے۔ راجوں مہاراجوں کے لئے منگائی جاتی ہے۔ جاؤ اُدھر کے گھاٹ پر جاؤ۔"

مگر دوسری طرف دوسرے پہردار کھڑے تھے۔ موت کے محل کے چوکیدار۔

"چالیس روپے کی تو لکڑی ہی آ جائے گی۔" ایک نے کہا — "روپے نکالو۔"

"پانچ روپے کا گھی۔" دوسرے نے ہاتھ بڑھایا۔

"پانچ روپے پنڈت کو دان" تیسرے نے اپنی مٹھی کھولی۔

"کل پچاس روپے ہوں گے۔" چوتھے نے حساب بتلا دیا۔

"مگر سوا روپیہ ٹھیکدار کو دینا ہوگا۔"

"ٹھیکیدار!" مسافر نے حیرت سے کہا۔ "کیا کسی نے موت کا ٹھیکہ بھی لیا ہوا ہے؟"

"ہاں، ہاں، ٹھیکیدار کو سوا روپے دیئے بِنا یہاں کوئی کِریا نہیں کر سکتا۔"

دوسرے نے کہا۔ "اکیاون روپے اور پچیس نئے پیسے نکالو۔

تیسرے نے کہا — "نہیں ہیں تو گھر کا راستہ لو۔"

چوتھے نے لاٹھی پٹختے ہوئے کہا — "چلو جلدی کرو۔ دھندے کا ٹائم ہے۔"

اور بوڑھا جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا جاری تھی۔ اُس نے مسافر کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں، جو تھا وہ اس کی دوا دارو پہ لگا دیا۔"

اتنے میں کسی امیر آدمی کی ارتھی آئی۔ سیکڑوں آدمی ساتھ میں بینڈ باجہ، ہار پھول۔ لگتا تھا کسی کی برات ہے۔

موت کے سب ٹھیکیدار اُدھر بھاگے۔

اب یہ تین اکیلے رہ گئے۔

مسافر۔

بوڑھا،

اور بوڑھے کے جوان بیٹے کی لاش۔

مسافر آگے چلا تو ایک اور پنڈا اُسے ملا۔ وہ بولا — "مہاراج لگتا ہے، آج ہی آپ اس پوتر بھومی میں پدھارے ہیں۔ چلو تمہیں گنگا جی میں اشنان کروا لاؤں!"

مسافر نے پوچھا — "کیوں، گنگا میں اشنان کرنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"جیون کے سب پاپ دُھل جاتے ہیں۔ ایک بار گنگا اشنان کرو گے، سیدھے سورگ میں جاؤ گے۔"

مسافر نے ایک پل سوچ کر جواب دیا — "کیوں شریمان، جو کوئی بھی گنگا نہاتے وہ سچ مچ سُورگ میں جاتا ہے؟"

پنڈے نے کہا — "بالکل سیدھا سُورگ میں جاتا ہے!"

اور مسافر بولا — "تو پھر تو سب دھوبی اور دریا کے سب کچھوے سیدھے سورگ جانے چاہئیں!"

"پاگل ہے بیچارہ۔" پنڈے نے سوچا اور کسی اور شکار کی تلاش میں چل پڑا۔ گھومتے گھومتے مسافر اب شمشان گھاٹ پر پہنچ گیا۔ جہاں اُس نے دیکھا کہ لکڑی کے ڈھیروں پر چتائیں جل رہی ہیں۔ اُن پر گھی اور تیل ڈالا جا رہا ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ برہمن اشلوک پڑھ رہے ہیں۔ مرنے والے کے رشتہ دار برہمنوں کو دان دے رہے ہیں۔

مسافر نے ایک آدمی سے پوچھا جو جلتی ہوئی لکڑیوں کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ "کیوں بھائی کیا حال ہے؟"

"دھندا بڑا مندا ہے آجکل بھائی!"

مسافر نے پوچھا — "کون سا دھندا؟"

"یہی کریا کرم کا دھندا۔ نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ لوگوں نے مرنا ہی کم کر دیا ہے۔ کہاں دس برس پہلے روز سو ڈیڑھ سو لاشیں آتی تھیں۔ اب مشکل سے پچیس تیس آتی ہیں۔ پہلے سارے دیش کے کونے کونے سے لوگ یہاں مرنے آتے تھے۔ اب ادھرم پھیل رہا ہے اور کتنے ہی لوگ اپنے گھر میں مرنا ہی پسند کرتے ہیں۔"

مسافر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "بڑا افسوس ہے بھائی۔ پھر بھی بھگوان پر بھروسہ رکھو وہ سب کا پالن ہار ہے۔"

اتنے میں مسافر نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اکیلا اپنے بازوؤں پر کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کوئی ارتھی کو کندھا دینے والا نہیں ہے۔

مسافر نے بوڑھے کے پاس جا کر کہا — "تم تھک گئے ہو گے، لاؤ لاش کو مجھے دے دو!"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لاش کو مسافر کے سپرد کرتے ہوئے وہ بولا — "ذرا سنبھال کے بھائی۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔" اس کے لئے وہ اب تک "ہے" "تھا"، تھا نہیں ہوا تھا۔

"اے مسٹر!"

"ابی سنئے تو!"

"ارے او...!"

"اے.....!"

اور اس آخری "اے" میں اتنا زور تھا کہ مسافر ٹھٹک کر رک ہی گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی سفید کرتا دھوتی اور اونی بنڈی پہنے، بالوں میں تیل ڈالے، ماتھے پر چندن لگائے اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

"کیا ہے بھائی؟"

"تم بنارس میں آج ہی آئے ہو لگتا ہے! کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں ہمیشہ سے بنارس ہی میں رہتا آیا ہوں، مگر اس وارانسی میں آج پہلی بار آیا ہوں۔"

"کیا ہے وہاں؟"

"ارے بھگوان کے درشن ہوں گے۔"

"کیوں بھگوان یہاں نہیں ہیں کیا، وہاں قید کر رکھا ہے کسی نے؟"

"ارے نہیں، وہاں شیو بھگوان کی مورتی ہے، اس کے درشن کرنا پوجا کرنا۔"

مسافر نے کہا۔ "اگر پتھر پوجنے سے ہی بھگوان ملتا ہے تو چکی کی پوجا کیوں نہ کروں جو آٹا پیس کر انسانوں کا پیٹ بھرتی ہے۔"

"ارے نہیں، یہ پتھر کی نہیں سونے کی مورتی ہے۔ مندر کے کلس پر چھبیس من سونا چڑھا ہوا ہے۔"

"مجھے بھگوان کی مورتی نہیں دیکھنی۔ نہ پتھر کی نہ سونے کی۔ میں تو بھگوان کو ہر روز، ہر گھڑی، ہر پل دیکھتا ہوں۔"

چکنے بالوں والا سمجھا، یہ بڈھا اس سے مخول کر رہا ہے۔ سو وہ بولا۔ کیوں بڑے میاں بھلا بھگوان کو کہاں کہاں دیکھا ہے تم نے؟"

مسافر نے جواب دیا۔ "میں نے بھگوان کو گلی میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ میں نے بھگوان کو پھٹی قمیص پہنے سردی میں ٹھٹھرتے دیکھا ہے۔ میں نے بھگوان کو شراب خانے میں دیکھا ہے۔ وہ شراب میں ہے، شراب کی بھٹی میں بھی ہے وہی شراب بناتا ہے وہی پلاتا ہے، وہی پیتا ہے، وہی صراحی ہے، وہی پیالہ ہے، وہی متوالا ہے۔"

مسافر ابھی بول ہی رہا تھا کہ وہ چکنے بالوں والا گھبرا کر وہاں سے چلتا بنا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ باپ رے میں بھی کس پگلے کے پلے پڑ گیا۔

اُونی کپڑا بچھا رکھا ہے، تاکہ اس کا بدن ٹھنڈے پتھر کو نہ لگے۔ جہاں اس کے ہاتھ زمین پر آتے تھے، وہاں کی دونوں طرف ایک ایک اُونی کپڑے کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے، تاکہ بھکشو کے ہاتھوں کو بھی ٹھنڈے فرش کو نہ چھونا پڑے کتنا خیال تھا اُس بھکشو کو اپنے آرام کا، مگر وہ برابر اپنی کسرت کئے جا رہا تھا۔ جھکتا، زمین پر منہ کے بَل اوندھا لیٹتا، پھر اُٹھتا، پھر جھکتا۔ اور تمام عرصے کوئی دعائیں بڑبڑاتا رہا اور مسافر کو ایسا لگا کہ یہ ایک بھکشو نہیں ہے بلکہ پوجا کرنے کی ایک مشین ہے جو بٹن دبانے پر اُٹھک بیٹھک کرنے لگتی ہے۔

اور اُسے ایسا لگا کہ یہ بھکشو اپنی ریاکارانہ عبادت سے بھگوان بُدھ کی ہتک کر رہا ہے۔ اُن کا، اُن کی پَوِتر آتما کا منہ چڑا رہا ہے اور اُس نے ایک ہی وار میں بھکشو کے سامنے سے وہ گدیاں گھسیٹ لیں اور اس بار بھکشو سجدے میں گیا تو اُس کا ماتھا دھڑ سے ٹھنڈے سخت پتھر پر لگا اور ایک پَل میں اُس کی تپسیا، اُس کی شردھا اور اُس کی پوجا اور اس کی اہنسا کا بھرم کھُل گیا اور مسافر کو مارنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑا مگر اس عرصے میں مسافر نے مورتی استھان کے پاس سے گھڑیال بجانے کی ایک لوہے کی موگری اُٹھالی تھی اور اُس سے وہ مورتی پر چڑھے ہوئے پیلی دھات کے خول کو توڑ رہا تھا۔ بُدھ کو سونے کی قید سے آزاد کر رہا تھا۔

کتنے ہی بھکشو، پہرے دار یاتری مسافر کے پیچھے دوڑے لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہ آیا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا اور جب اُس کا پیچھا کرنے والے مندر سے باہر نکل کر بھاگے تو انہوں نے دیکھا کہ دروازے کے دونوں طرف جو سنگِ مرمر کی تختیاں لگی تھیں، جن پر چندہ دینے والے سیٹھوں کے نام اور اُن کے چندے کی رقمیں لکھی ہوئی تھیں، اِن کو کوئی پاگل اس طرح چکنا چُور کر گیا ہے کہ اب نہ سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل کا نام پڑھا جاتا ہے اور نہ اُن کی دان کی ہوئی سو روپے کی رقم۔

”بالکل پاگل ہے مہاراج“ بھکشوؤں نے مندر کے مینیجر کو رپورٹ کی جو اپنے رجسٹر میں دان کی رقموں کا حساب کتاب لکھ رہا تھا اور پہرے دار بولا ـــ بڑا خطرناک پاگل ہے مہاراج، مُورتی پر چڑھے ہوئے سونے کو ٹکڑے کر گیا اور خود اس میں سے ایک ٹکڑا بھی اٹھا کر نہ لے گیا ـــ بالکل پاگل، مہاراج!“

اور مندر کے مینیجر نے ”بدھم شرنم گچھامی“ کہہ کر ٹیلی فون اُٹھایا اور ڈائل گھمایا۔ ۸-۶-۰-۰-۹

(۴)

”مہاراج!“ ایک آواز آئی مگر مسافر نے مُڑ کر نہ دیکھا۔

”شریمان!“ وہی آواز پھر آئی مگر اب بھی اس نے ادھر کوئی توجہ نہ کی۔

بازار میں شام کے وقت بہت بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا ـــ ہو سکتا ہے کسی اور ہی کو آواز دے رہا ہو۔

”او بھائی صاحب!“

بنانے کے لئے چندہ دیا تھا۔"

مسافر نے بڑبڑا کر کہا — "تو انہوں نے چندہ مہاتما بدھ کے لئے نہیں دیا تھا، دھرم کے لئے نہیں دیا تھا۔ اِس مندر کے لئے نہیں دیا تھا۔ سنگِ مرمر کی سِل پر اپنا نام لکھوانے کے لئے دیا تھا۔"

اور وہ یہ کہہ کر اندر داخل ہوا اور اُس نے دیکھا کہ وہ مہان آتما جس نے دُنیا کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مُکتی دی تھی، وہاں ایک پیلی دھات سے بنائے ہوئے خول میں قید تھا۔

بھکشو نے کہا — "اس مورتی پر آٹھ من سونے کا خول چڑھا ہوا ہے۔"

اور مسافر نے جواب دیا — بڑی طاقت ہے سونے کی جو بدھ جیسی آزاد آتما کو بھی اپنے پنجے میں جکڑ سکتی ہے۔" مگر یہ بات اس بھکشو کی سمجھ میں نہ آئی۔

پھر مسافر نے دیکھا کہ چاروں طرف بھدّی بھدّی تصویریں بنی ہوئی ہیں، جن میں مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف منظر پیش کیے گئے ہیں۔

بھکشو نے کہا — "یہ تصویریں جاپان کے ایک مہان کلاکار نے اپنی شردھا سے بنائی ہیں۔ پورے چار برس لگے تھے اُسے یہ کام پورا کرنے میں۔ وہ دیکھو کونے میں جاپانی آرٹسٹ کا پورا نام پتہ لکھا ہوا ہے۔"

اور ایک یاتری نے مسافر سے کہا — "صرف چار برس۔ پھر بھی آرٹسٹ کو اپنا نام پتہ لکھنے کی اتنی فکر تھی اور اجنتا ایلورا کے غاروں میں دیکھو۔ ایک ایک غار کو اُس کے مجسموں اور تصویروں کو مکمل کرنے میں ڈھائی ڈھائی سو سال لگے اور کلاکاروں کی کئی کئی نسلوں نے ایک کے بعد ایک اس لافانی آرٹ کو تخلیق کیا۔ پھر بھی کسی نے ایک جگہ بھی اپنا نام نہیں لکھا۔ اسے کہتے ہیں سچی شردھا۔ سچی کلا۔"

مسافر نے یہ بات بڑے غور سے سنی۔ پھر وہ بولا "نام کے لئے لوگ سب کچھ کرتے ہیں۔ بدھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔"

مگر اِس عرصہ میں وہ بھکشو دوکان پر کھڑا تصویریں اور مورتیاں اور کتابیں بیچ رہا تھا۔ اب مسافر نے دیکھا کہ ایک اور بھکشو ہے جو بدھ کی مورتی کے سامنے بار بار سجدہ کر رہا ہے۔

اور اُس نے سوچا — "مگر بدھ نے تو کہا تھا، میری مورتی نہ بنانا اور یہ بھی کہا تھا کہ کسی کی مورتی کے آگے ماتھا نہ ٹیکنا۔"

مگر وہ بھکشو منہ ہی منہ میں کوئی دُعا بڑبڑا رہا تھا اور ہر بار سارے بدن کو زمین پر گرا کر ماتھا ٹیک رہا تھا۔ پہلے تو مسافر نے سمجھا کہ وہ کوئی ورزش کر رہا ہے اور اُس نے ایک یاتری سے کہا بھی — "یہ مندر ہے کہ اکھاڑا؟" مگر یاتری نے کہا "ش ش بھکشو مہاراج پوجا کر رہا ہے۔ بھگوان بدھ کی مورتی کی۔"

اور اب مسافر نے دیکھا کہ اس بھکشو نے سنگِ مرمر کے ٹھنڈے فرش پر دو بالشت چوڑا تہ کیا ہوا

یہ کہہ کر انھوں نے پاس رکھا ہوا ٹیلی فون اُٹھایا اور ڈائل گھمایا ـــــ ۸-۶-۰۰-۴

(۳)

مگر مسافر وہاں سے بہت دور سارناتھ کے کھنڈروں میں گھوم رہا تھا۔ جہاں نہ سیٹھ آتے ہیں نہ مولانا۔ نہ موٹروں میں گھومنے والے منتری۔ یہاں خاموشی تھی، سکون تھا۔ ماضی کی دُھول پر چلتے ہوئے پیروں کی آواز بھی نہ ہوتی تھی۔

بڑی دیر تک مسافر عجائب گھر میں بھگوان بدھ کی مورتی کے سامنے کھڑا رہا اور گوتم کا ابھے مدرا اُسے جیسے دلاسہ دیتا رہا۔ اور پتھریلی آنکھیں جنھوں نے دنیا کے غم کی تہہ کو پا لیا تھا، اُس سے بہت کچھ کہتی رہیں اور اُسے ایسے محسوس ہوا کہ وہ تمسخر ہوئے پتھریلے ہونٹ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”اے مسافر جس راستے پر تم چل رہے ہو اُس سے ہم بخوبی واقف ہیں کیونکہ یہی ہمارا مارگ تھا۔ پر آج اس مارگ پر کون چلتا ہے۔ تمہارا پتھ بھی تو سُونا پڑا ہے۔ ہمارے تمہارے راستے کی دُھول پر تو صدیوں کے بعد کسی بھولے بھٹکے کے نقشِ قدم ملتے ہیں۔“

اور مسافر کی نگاہوں نے خاموشی کی زبان سے کہا ـــــ ”مجھے شکتی دو۔ مجھے شانتی دو ـــــ شاکیہ منی۔ میں بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہوں۔“

اور گوتم کے ہونٹوں نے بن کھلے کہا ـــــ ”تم واپس نہیں آئے۔ تم کہیں گئے نہیں تھے۔ تم لوگوں کے من میں سو گئے تھے اور اب اُن کے من میں تم جاگ گئے ہو۔ تم یہیں تھے، اور یہیں رہو گے۔ تم یہاں ہو اور ہر جگہ ہو۔ جیسے میں یہاں ہوں، وہاں ہوں اور ہر جگہ ہوں۔ ہم ہر جگہ ہیں اور ہر وقت ہیں مگر خاص کر ہم آج ہیں اور یہاں ہیں۔“

”پر شاکیہ منی۔ آج جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس سے میں بہت دُکھی ہوں۔“

اور گوتم کی آنکھوں نے خاموشی سے کہا ـــــ ”دُکھ کیا ہے؟ سُکھ کیا ہے؟ کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ ہیں وہ ہمارے کرم ہیں، ہمارا عمل ہے اور آج تم نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ تمہارے بندوں میں سنگیت ہی نہیں شکتی بھی ہے۔“ اور اب مسافر نے دیکھا کہ وہ پتھریلی آنکھیں اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہیں ـــــ

پھر وہ گھومتا ہوا نئے بنے ہوئے بدھ مندر کی طرف چلا آیا اور اندر جاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ سنگِ مرمر کی سِلوں پر سیٹھوں، رئیسوں کے نام کھدے ہیں اور اُن میں سیٹھ کروڑی کی کچوڑی مل کا نام بھی ہے، جس کا دوشالہ آج اُس نے چھینا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے مندر کے ایک بھکشو سے پوچھا۔

اور پیلی کفنی پہنے ہوئے بھکشو نے کہا ـــــ ”یہ اُن دانیوں کے نام ہیں جنہوں نے اِس مندر کو

مگر دُوسرے نے کہا۔ "مجھے تو کبیر پنتھی لگتا ہے۔ یہ شبد تو کبیر کے جیسے ہیں۔"

تیسرے نے کہا "نہیں جی، کبیر پنتھی آج کل کبیر کے ایسے شبدوں کو کب یاد کرتے ہیں۔"

چوتھے نے کہا۔ "میں تو کہتا ہوں کوئی پاگل ہے پاگل بیچارہ۔"

پانچویں نے کہا۔ مگر خطرناک پاگل ہے جو ایسے خطرناک بھجن گاتا ہے۔"

چھٹے نے کہا۔ بے چارہ گا ہی تو رہا ہے۔ کچھ کر تو نہیں رہا۔"

ساتویں نے کہا۔ تم کیا جانو۔ ایسے شبد آگ لگا دیتے ہیں۔"

آٹھویں نے کہا — ایسے شبد تو وہ زہریلے ناگ ہیں جن کے کاٹے کا کوئی منتر ہی نہیں۔"

اور اتنے میں کوئی چلّایا — "دیکھو دیکھو وہ پگلا کیا کر رہا ہے؟"

سب نے مڑ کر ادھر دیکھا کہ مسافر نے سیٹھ جی کا دوشالہ گھسیٹ کر ایک سائیکل رکشا والے کو دیدیا جو ایک پھٹی قمیص اور نیکر میں کھڑا ٹھٹھر رہا تھا اور دوشالہ پاتے ہی وہ رکشا والا پیڈل مارتا ہوا بکٹٹ ہو لیا اور ابھی سیٹھ جی ہائے واویلا کر ہی رہے تھے کہ مولانا جو مسجد سے واپس ہو رہے تھے دفعتہ چلّا پڑے " ارے میرا چوغہ، پکڑو پکڑو، چور میرا چوغہ لے بھاگا۔" مگر اتنے میں مسافر نے وہ اُونی چوغہ بھکارن کو دے دیا اور وہ اُس میں اپنے بچے کو لپیٹے سرپٹ بھاگی جا رہی تھی، اور اب سب مسافر کی تلاش کر رہے تھے اور مسافر وہاں سے غائب ہو گیا تھا۔

مولانا کی داڑھی غصّے کے مارے ہل رہی تھی اور وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ جیسے اسمِ اعظم کا وِرد کر رہے ہوں "یا مظہر العجائب" ابھی وہ مردُود یہاں تھا، اور ابھی غائب یا مظہر العجائب۔ ابھی وہ مردود یہاں تھا اور ابھی غائب!"

ایک نے کہا۔ دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے۔ سیٹھ جی اور مولانا کو تھانے میں رپورٹ کرنی چاہیئے۔ چور فوراً پکڑا جائے گا۔"

دوسرے نے کہا۔ "چور نہیں جی ٹھگ تھا۔ آنکھوں میں دُھول جھونک کر دوشالہ اُڑا کر لے گیا۔"

تیسرے نے کہا۔ "بھئی شکل و صورت سے تو ٹھگ نہیں لگتا تھا۔ سیدھا سادا بڈھا تھا کوئی۔"

دوسرے نے جواب دیا۔ "بنارس کے دیکھنے میں ایسے ہی بھولے بھالے لگتے ہیں۔ ضرور وہ کوئی ٹھگ ہی تھا۔"

چوتھے نے کہا۔ پھر میرے خیال میں بھی وہ ٹھگ یا چور نہیں تھا ورنہ وہ چیزیں چُرا کر وہ خود لے جاتا۔ دوسروں کو کیوں دیتا۔ ضرور وہ پاگل ہے!"

اور سیٹھ جی کی توند مولانا کی داڑھی کی طرح غصّے کے مارے ہل رہی تھی، بولے — "پر یہ پاگل پن بڑا کھترناک ہے جی۔ دو چار ایسے پاگل ہور آ گئے تو ہمارا دھندہ ہی سُسرا بند ہو جاوے گا۔"

مونچھ منڈا نوجوان اُونی ولایتی سوٹ اور کوٹ، اُونی موزے مفلر اور دستانے پہنے منہ سے دُھواں نکالتا اپنی موٹر کی طرف جا رہا ہے۔ ایک لمبی چوڑی موٹر جس پر جھنڈا لگا تھا، قریب سے گذر گئی اور مسافر کو اس میں صرف ایک سفید ٹوپی کی جھلک نظر آئی اور پاس کھڑے ہوئے کسی راہ گیر نے کہا "دیکھا تم نے چاروں طرف شیشے چڑھے ہوئے ہیں کہ کہیں منتری جی کو چھینک نہ آجائے۔"

اور پھر ایک اُس سے بھی لمبی موٹر آئی اور ایک ساڑھیوں کی دکان پر رُکی اور اُس میں سے اُتر کر ایک موٹا تازہ آدمی اندر آگیا اور اُس کی کالی کالی انگلیوں پر انگوٹھیوں کے ہیرے ایسے چمکے جیسے رات کے وقت گندی نالی کے بدبودار پانی میں ستاروں کا عکس جھلملاتا ہے۔ کسی نے کہا۔ "پہچانا تم نے، یہ ہیں سیٹھ کروڑی مل بچوڑی مل کالے بازار میں انہوں نے ایک کروڑ کمایا ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ کا مندر بنایا ہے اور اب اپنی سپتری کو پانچ لاکھ کا جہیز دینے والے ہیں۔ اس کے لئے ساڑھیاں خریدنے آتے ہیں۔ اسپیشل ساڑھیاں بنوائی گئی ہیں۔ ایک ایک پانچ پانچ سو کی، کیا سمجھے؟"

مسافر کچھ نہیں سمجھا۔ اُس نے صرف اتنا دیکھا کہ بھکارن دیوار سے لگی سردی کے مارے کانپ رہی ہے اور اُس کی گود کے بچے کا چہرہ اور بدن نیلا پڑتا جا رہا ہے۔

اور اسی وقت قریب کے ایک مندر میں بھجن شروع ہوگیا۔

جے جے رام کرشن ہرے۔ جے جے رام کرشن ہرے۔

اور مسافر کو نہ جانے کیا ہوگیا کہ وہ بھی زور زور سے بھجن گانے لگا۔ مگر یہ اُس کا اپنا بھجن تھا اور بازار کے سب لوگ اُس کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ کیونکہ یہ آواز جو اُن کو اپنے مَن کی لگتی تھی، انہوں نے صدیوں سے نہیں سُنی تھی۔ مسافر گا رہا تھا۔

اے بھگوان - یہ کیسا تیرا دربار
جہاں ہے ظلم کی بھرمار
رنگ محل میں بسیں مسخرے
عیش کریں سب چور لٹیرے
مُورکھ کو سب کہیں گیانی
گیانی کو سب کہیں گنوار
کوئی اوڑھے شال دوشالہ
اور کوئی ننگا بیچ بازار — یہ کیسا تیرا دربار
یہ کیسی سرکار رے بھگوان — یہ کیسی سرکار

یہ سُن کر کسی نے کہا — "ضرور کوئی کمیونسٹ ہے۔"

"تو اس کو ہوٹل وہوٹل کیا کہتے ہیں ـــــ یہ تو بھگوان کا مندر ہوا۔ اور مندر میں کوئی بھی مسافر بھگوان کا مہمان ہو سکتا ہے۔"

منیجر ہنس کر بولا ـــــ مگر جو دیوتا اس ہوٹل کا مالک ہے، وہ کرایہ مانگتا ہے۔ ہر کمرے کا چالیس روپیہ روز کرایہ۔ اتنا روپیہ ہے تمہارے پاس؟" اور مسافر غصے سے بولا ـــــ "تو پھر اس جگہ کا مالک بھگوان نہیں کوئی شیطان ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں جاتا ہوں!"

اور یہ کہہ کر وہ وہاں سے جلدی جلدی قدم بڑھاتا چلا گیا اور اُس کے جانے کے بعد منیجر نے بیرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیسے کیسے پاگلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔"

اور بیرے نے کہا ـــــ "صاحب، یہ تو کوئی خطرناک پاگل ہے۔ ابھی میں نے دیکھا وہ امریکن میم صاحب کو تنگ کر رہا تھا۔ وہ اپنا سیرا ہے نا، اُس کا ناگ چھین کر بھاگنے والا تھا۔"

"تو پہلے کیوں نہیں بولا۔ ایسا پاگل لوگ ہمارے ہوٹل کے آس پاس گھومے گا تو ٹورسٹ لوگ اِدھر آنا بند کر دے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور ڈائل گھمایا۔ ۸-۶--۰--۴-

(۲)

اور اب مسافر بازار کی بھیڑ میں سے چلا جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا میرے زمانے میں تو آبادی اتنی نہیں تھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اپنے شہر میں اتنی رونق ہے۔ راستے میں اس نے بنارسی ساڑھیوں، اور کمخواب کی دوکانیں دیکھیں۔ اُس نے سوچا کیا نفیس کپڑا آج بھی ہمارے کرگھوں پر بُنا جا رہا ہے ـــــ دوکانیں رنگ برنگی ساڑھیوں اور مختلف قسم کے تھانوں سے اَٹی پڑی تھیں۔ اس نے سوچا، اب تو اپنے شہر کی ہر عورت بنارسی ساڑھی پہن سکتی ہے۔ کمخواب کا لہنگا یا پائجامہ سلوا سکتی ہے۔ دوسری دوکانوں پر اُس نے دیکھا کہ ہر قسم کا اُونی کپڑا بھی بھرا پڑا ہے۔ اُس نے سوچا جاڑے کا انتظام اچھا ہے یہ سب ترقی کے آثار ہیں۔ ورنہ ہمارے زمانہ میں تو اس موسم میں روئی کے دگلے پہنے جاتے تھے۔

مگر جب اس نے بازار کی طرف رُخ کیا اور چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا تو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب پھٹے پُرانے، میلے کپڑے پہنے کیوں گھوم رہے ہیں۔ دوکانوں میں کئی لاکھ بنارسی ساڑھیوں کا ڈھیر ہے اور سڑک پر کھڑی بھکارن ایک چیتھڑے میں اپنا اور اپنے بچے دونوں کا بدن کو ڈھانکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہاتھ گاڑی کو ڈھکیلتے ہوئے دو دُبلے دُبلے مزدور جا رہے ہیں اور اُن کے بدن پر پھٹے ہوئے سُوتی کُرتوں اور میلی دھوتیوں کے سوا کچھ نہیں اور وہیں قریب کی دوکان پر ایک لالہ جی پشمینے کا دوشالہ پہنے انگیٹھی پر ہاتھ سینک رہے ہیں اور ایک مولوی صاحب کشمیری سنہری کام کا اونی چوغہ پہنے سر پر بیس گز کا عمامہ باندھے مسجد کی طرف جا رہے ہیں اور ایک داڑھی

اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک شبہ کی چمک آئی۔ "اے تو بھی سپیرا ہے کیا؟"

مسافر نے کہا ــــ "میں سپیرا نہیں ہوں۔ پر تو یہ کیا کر رہا تھا وہ بے چاری فرنگی عورت مر جاتی تو؟"

"ارے مُورکھ اژدہے کے دانت نہیں ہیں۔ اس کو گلے میں ڈال کر میم صاحب تو صرف تصویر کھنچوا رہی تھی۔ چل اپنا راستہ لے۔ پاگل کہیں کا" اور پھر اُس نے فرنگی عورت کی طرف دیکھ کر انگلی سے اپنی کھوپڑی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "میم صاحب، اولڈ مین، اسکرو لوز، نو مائنڈ، پاگل مین نادو پائی ستھن میک نو میم صاحب۔ صاحب ٹیک پکچر۔ اونلی ٹو روپی۔"

اور اب مسافر ہوٹل کے منیجر سے بات کر رہا تھا۔

"کیا میں اس سرائے میں ٹھہر سکتا ہوں؟"

"یہ سرائے نہیں ہوٹل ہے!"

"اچھا تو اب سرائے کو ہوٹل کہتے ہیں۔ میں یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"جی میں تو یہیں رہتا ہوں، اور یہاں سے اتنی دور بھی رہتا ہوں کہ کوئی اِس فاصلہ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔"

منیجر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ پھر اس نے اپنے رجسٹر میں لکھے ہوئے سوالوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ آپ نے سفر کیسے کیا؟ مطلب یہ کہ آپ یہاں آئے کیسے؟ ریل سے؟"

"جی نہیں!"

"بس سے؟"

"جی نہیں!"

ہوائی جہاز سے؟"

"جی نہیں ــــ یا یوں سمجھیے، جی ہاں ــــ آپ میرے سفر کو ہوائی جہاز کا سفر کہہ سکتے ہیں!"

"آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"جی سامان۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی!"

"تو آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے!"

"تم اس سرائے کے، یعنی ہوٹل کے۔ مالک ہو کیا؟"

"نہیں منیجر ہوں!"

"تو مالک کون ہے؟"

"اس کے مالک ہیں بھگوان کاشی دوار کا ناتھ بھنجم۔"

وارانسی ۔ ورانسی ۔

مگر جب مسافر نے راہ گیر سے پوچھا ـــ “بھائی یہ کونسا شہر ہے ؟” تو جواب ملا . . . .
“بنارس ۔”

اور مسافر جواب تک حیران و پریشان، کھویا کھویا ہوا گھوم رہا تھا، یک بیک اُس کے چہرے پر ایک عجیب خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں نہ جانے کتنی پُرانی یادیں جاگ اُٹھیں۔ اُس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب معصوم مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے بچہ گھر آکر ماں سے کہہ رہا ہو ـــ ماں، میں آگیا ۔”

مسافر بہت دُور سے آیا تھا ـــ مگر اُس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہیں تھے ۔ اُس کے گھر کے دھلے گاڑھے کے کپڑوں پر راستے کی کوئی گرد نہیں تھی ۔ اس کے پاس نہ بستر تھا، نہ ٹرنک، نہ ناشتہ دان، نہ صراحی، نہ پانی کا لوٹا، نہ پانی کی لٹیا ۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا کر چل رہا ہے ۔

مسافر کو ٹھہرنے کے لیے جگہ چاہیئے تھی ۔ راستے میں اُس نے کسی راہ چلتے سے پوچھا ـــ “بھائی یہاں بھولی بھٹیارن کی ایک سرائے ہوا کرتی تھی ۔”

جواب ملا ـــ “سرائے تو یہاں کوئی نہیں ـــ البتہ ایک مسلم مسافر خانہ ہے ۔”
“اور جو مسلمان نہ ہوں وہ کہاں ٹھہرتے ہیں ؟”
“ہندوؤں کے لئے کئی دھرم شالائیں ہیں ۔”
“اور جو نہ ہندو ہوں، نہ مسلم ہوں ؟”
راہ گیر نے ایک ہوٹل کی طرف اشارہ کر دیا ۔

باہر بورڈ لگا تھا، جس پر لکھا تھا ـــ “ہوٹل وارانسی ـــ وارانسی” اور مسافر یہ سوچتا ہوا اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ آخر یہ وارانسی دوبارہ کیوں لکھا گیا ہے، کہ اُس نے دیکھا کہ ایک کالا ناگ پھن پھیلائے اُس کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ گھبرا کر وہ ایک طرف کو ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ ایک اَدھ ننگی جوان فرنگی عورت کھڑی ہے اور اُس کے گلے اور سینے اور کولھوں کے گرد ایک بھیانک اژدہا لپٹا ہوا ہے اور ایک داڑھی والا مداری کھڑا کہہ رہا ہے ـــ “پائی تھن میم صاحب ۔ پائی تھن ۔ نو میک فیر ۔ میم صاحب ۔ ٹیک پکچر ۔ اونلی ٹو روپی ۔” اور مسافر جو یہ بھاشا نہیں سمجھتا تھا سمجھا کہ یہ سپیرا اس فرنگی عورت کو اژدہے سے ڈسوا رہا ہے ۔ اور اس نے لپک کر اژدہے کو دونوں ہاتھوں سے کھینچا اور زور سے زمین پر پٹخ دیا ۔
فرنگی عورت اپنی بھاشا میں کچھ چلائی ۔

سپیرے نے مسافر کو گردن سے پکڑ لیا ـــ “اے بُڈھے، یہ کیا کرتا ہے ؟ میرا کام خراب کر دیا ۔”

بنارس کا ٹھگ

(۱)

ریل کے اسٹیشن پر لکھا تھا ——— وارانسی (VARANASI)
پولیس کے تھانے کے باہر لکھا تھا ——— وارانسی ———
ہسپتال کے دروازے پر بورڈ لگا تھا ——— وارانسی
شراب کی دکان پر لکھا تھا ——— وارانسی ———
افیون گانجہ اور چرس کی دوکان پر لکھا تھا ——— وارانسی
کتابوں کی دوکان پر، جہاں کوک شاستر کھلے عام بک رہی تھی، لکھا تھا وارانسی ——— اوشدھالیہ
پر جہاں سدھ مکردھوج خریدنے کے لئے بھیڑ لگی تھی، لکھا تھا ——— وارانسی ——— حکیم حاذق الملک
کے دارالشفا پر لکھا تھا ——— وارانسی
پنجراپول پر لکھا تھا ——— وارانسی
گئو شالہ پر لکھا تھا ——— وارانسی
پاگل خانہ پر بورڈ لگا تھا ——— وارانسی
اور ڈاک خانہ میں چٹھیوں پر کھٹا کھٹ مہریں لگائی جا رہی تھیں ——— وارانسی ——— وارانسی ———
وارانسی ——— جیسے ہتھوڑے کی چوٹ پڑتی ہے۔ جیسے طبلے پر تھاپ پڑتی ہے وارانسی۔ وارانسی

پُوجا کرنی چاہیئے۔"

اور عورت نے کہا "شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیئے۔ میں اس سارے شہر میں پھری مگر کسی نے مجھے رات بھر کے لئے آسرا نہیں دیا۔ سوائے تمہارے سب محلوں کے سب بنگلوں کے دروازے بند تھے۔ میرے لئے کھلا تھا تو صرف تمہاری جھونپڑی کا دروازہ۔ اب میں ہر برس تمہارے ہاں آیا کروں گی دیوالی پر۔"

گنگا نے کہا۔ "بہن تم کل سویرے چلی جاؤ گی تو ہم تمہیں یاد کیسے کریں گے؟ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟"

اور اس کا جواب سن کر وہ سب بڑی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اس عورت نے کہا: "میں میں تم لوگوں کے پاس رہتی ہوں ـــ میں اِن کھیتوں کے پاس رہتی ہوں جہاں لکھو بھیا کے بابا اناج اُگایا کرتے تھے اور میں اس کارخانے میں بھی رہتی ہوں جہاں لکھو بھیا مشینوں سے کپڑا بنتے ہیں۔ جہاں کہیں انسان اپنی محنت سے اپنی ضروریات پیدا کرتا ہے۔ میں وہیں رہتی ہوں اور دیوالی کی رات کو میں ہر اُس گھر میں پہنچ جاتی ہوں۔ جہاں ایک چراغ میں بھی مجھے اِنسانیت اور سچی محبت جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"

تھوڑی دیر جھونپڑی میں سناٹا رہا۔ اب اس اکلوتے ننھے سے دیئے کی روشنی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ جھونپڑی کا کونا کونا جگمگا اٹھا تھا اور دور سیٹھ لکشمی داس کے محل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ شاید کرنٹ اور جنریٹر دونوں فیل ہو گئے تھے اور بابو لکشمی کانت کی بالکنی کے سارے دیئے بھی تیل ختم ہو کر بجھ گئے تھے۔

دیوی!" گنگا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اور اس عورت نے مسکرا کر جواب دیا "لکشمی۔"

عورت زمین پر پڑے آرام سے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی تھی۔ "نہیں بھائی، تم بیمار ہو۔ تم کھاٹ پر سوؤ۔ میں تو دھرتی ہی سے نکلی ہوں۔ دھرتی ہی سے مجھے سُکھ آرام ملتا ہے۔"

گنگا نے کہا "لگتا ہے شہر میں پہلی بار آئی ہو۔ کہو دیوالی کی روشنیاں دیکھیں؟"

"ہاں۔" عورت نے تھکی ہوئی سی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "دیوالی کی روشنیاں بھی دیکھیں، دیوالی کا اندھیرا بھی دیکھا۔"

گنگا اس کا مطلب نہ سمجھی۔ لکھو بھی کھاٹ پر پڑا سوچتا رہا۔ یہ عورت تو کوئی بڑی ہی انوکھی باتیں کرتی ہے اور اس نے دفعتاً محسوس کیا کہ جیسے اس کی چھاتی پر سے کھانسی کا بوجھ آپ سے آپ اُتر گیا ہو وہ جو سات دن سے کھاٹ پر پڑا تھا، بے سہارا اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا "گنگا آج تو مجھے بھی بھوگ لگی ہے نکال کھانا مہمان کے لئے بھی۔"

گنگا نے ہانڈی چولھے پر سے اُتارتے ہوئے شرمندہ ہو کر کہا "بھات تو ہے مگر ساتھ کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ نہ جانے تم سوکھا بھات کھا بھی سکو گی بہن؟"

"تم میری فکر نہ کرو۔" عورت نے اپنی گٹھری سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے پاس سب کچھ ہے۔ دراصل یہ میں تمہارے لئے ہی لائی تھی۔"

"ہمارے لئے؟ پر تم تو ہمیں جانتی ہی نہیں تھیں۔"

"میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں بہن۔ لکھو بھائی کو بھی، لچھمن اور مینا کو بھی۔"

یہ کہہ کر اُس نے گٹھری کھولی تو کھانے کی خوشبو سونگھ کر بچے اُس کے پاس آ گئے۔

"اس میں کیا ہے؟" لکھو نے کھاٹ سے اُتر کر چولھے کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

عورت نے ایک ایک چیز نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی۔

"یہ دیسی مکئی کی روٹیاں مکھن لگی ہوئی۔ یہ ہے چنے کا ساگ، یہ ہے گاؤں کا اصلی گھی، یہ ہے دیوالی کی مٹھائی۔ اصلی کھوئے کے پیڑے۔ یہ ہے دہی، اور اِس لٹیا میں بچوں کے لئے گائے کا دودھ ہے۔ شہر کی طرح پانی مِلا نہیں ہے۔"

اور یہ سُن کر سب ہنس پڑے۔ مگر اتنا بہت کھانا دیکھ کر لکھو کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ روٹی کا لقمہ بناتے ہوئے بولا "یہ سب ہو تو پھر آدمی کو اور کیا چاہئے؟"

وہ کھانا کھاتے جا رہے تھے اور اس انجانی عورت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ جو نہ جانے کہاں سے اُن کے لئے یہ ساری نعمتیں لے کر آ گئی تھی۔

کھانا کھا کر وہ سب آرام سے بیٹھے تب گنگا نے کہا "بہن آج تمہاری بدولت ہماری دیوالی ہو گئی۔"

اور لکھو ہنس کر بولا "نہیں تو دیوالہ ہی دیوالہ تھا۔ تمہارا شکریہ کیسے ادا کریں بہن۔ ہمیں تو تمہاری

تھی وہ بھی نہیں دی تھی۔ کہہ دیا تھا " دیوالی کے بعد آنا' آج کے دن ہم لکشمی کو گھر سے باہر نہیں نکالتے " اتنے میں اُس کے دونوں بچے باہر سے بھاگتے ہوئے آئے۔ بڑا سات برس کا تھا لچھمن' اور چھوٹی چار برس کی تھی مینا۔

لچھمن بولا " ماں' ماں سیٹھ جی کے محل میں اِتنے دیئے جل رہے ہیں کہ لگتا ہے رات نہیں دن ہے اور ایک دیا تو اِتنا بڑا ہے کہ سب اُسے دیوی کا سمراٹ بولتے ہیں "

اور مینا نے بھنک کر کہا " ماں بھوک لگی ہے "

مگر لچھمن نے اُسے ڈانٹ دیا۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کہتا ہوں ماں ہمارے یاں ایک ہی دیا کیوں جل رہا ہے؟

اِس لئے بیٹا کہ ہم غریب ہیں۔ تیل کے پیسے نہیں کہ اور دیئے جلا سکیں "

اور کھانستے ہوئے لکھو نے کھاٹ پر سے آواز دی " اری تو پھر یہ دیا بھی بجھا دے۔ اِس جھونپڑی میں اندھیرا ہی ٹھیک ہے "۔

" ہائے رام " گنگا جلدی سے بولی ـــــ دیوالی کی رات کو دیا بجھا دوں ؟ اندھیرے میں دیوی لکشمی نہیں آئے گی۔"

لکھو اتنی زور سے چلّایا کہ پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ مگر کھانستے کھانستے بھی وہ بولتا گیا۔" دیوی سیٹھ لکشمی داس کے محل میں جائے گی۔ لکشمی چند کے گھر نہیں آئے گی ـــ نہ بجھا چراغ ـــ تھوڑی دیر میں تیل ختم ہو جائے گا تو آپ سے آپ ہی بجھ جائے گا۔"

لچھمن جو کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا چلّایا ــ " بابا۔ بابا۔ دیکھو ہمارے دیئے کی لَو آپ سے آپ اُونچی ہوتی جا رہی ہے۔"

" پاگل ہوا ہے بے " لکھو اُسے ڈانٹ ہی رہا تھا کہ یہ دیکھ کر اچنبھے میں رہ گیا کہ باہر رکھے ہوئے دیئے کی روشنی اب جھونپڑی میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔

دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔

گنگا نے دروازہ کھولا تو دیئے کی روشنی میں دیکھا' ایک عورت کھڑی ہے۔

"کیا ہے بہن ؟"

" ایک رات کہیں ٹھیرنے کا ٹھکانہ چاہیے۔ بڑی دُور سے آئی ہوں۔"

" تو اندر آؤ نا۔"

وہ عورت دروازہ میں سے اندر آئی تو اس کے ساتھ ہی چراغ کی روشنی بھی اندر آ گئی۔

لکھو نے کہا " ہمارے پاس تو بس یہی جھونپڑی ہے۔ ہوگی تو تکلیف' مگر اتنی رات گئے اور کہاں جاؤ گی۔ کھاٹ بھی ایک ہی ہے مگر میں اپنا بستر اُدھر زمین پر کر لوں گا۔"

ہوجائے گی اور جب سیٹھ اس کو پکڑوانے کی دھمکی دے گا تو بغیر کچھ لئے دیئے اُس کے انکم ٹیکس کے رٹرن پاس کرنے ہوں گے۔

"جاؤ دوسرا گھر دیکھو" اس نے عورت کی جوانی کا آخری بار جائزہ لینے کے بعد ایک اور ٹھنڈی سانس بھری اور دروازہ بند کر دیا۔

"کون تھا؟" لاجو رسوئی سے چلائی۔

"کوئی نہیں۔"

"کوئی نہیں تھا تو اتنی دیر کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

"میرا دماغ مت کھاؤ۔ کوئی بھکارن تھی؟"

بھکارن تھی تب ہی اتنی دیر تک میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے، میں تمہیں خوب.....

ایک بار پھر گھنٹی بجی۔

دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"جاؤ لگتا ہے پھر تمہاری بھکارن آئی ہے"۔ بیوی نے حکم دیا۔

لکشمی کانت نے دروازہ کھولا تو سفید وردی پہنے ایک ڈرائیور ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا سنہری ڈبہ لئے کھڑا تھا۔

"سیٹھ لکشمی داس نے دیوالی کی مٹھائی بھیجی ہے۔"

لکشمی کانت ڈبہ لے کر اندر آیا تو لاجو نے جلدی سے ڈبہ لے لیا اور ڈرائیور سے چلا کر بولی "اچھا بھائی سیٹھ جی سے ہمارا نمستے کہنا اور دیوالی کی مبارکباد۔

دروازہ بند کر کے لکشمی کانت کمرے میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ بیوی نے پھر ڈانٹا۔" ارے یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جلدی سے دیوں میں تیل ڈالو۔ اُن کی روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔

تیسرا دیا:-

دیا صرف ایک تھا جو جھونپڑی کے سامنے ٹمٹما رہا تھا۔ دیئے میں تیل بھی بہت کم تھا۔

اندر کھاٹ پر لکھو پڑا تھا۔ اس کا نام کبھی لکشمی چند ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے چل کر شہر آیا تھا مگر مل میں اور جھونپڑیوں کی بستی میں اُسے لکھو ہی لکھو کہتے تھے۔ غریب مزدور کو اور خصوصاً جب وہ بے کار ہو اور بیمار بھی ہو، بھلا کون لکشمی چند کہہ سکتا تھا۔

اُس کی بیوی گنگا ایک کونے میں بنے ہوئے چولہے پر بھات پکا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی کہ بچوں کو بھات کے ساتھ ساتھ کھانے کو کیا دوں۔ بارہ آنے گھر میں تھے۔ اس کی وہ لکھو کی دوا لے آئی تھی۔ مالکن نے کھڑے کھڑے نکال دیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اُس نے دیوالی کی چھٹی مانگی تھی۔ پندرہ دن کی پگار باقی

مگر جب اس نے دروازہ کھولا تو سیٹھ جی کا ملازم نہیں ہے۔ ایک عورت کھڑی ہے۔ عورت صورت سے گنوار لگتی تھی۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے تھے۔ سر پر ایک میلے سے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری تھی مگر تھی جوان اور خوبصورت، لکشمی کانت نے دل ہی میں سوچا۔ جوانی اور خوبصورتی پر بھی اِنکم ٹیکس لگنا چاہیئے۔

مگر اُونچی آواز سے اس نے پوچھا "کیوں، کیا چاہیئے؟"

"بابوجی! بڑی دور سے آئی ہوں۔ گھر لوٹنے کا سمے نہیں رہا۔ ایک رات کو ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے تو بڑی کرپا ہوگی۔ میں کہیں کونے میں پڑ رہوں گی۔"

لکشمی کانت نے ایک بار پھر اس عورت کی جوانی کا جائزہ لیا پھر مڑ کر کن آنکھیوں سے رسوئی کی طرف دیکھا جہاں اس کی بیوی بیٹھی پوریاں تل رہی تھی۔ لاجو موٹی تھی۔ اس کے منہ پر چیچک کے نشان تھے مگر وہ جہیز میں دس ہزار نقد لائی تھی۔ اس کے سب رشتہ داروں نے مبارکباد دے کر کہا تھا۔ لکشمی کانت سچ مچ تیرے گھر میں تو لکشمی آئی ہے۔

لکشمی کانت نے اپنی بیوی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں پوریاں بیلنے کے لیے جو لکڑی کا بیلن تھا، اور پھر ہلکی سی ٹھنڈی سی سانس لے کر اس انجانی عورت کی طرف مخاطب ہوا:

"آئی کہاں سے ہو؟"

"بڑی دُور سے آئی ہوں بابوجی، مگر اس وقت تو سیٹھ لکشمی داس کے ہاں سے آئی ہوں۔"

"کیوں سیٹھ جی نے تمہیں نکال دیا...؟"

"ہاں بابوجی، یہی سمجھو نکال ہی دیا۔"

"اور وُہاں سے تم سیدھی یہاں چلی آئیں۔"

"ہاں بابوجی!"

لکشمی کانت نے کتنے ہی جاسوسی ناول پڑھے تھے اور اُسے معلوم تھا کہ اگر کوئی سرمایہ دار کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا ہتھیار کوئی ایسی عورت بھی ہو سکتی ہے۔

"تو سیٹھ جی نے مجھے یہ دیوالی کی بھینٹ بھیجی ہے؟" اس نے دانت بھینچ کر کہا۔

"اس گٹھری میں کیا ہے؟"

"اس میں مکئی کی روٹی ہے بابوجی، چنے کا ساگ ہے اور گاؤں کا اصلی گھی ہے اور دُودھ ہے۔ دہی ہے۔"

"بس بس رہنے دو۔" اُسے یقین تھا کہ یہ سب بکواس ہے۔ جاسوسی ناولوں کے مطابق اِس گٹھری میں زیور ہوگا۔ نشان لگے ہوئے نوٹ ہوں گے۔ رات کو یہ گٹھری اس گھر میں چھوڑ کر یہ عورت چمپت

چلّا کر کہا۔ ”انجینیر جنریٹر تیار رکھو۔ دیئے بجھنے نہ پائیں۔ الیکٹرک انجینیر بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا، “سیٹھ جی کرنٹ بالکل ٹھیک آرہاہے۔ ویسے جنریٹر بھی تیار ہے۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے۔“

“گھبراؤں کیسے نہیں؟“ سیٹھ جی کا دل نہ جانے کیوں ایک عجیب بے چینی سے دھڑک رہا تھا۔ جانتے نہیں دیوالی کی رات ہے؟ ایک پَل کو بھی اندھیرا ہوگیا اور وہی دیوی کے آنے کا سمے ہوا اور دیوی روٹھ کر کہیں اور چلی گئی ـــــ تو ـــــ تو ـــــ؟

دوسرا دیا:۔

انکم ٹیکس افسر لکشمی کانت تیل کی بوتل لے کر اپنے فلیٹ کی بالکنی میں نکلا تو اس نے دیکھا کہ سامنے سیٹھ لکشمی داس کا محل بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔

“ہاں کیوں نہ ہو!“ اس نے سوچا کروڑوں روپیہ بلیک کا جو موجود رکھا ہے۔ دس ہزار کیا دس لاکھ بجلی کے بلب لگا سکتا ہے۔“

پھر اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی بالکنی کی منڈیر پر جو سو دیئے اس نے سجا رکھے ہیں، اُن میں سے ایک دیئے کی لَو دھیمی ہوتی جارہی ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ “کہیں دیا بجھ نہ جائے، شگون ہی بُرا نہ ہوجائے!“ اور جلدی سے اس نے بوتل کا تیل دیئے میں اُلٹ دیا۔ دیا سلائی سے لو بھی اُوپر کی تو اُسے ایسا لگا کہ نہ صرف اس دیئے کی بلکہ سو کے سو دیئوں کی روشنی ایک دم سے تیز ہوگئی۔

دھنیہ ہو، دیوی“ اُس نے دیوار پر لکشمی کی تصویر کے آگے پرنام کرتے ہوئے کہا “اِس برس تو تمہاری بڑی کرپا رہی ہے۔“

پھر اُس نے کرسی پر آرام سے بیٹھ کر اپنا جاسوسی ناول اٹھایا جو ختم کے قریب تھا اور جس کا ہیرو اس وقت ڈاکوؤں کی سنہری ٹولی کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو رسوئی میں سے اس کی بیوی چلائی “۔ اجی او۔ ذرا دیکھنا تو کون ہے؟“

“منگو سے کہو نا دیکھے کون ہے“ اس نے ناول سے نظر اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

“منگو کو میں نے بازار بھیجا ہے، مٹھائی لانے“ رسوئی سے آواز آئی۔

“تو گنگا کو بھیجو!“ گنگا اُن کے یہاں برتن مانجھنے پر ملازم تھی اور صبح شام کام کرنے آتی تھی۔

“گنگا مُردار تو آج چھٹی منا رہی ہے۔ کہتی تھی بائی ہماری بھی آج دیوالی ہے۔ آج ہم کام نہیں کریں گا۔ سو میں نے بھی چڑیل کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔

گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

“اچھا، اب تم ہی اُٹھ جاؤنا ـــــ ضرور سیٹھ جی کے ہاں سے مٹھائی آئی ہوگی۔“

“کیا صرف مٹھائی ہی آئی ہے یا کچھ اور؟“ اُس نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ دیکھتے رہو کہ روشنی زیادہ ہوتی رہے۔ ایک پل کے لئے بھی کم نہ ہو۔"

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب برآمدے کی سنگِ مرمر کی سیڑھیاں اُتر کر باغ کی طرف آرہے تھے۔ جہاں ہر پیڑ کی شاخوں میں جگمگاتے ہوئے "بلب" جھول رہے تھے۔ کہ انھوں نے ایک عورت کو سڑک پر کھڑا دیکھا ـــــ

عورت گاؤں سے آئی لگتی تھی۔ اس کے بدن پر میلا گھاگرا تھا۔ جس کا رنگ کبھی لال رہا ہوگا اسی رنگ کی چولی تھی اور سر پر اوڑھنی تھی۔ وہ بھی موٹے لال کھدر کی مگر چھپی ہوئی۔ اپنے سر پر وہ میلے کچیلے چیتھڑے میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری اٹھائے ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے نہ صرف میلے تھے بلکہ پھٹے پرانے پیوند بھی لگے تھے۔

"کوئی غریب بھکارن ہوگی" سیٹھ لکشمی داس نے دل میں سوچا۔

"کیوں مائی کیا چاہیئے؟" انھوں نے سیڑھیاں اُترتے پوچھا اور قریب جانے پر انھوں نے دیکھا کہ عورت غریب سہی مگر جوان ہے اور رنگت سانولی ہونے پر بھی خوبصورت ہے۔

"ایک رات کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیئے، سیٹھ جی بڑی دور سے آئی ہوں۔"

"نا بابا معاف کرو" وہ جلدی سے بولے۔ من ہی من میں انھوں نے سوچ لیا تھا کہ ایک انجانی غریب جوان عورت کو رات بھر کے لئے گھر میں رکھنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے راتوں رات گھر میں سے روپیہ پیسہ یا زیور سونا چُرا کر بھاگ جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے بلیک میل کر کے روپیہ وصول کرے۔ سیٹھ جی کا لڑکا جوان تھا۔ وہ کہیں اس انجانی عورت کے چکر میں نہ آجائے۔

پھر بھی انھوں نے سوچا دیوالی کی رات ہے۔ کسی بھکارن کو دھتکارنا بھی نہیں چاہیئے ـــ

"بھوکی ہو تو کھانا کھلوائے دیتا ہوں۔ لڈو، پوری جو جی چاہے کھاؤ۔"

"میں بھکارن نہیں ہوں سیٹھ جی۔"

اس نے اپنے سر پر دھری ہوئی گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے۔ مکئی کی روٹی ہے، چنے کا ساگ۔ گاؤں کا اصلی گھی ہے۔ دہی ہے، دودھ ہے۔ آپ کے سارے گھر کو پیٹ بھر کے کھلا سکتی ہوں۔ مجھے تو رات بھر ٹھہرنے کا ٹھکانہ چاہیئے۔"

اس کی حاضر جوابی سے سیٹھ جی اور گھبرا گئے۔ انھوں نے سوچا ایک معمولی گاؤں کی عورت کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ یوں سوال جواب کرے۔ کہیں یہ عورت انکم ٹیکس والوں کی سی آئی ڈی تو نہیں ہے؟

"نا بابا معاف کرو، ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔"

"تو پھر دوسرا ہی گھر دیکھنا پڑے گا سیٹھ جی۔" یہ کہا اور وہ عورت اپنی گٹھری سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔

سیٹھ جی مڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے واپس برآمدے میں جا رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس امریکن دیئے کی روشنی کچھ پیلی پڑتی جا رہی ہے۔ "یہ پاور ہاؤس کا کرنٹ پھر نیچے جا رہا ہے" اور پھر

جب وہ وہاں اپنی کمپنی کے لیئے بجلی کا سامان خریدنے گئے تھے —— دراصل یہ دیوی کا سمراٹ انھیں ذاتی کمیشن کے طور پر پریزینٹ کیا گیا تھا۔ مال سپلائی والی امریکن الیکٹرک کمپنی کی طرف سے۔ اور اس کو دیکھتے ہی سیٹھ لکشمی داس نے سوچ لیا تھا کہ اب کے بار دیوالی پر یہ امریکن دیا ہی دیوی لکشمی کا سواگت کرے گا۔

اور آج شام ہی سے یہ دیا اپنی بھڑکیلی امریکن شان سے جل رہا تھا۔ اُس کے چاروں طرف دس ہزار اور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ سیٹھ لکشمی داس کا کہنا تھا کہ سب تہواروں میں دیوالی ہی سب سے اہم اور برتر تہوار ہے۔ دیوالی کی رات کو جہاں اس کا سواگت کرنے کو روشنیاں ہوتی ہیں وہاں دیوی لکشمی آتی ہے۔ سو وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھتے تھے کہ ہر دوسرے سیٹھ اور بیوپاری کے گھر سے زیادہ روشنیاں لکشمی محل میں ہونی چاہئیں۔ اُن کو یقین تھا کہ جتنی روشنیاں زیادہ ہوں گی اُتنی ہی زیادہ لکشمی دیوی کی مہربانی بھی ہوگی اور شاید تھا بھی یہ سچ۔ بیس بائیس برس پہلے جب ان کی چھوٹی کپڑے کی دوکان تھی تب ان کے گھر میں کڑوے تیل کے سو دیئے جلا کرتے تھے۔ پھر جب جنگ ہوئی اور ان کو فوجی کمبل سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو اُن کے نئے گھر پر ایک ہزار دیئے جگمگانے لگے۔ پھر جب آزادی آئی اور سیٹھ لکشمی داس کو ایک بہت بڑے ڈیم بنانے کے لئے مزدور سپلائی کرنے کا ٹھیکہ مل گیا تو دیوالی کی رات کو اُن کے بنگلے پر پانچ ہزار بجلی کے بلب جگمگا اُٹھے اور اس سال جب کہ انہوں نے ایک امریکن کمپنی کے ساتھ مل کر کئی کروڑ روپے کا کارخانہ قائم کر لیا تھا جس میں انھیں لاکھوں روپے مہینے کی آمدنی کی اُمید تھی، اگر انکم ٹیکس افسر کوئی گڑبڑ نہ کرے۔

اس مرتبہ تو انھوں نے اپنے لکشمی محل میں ایسی روشنی کی تھی کہ ایک بار تو دیوی لکشمی کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو جائیں۔ اتنی بہت روشنیاں اور خصوصاً امریکن دیوی کے سمراٹ کو دیکھ کر دیوی خوش ہوگئی تو کون جانتا ہے اگلی دیوالی تک سیٹھ جی پانچ چھ اور کارخانے اور دو چار بینک خریدنے کے قابل ہو جائیں۔

ہاں تو دیوالی کی رات تھی اور سیٹھ صاحب الیکٹرک انجینیر کو ہدایت دے رہے تھے کہ بجلی کے کنکشن اور فیوز وغیرہ کا خاص خیال رکھے کیوں کہ کسی کی بھول سے ایک سیکنڈ کے لئے بھی بجلی فیل ہو کر اندھیرا ہو گیا تو خطرہ ہے کہ دیوی لکشمی ناخوش ہو کر اس گھر سے ہمیشہ کے لئے نہ چلی جاتے۔ اس لئے الیکٹر انجینیر نے ایک جنریٹر بھی لگایا ہوا تھا تاکہ پاور کے کرنٹ میں کوئی گڑبڑ ہو تو جنریٹر سے بنائی ہوئی بجلی کام آئے۔

یکایک سیٹھ صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محل بھر میں لگے ہوئے سارے بجلی کے قمقموں کی روشنی اور تیز ہو گئی ہو —— "دیوی لکشمی آ گئی" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ مگر انجینیر نے سمجھایا کہ کرنٹ کے گھٹنے بڑھنے سے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روشنی زیادہ یا کم ہو جاتی ہے۔

دِیوالی کے تِین دِیے

پہلا دیا:۔

دیوالی کا یہ دیا کوئی معمولی دیا نہیں تھا۔ دیے کی شکل کا بہت بڑا بجلی کا لیمپ تھا جو سیٹھ لکشمی داس کے محل نما گھر کے سامنے کے برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ بیچ میں یہ دیوں کا سمراٹ دیا تھا اور جیسے سورج کے ارد گرد اَن گنت ستارے ہیں، اسی طرح اس ایک دیے کے چاروں طرف بلکہ اُوپر نیچے بھی ہزاروں بلب بجلی کے تاروں میں ایسے جگمگا رہے تھے جیسے مالن ہاروں میں چنبیلی کے سفید پھولوں کو گوندھتی ہے۔

برآمدے کے ہر محراب میں ان بجلی کے دیوں کے ہار پڑے ہوتے تھے۔ چھت کے کنگروں کے ساتھ ساتھ ستاروں سے بھی زیادہ جگمگاتے ہوئے قمقموں کی جھالریں جھول رہی تھیں۔ سنگِ مرمر کے ہر ستون پر بجلی کے تار کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور اس میں پکے ہوئے انگوروں کی طرح لال، ہرے نیلے پیلے بلب لگے ہوتے تھے۔ سارے گھر میں کچھ نہیں تو دس ہزار بجلی کے یہ دیے شام سے ہی دیوالی کا اعلان کر رہے تھے۔ دیوی لکشمی کا انتظار کر رہے تھے۔

مگر ان سب میں سب سے زیادہ نمایاں وہ ایک ہی دیا تھا۔ دیوی کا سمراٹ جو اپنی روشنی سے شام کے دھندلکے کو دوپہر کی طرح روشن کیے ہوئے تھا۔ یہ دیا سیٹھ لکشمی داس امریکہ سے لائے تھے۔

کیونکہ میں اور انسانیت جدا جدا نہیں ہیں :

یہ کہہ کر آخر [illegible] بیہوش ہو گیا۔

تب میں نے کہا [illegible] بے شک۔ ساری انسانیت تمہارے اندر سمائی ہوئی ہے لیکن نہ بھولو کہ اور کسی سے زیادہ تم میں [illegible] ہے۔ اگر تم نے کبھی مجھے اپنے آپ سے جدا کیا تو تم کروڑوں میں سے صرف ایک اکائی رہ جاؤ گے۔ انسانیت عظیم ہے اس لئے کہ ہر انسان کی ایک خودی ہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ [illegible] میں خدائی بھی ہے لیکن تم بھی اتنا تو مانو گے کہ انسان میں خودی ہے [illegible] ہے [illegible] تم میں میں ہوں۔ جیسے مجھ میں تم ہو :

یہ کہہ کر میں نے [illegible] دیکھا اور اس نے میری آنکھوں میں اور پھر وہ میری نگاہ کے آئینے میں ایسے کھو گئے جیسے [illegible] کبھی الگ ہوتے ہی نہیں تھے۔

میں وہ کھوگیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ مگر اس آدمی نے میری زندگی کے ایک نہایت نازک موقعے پر انسانیت میں میرا اعتقاد (جو اس وقت ڈگمگا سکتا تھا) پھر مستحکم کر دیا۔ اور اپنی یادوں کے اندھیرے میں اب بھی اس گمنام انجانے ہمراہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں، اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں:

"احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس۔ جو ساٹھ برس ہوتے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ میرے پڑنانا تھے خواجہ الطاف حسین حالی۔ جن کی "مسدس حالی" کے تین سو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ لیکن جنہوں نے کبھی اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے اس کی رائلٹی کا ایک پیسہ نہیں لیا۔ کیوں کہ وہ کتاب انہوں نے قوم کو جگانے کے لیے لکھی تھی۔ اس کی بکری سے پیسے بنانے کے لئے نہیں۔ اور میرے باپ تھے خواجہ غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔ جنھوں نے ایک بار گھر کے نوکر چھوکرے کو "الو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا دی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بنا کھانا پانی کے بند کر دیا تھا۔ جب تک میں نے ہاتھ جوڑ کر اس لڑکے سے معافی نہ مانگی تھی اور اس طرح انھوں نے مجھے سکھایا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے۔ اور جنھوں نے مرتے دم میرے لئے کوئی جائیداد نہیں چھوڑی تھی، سوائے انسانیت کے چند اصولوں کے۔ اور میری والدہ تھیں سرورۃ النساء بیگم۔ جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہ پائی تھی۔ نہ کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا شکار نہ ہوئیں اور فسادات کے دنوں میں کتنی ہی تکلیفیں اٹھا کر بھی انسان دوستی کا دامن نہ چھوڑا۔ مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی بھی اولاد ہوں۔ میرے عزیز اور رشتے دار پاکستان میں تو ہیں ہی۔ مگر انسانیت اور سوشلزم کے ناطے سے میرے رشتے دار ساری دنیا میں ـــــ امریکہ اور روس میں، انگلستان، چین اور جاپان میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا کہ ایک یوربین شاعر جان ڈن نے کہا ہے۔

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے
ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں"

"کون ہو تم؟" "نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا، اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا، اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا دسنت ڈیسائی ہے۔ اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا، یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا: "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس"

اس نے کہا: "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا؟"

میں نے کہا: "ہاں بمبئی کرانیکل میں"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو۔"

میں نے کہا: "ہاں! کئی برس سے ہم یہیں رہتے ہیں۔"

اور اتنے میں ہم پولیس کے سپاہیوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں کرفیو نہیں تھا۔

میرے ہمراہی نے کہا "میٹنگ میں چل رہے ہو عباس بھائی؟"

میں نے پوچھا "کونسی میٹنگ؟"

"سورکشن دل بنا رہے ہیں۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے"

میں نے کہا "چلو ضرور چلتا ہوں۔"

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں شریک ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے:

"آؤ آؤ۔ عباس بھائی آؤ"

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک سورکشن دل بنایا جائے کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا خواجہ احمد عباس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام پر اپنے ہاتھ اٹھائے ان میں وہ بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھتا تھا۔

میں نے سوچا جلسے کے بعد اس سے ملوں گا مگر جلسے کے بعد جو افراتفری ہوئی ہے اس

اندھیرے کا ہمراہی

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۷ء جب آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر محفوظ مسلم علاقوں میں چلے گئے۔ صرف میں اور میری بیوی مجّی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند سنگھی سورماؤں اور لیگی مجاہدوں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں لیکن مجّی نے (جو آج اس دنیا میں نہیں ہے) کہا اگر شیواجی پارک میں ہمارے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو پھر زندہ رہنا ہی بے کار ہے اور سو ہم وہیں رہے۔

میں ان دنوں "بمبئی کرانیکل" اخبار میں کام کرتا تھا۔۔۔ ایک رات کو میں دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا۔ دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ کرفیو لگا دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری گلی میں سے گذر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے۔ (میں فطرتاً کوئی بہادر نہیں ہوں۔ اگر میں اس خطرناک زمانے میں اندھیرے اجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا)، میں نے سوچا آج میری موت آ گئی۔ مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیئے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا ہے میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بے چارہ ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا "ہاں نو بجے کا کرفیو ہے اِدھر۔ مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شیواجی پارک۔ اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک۔"

مجھے اس محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسی حالت میں ناکام عاشق کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ خودکشی کرتا ہے (مگر میں موت سے ڈرتا تھا اور اب بھی ڈرتا ہوں) یا وہ شاعری کرتا ہے اور شراب پیتا ہے (مگر مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور شراب مجھے کڑوی اور بدبودار لگتی تھی)، اور یا وہ افسانے لکھتا ہے اور ان افسانوں میں اپنے ناکام عشق کی داستان کو ڈھال کر اپنے گھائل دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ (اور سو یہی میں نے کیا)

میں نے پوچھا: "تو کیا تم سمجھتے ہو ہر ناکام عاشق افسانہ نگار بن سکتا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "ہر ایک ناکام عاشق افسانہ نگار نہیں بن سکتا مگر اس کو افسانہ نگار بنانے میں اس کی محبت کی ناکامی بھی مدد کر سکتی ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے قلمکار بننے کی تین وجہیں بتائی ہیں۔ ان تینوں کو اپنے ذاتی معاملے سے ہٹا کر ایک عام اصول کی طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے تین محرک ہو سکتے ہیں۔ لکھنے والے کی اپنی انفرادیت اور خودی — اس کے اپنے جذباتی تجربات و حادثات — اور اس کا سماجی، اقتصادی اور سیاسی ماحول —"

میں نے کہا: "تم اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سماجی اور اقتصادی اور سیاسی ماحول پر اتنا زور دیتے ہو، شاید اسی لئے لوگ کہتے ہیں تم محض ایک جرنلسٹ ہو، ادیب نہیں ہو۔"

"میری تخلیقات پر لوگ جو چاہے لیبل لگائیں مگر وہ وہی ہیں (اور وہی ہو سکتی ہیں)، جو میں ہوں۔ اور میں جو بھی ہوں، وہ جادو یا کسی معجزے کا نتیجہ نہیں ہے۔ ایک انسان اور اس کے سماج کے عمل اور ردِ عمل سے تخلیق ہوا ہے۔ انسان کا کیریکٹر ہی نہیں اس کی قسمت بھی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنتی ہے اور اس حقیقت سے کوئی نہیں انکار کر سکتا چاہے وہ مارکس کا چیلا ہو یا فرائڈ کا پیرو۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔"

اب میں اس کی باتوں سے خاصا بور ہو چکا تھا اس لئے میں نے انٹرویو کا آخری سوال پوچھا: "کیا تم کوئی واقعہ بتا سکتے ہو جس کا تمہارے کیریکٹر اور زندگی پر گہرا اثر پڑا ہو؟"

"ایسے تو ہزاروں واقعات ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ہوتا ہے جو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں۔ مگر جو دل و دماغ پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ ان سب کو یاد کرنے اور بیان کرنے کے لئے تو پوری کتاب چاہئے پھر بھی وہ فوجی پریڈ والا واقعہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ ایک اور سنائے دیتا ہوں۔ چاہو تو اسے ایک کہانی سمجھ لو — مگر یہ ایک سچی کہانی ہے جس کا عنوان ہے....."

جیسا ناول لکھ دوں ۔ دل چاہتا ہے کہ میں ایک ایسا فلم بنا دوں جس کا ساری دنیا میں چرچا ہو۔ دل چاہتا ہے میں ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ جاؤں، اسپوتنک میں بیٹھ کر چاند کی سیر کراؤں، دل چاہتا ہے میرے پاس ایک خاص اپنا کمرہ ہو جس میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہوں اور ایک ریڈیو گرام ہو۔ اور دنیا کی بہترین موسیقی کے ریکارڈ ہوں، اور زمین پر چٹائی کا فرش ہو۔ اور لیٹنے کے لئے ایک گدا ہو۔ ایک بجلی کا سماوار ہو جس میں ہر وقت چائے بنتی رہے۔ کئی فاؤنٹین پین ہوں، ایک بہت بڑی روشنائی کی بوتل ہو۔ اور سو ریم کاغذ ہو اور وقت ہو ـــــ اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لئے، اپنی پسند کی کتابیں اور کہانیاں لکھنے کے لئے اپنے خاص دوستوں سے گپ کرنے کے لئے، سونے کے لئے وقت ہو اور کبھی کبھی سوچنے کے لئے بھی وقت ہو "

تو پھر یہ بھی بتاؤ کہ تم نے لکھنا کب شروع کیا اور کیوں ؟ "

" میں نے لکھنا شروع کیا جب میں کالج میں پڑھتا تھا۔ مگر کیوں ؟۔ اس کی وجہیں تین تھیں میرا ٹھگنا قد اور دبلا پتلا جسم، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس میں میں سب سے بُرا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی میں صرف کھلاڑیوں ہی کی قدر کی جاتی تھی۔ مگر میرا جی چاہتا تھا کہ میرا بھی نوٹس لیا جائے میں بھی کوئی ایسا کام کروں کہ یونیورسٹی میں میرا چرچا ہو۔ سو میں نے یونین کی ڈیبیٹس میں حصّہ لینا شروع کیا۔ پھر یونیورسٹی میگزین میں لکھنا شروع کیا۔ پھر افسانے لکھے ..... پھر کتابیں .....

دوسری وجہ ؛ ـــــ برٹش سامراج جس نے مجھے پہلے مقرر، پھر جرنلسٹ اور پھر مصنف بنا دیا جلیانوالہ باغ والے قتل عام سے اگلے برس کا ذکر ہے، میں شاید پانچ چھ برس کا تھا۔ جب ہمارے قصبے کے سینکڑوں بچوں کو تپتی ہوئی سڑک کے کنارے کھڑا کیا گیا، صبح سے شام تک سڑک پر فوج کے گھوڑ سوار رسالے گذرتے رہے اور لال منہ کے انگریز سپاہی، ان کی بندوقیں، رائفلیں، سنگین، مشین گنیں، توپیں دیکھ دیکھ کر بچوں کے دل دہلتے رہے اور یہی اس پریڈ کا مقصد تھا کہ بچوں کے دل میں سامراج کی فوجی طاقت کی دہشت بٹھا دی جاتے۔ مگر نتیجہ اس کا الٹ نکلا۔ ایسی ہی ایک پریڈ پنجاب کے ایک اور قصبے میں ہوئی تھی۔ ایک بچے کے دل میں انگریزی سامراج کے لئے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہو کر وہ دہشت پسند انقلابی بن گیا۔ اس کا نام تھا بھگت سنگھ۔ ہزاروں اور بچوں نے بڑے ہو کر کسی انگریز پر پستول تو نہیں چلایا مگر ان کے دلوں میں بھی انقلابی، سیاسی خیالات پروان چڑھتے رہے۔ ان ہی میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں کمزور تھا۔ پستول اور بم نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے سوچا سامراج کے خلاف میرا ہتھیار میری آواز ہوگی۔ میرا قلم ہوگا۔

تیسری وجہ ـــــ اٹھارہ برس کی عمر میں مجھے کسی سے محبت ہو گئی۔ اور باوجود اور بہت سی محبتوں کے وہ پہلی محبت بیالیس برس بعد اب بھی جوان ہے۔ اور اکیس برس کی عمر میں

[illegible]

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ ہے کہ میری ہستی سے دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں جیسا لافانی عشق نہیں ہوا۔ کوئی لافانی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آرٹ کا کوئی شاہکار تخلیق نہیں ہوا۔ کوئی نیا بر اعظم دریافت نہیں ہوا۔

تو پھر ساٹھ برس کی عمر میں تم نے کیا کیا؟"

"جھک ماری۔ پچاس ہزار گھنٹے دوستوں کے ساتھ گپ ماری۔ پچاس ہزار چائے کی پیالیاں پیں۔ ایک لاکھ سفید کاغذ کے ورق سیاہ کئے۔ پندرہ ہزار گھنٹے سینما کے اندھیرے میں کاٹے۔ سوا سو فاؤنٹین پین خریدے، گھسے اور کھوئے۔ سات ٹائپ رائٹروں کو پیٹ پیٹ کر کھٹارہ بنا دیا۔ پانی پت، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی، ہانگ کانگ، شنگھائی، ٹوکیو، پیکنگ، لندن، پیرس نیویارک اور ماسکو کی سڑکیں ناپیں۔

"اس سب اوٹ پٹانگ پروگرام سے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ تم کرتے کیا رہے؟ آخر تمہارا پیشہ کیا ہے؟"

"ادیب اور نقاد کہتے ہیں میں ایک اخبارچی ہوں۔ جرنلسٹ کہتے ہیں میں فلم والا ہوں فلم والے کہتے ہیں میں ایک سیاسی پروپیگنڈسٹ ہوں۔ سیاستداں کہتے ہیں میں کمیونسٹ ہوں۔ کمیونسٹ کہتے ہیں میں بورژوا ہوں......"

"مگر تم سچ مچ ہو کیا؟"

"کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟" ——"سچ یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں۔"

پھر بھی سنا ہے تم نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔"

"یہ الزام تو لگایا گیا ہے مگر آپ ثابت نہیں کر سکتے —— ایک تنقید نگار نے تو میری پہلی کتاب پڑھ کر فتویٰ دے دیا تھا کہ کتاب میں نے کسی اور سے لکھوا کر اپنے نام سے چھپوا دی ہے۔"

"سنا ہے تم نے کئی فلمیں بھی بنائی ہیں؟"

"آہستہ بولو۔ کہیں کوئی فنانسر نہ سن لے۔ اور ڈگری لے کر میرا پلنگ اور تین کرسیاں اور ستائیس من پرانی کتابیں اور سترہ من ردی کا غذ قرقی کرنے نہ آ جائے۔

اچھا یہ بتاؤ۔ تمہارے دل کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"۔ دل چاہتا ہے کہ میرے سر پر گھنے سیاہ بال اُگ آئیں اور ایک بار میں پھر جوان ہو جاؤں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ٹالسٹائی کے "وار اینڈ پیس"

بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے ؟"

وہ ایک چھوٹے قد کا گنجا سا آدمی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے جیسے کتنی ہی راتوں سے نہ سویا ہو۔ چہرے پر بڑھاپے کی جھرّیاں تو نہیں ہیں مگر ماتھے پر گہری لکیریں بتا رہی ہیں کہ غم کے کتنے ہی طوفان اس پر سے گذر گئے ہیں۔ جیسے اس کے زندگی کا ہر برس سات سو تیس دن کا گذرا ہو۔

میں نے پوچھا "کیا تم اسے پہچانتے ہو؟ پہلے کبھی دیکھا ہے اسے ؟"

اس نے کہا، "صورت جانی پہچانی لگتی ہے مگر یاد نہیں آتا کہاں اور کب دیکھا ہے ؟"

میں نے کہا۔ "غور سے دیکھو۔ کہیں آئینے میں اپنی صورت تو نہیں دیکھ رہے ہو۔"

اس نے کہا، "لاحول ولا قوۃ۔ کیا تم مجھے اتنا بدصورت سمجھتے ہو؟ انٹلیکچولز کی طرح میرا ماتھا اونچا ضرور ہے مگر میں گنجا نہیں ہوں۔ مانا کہ بیل جیسے دیدے نہیں ہیں میرے مگر آنکھیں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں جیسے کسی نے ریت میں تھوک دیا ہو۔ نہیں جی۔ میں اس گنجے کھوسٹ کو نہیں جانتا۔"

میں نے کہا، "دوست! یہی تو مشکل ہے۔ انسان چاند کا جغرافیہ جانتا ہے مگر اپنا چوکھٹا نہیں پہچانتا۔"

وہ چڑھ کر بولا۔ "کیا کہا ؟"

"کچھ نہیں۔ میں تو تمہاری زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔

"کیوں ؟"

"ایک مضمون لکھنا ہے اپنے بارے میں۔ مطلب یہ کہ تمہارے بارے میں۔"

"کیا اس مضمون کے پیسے ملیں گے ؟"

"شاید۔"

"تو یوں کہو مجھے بیچنا چاہتے ہو؟ اور سب تو بیچ چکے ہو۔ اپنا قلم، اپنا دماغ۔ سنا ہے اپنا دل بھی کئی بار گروی رکھ چکے ہو۔ اب رہ کیا گیا ہے۔ چلو مجھے بھی بیچ ڈالو۔

"تو پھر اپنے حالات زندگی بتاؤ۔"

"تاریخ پیدائش جون ۱۹۱۴ء۔ تاریخ وفات ابھی معلوم نہیں۔"

"ان دو تاریخوں کے درمیان میں کیا ہوا ؟"

"سچ بتاؤں ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل سچ۔"

آئینہ خانے میں

ساٹھ برس تک وہ مجھ سے کتراتا رہا۔ مگر پھر آخر ایک دن ہمارا آمنا سامنا ہو ہی گیا۔

میں نے کہا بات کیا ہے! میں نے تو کبھی تمہیں قرض نہیں دیا۔ پھر ہمیشہ کیوں مجھ سے آنکھیں چراتے ہو؟ ‘

اس نے کہا۔ میں تم سے شرماتا بھی ہوں، ڈرتا بھی ہوں۔ مگر میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں دنیا میں اگر کسی سے محبت کرتا ہوں تو صرف تم سے۔ محبت کیا ہے اور نفرت کیا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ محبت اور نفرت دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ شاید اسی لئے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سمجھتے ہو میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔

میں نے کہا۔ آج مل ہی گئے ہو تو دو دو باتیں ہو جائیں۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ سب کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

یوں کہو میرے ڈھول کا پول کھولنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا، تب ہی تو میں تمہارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ کیوں دنیا کے سامنے میری مٹی پلید کرنا چاہتے ہو؟ بہت سے ایسے چہرے ہیں جن پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔

مگر میں نے تو کبھی کسی آئینے پر پردہ پڑا نہیں دیکھا۔ اور کہا جاتا ہے آئینہ جھوٹ نہیں بولتا ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں دُبلا آدمی موٹا نظر آتا ہے، دوسرا آئینہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے قد کا آدمی لمبا دکھائی دیتا ہے۔ بدصورت سے بدصورت آدمی کو آئینے میں اپنا چہرہ خوبصورت ہی لگتا ہے۔ اگر آئینے سچ بولتے تو دنیا میں ایک آئینہ بھی نہ بچتا۔ سب چکنا چور کر دیئے جاتے۔

اس نے کہا، تو پھر مجھے بھی ایک آئینہ سمجھو۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ پھر

اور وہ جو بھولی تھی، اور جو ہکلی تھی، اور وہ جسے سب بے وقوف اور پاگل سمجھتے تھے بولی: "گھبراؤ نا پتا جی۔ بڑھاپے میں تمہاری اور ماں کی خدمت کروں گی۔ اور جہاں میں نے پڑھا ہے اس اسکول میں بچوں کو پڑھاؤں گی۔ کیوں آپا جی ٹھیک ہے نا؟"

استانی جو ایک کونے میں کھڑی تھی بولی۔

"ہاں بھولی۔ ضرور۔" اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں وہ روشنی تھی۔ جو ایک مصنف کی آنکھوں میں ہوتی ہے جب وہ اپنے شاہکار کی آخری سطر لکھتا ہے جو ایک مصوّر کی آنکھوں میں ہوتی ہے، جب وہ اپنی تخلیق کی ہوئی تصویر کو مکمل دیکھتا ہے۔

(بشکریہ ہندوستانی ادب)

"تو پھر نکالو پانچ ہزار۔"

روتا ہوا نمبردار اندر گیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے الماری کھولی۔ نوٹ گنے اور پورے پانچ ہزار دولہا کے آگے ڈال دیئے۔

بشمبر کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ "لاؤ جی۔ اب ہار دو۔"

ایک بار پھر دلہن کا گھونگھٹ سرکایا گیا، مگر اس بار اس کی نظریں جھکی ہوئی نہ تھیں۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کو گھور رہی تھی اور آنکھوں میں نفرت نہیں غصہ نہیں صرف حقارت تھی۔

بشمبر کا ہاتھ اٹھا کہ ہار بھولی کے گلے میں ڈال دے مگر اس سے پہلے بھولی کا ہاتھ بجلی کی طرح کوندا اور اس نے ہار چھین کر پھینک دیا۔ اسی لمحے پٹڑے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

سارے مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں کمبخت بدصورت بھی ہے اور بے شرم بھی کیا زمانہ آیا جی۔ اسے تو سب بھولی سمجھتے تھے......

"پتاجی!" بھولی کی آواز گونجی اور اس بار اس میں ہکلاہٹ کا شائبہ بھی نہ تھا۔

اس کا باپ، اس کی ماں، اس کے بھائی اور بہنیں اور گاؤں کے لوگ یہ سن کر حیران رہ گئے۔

پتاجی اٹھائیے اپنے پانچ ہزار مجھے اس سے بیاہ کرنا منظور نہیں ہے۔"

"بھولی، اری بھولی کمبخت کیا کر رہی ہے۔ ماں باپ کی ناک کاٹنا چاہتی ہے کیا۔ کچھ تو ہماری عزت کا خیال کر۔"

تمہاری عزت کی خاطر میں اس بڈھے لنگڑے سے بیاہ کرنے کو تیار تھی، مگر اس لالچی کمینے سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔ نہیں کروں گی۔" یہ لفظ دہرائے جا رہی تھی جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔

"ارے ہم تو اسے گائے سمجھتے تھے، گائے۔"

بھولی یہ کہنے والے کی طرف تیزی سے گھومی۔ "ہاں خالہ! مجھے سب گائے سمجھتے تھے" تبھی اس قصائی کے حوالے کئے دے رہے تھے۔ پر اب ہکلی بول رہی ہے اور بھولی اتنی بھولی نہیں رہی کہ جان کر اس دوزخ میں گر پڑے۔

بشمبر ناتھ گالیاں بکتا ہوا برات کو واپس لے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی خوفناک انتقام کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نمبردار رام لال سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی بیوی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جب سب باہر والے چلے گئے۔ اور ہون کنڈ کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ تب رام لال نے بیٹی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب تیرا ہو گا کیا؟"

"دلہنیا چھا چھم چھا چھم چلی "

پروہت نے کہا "مہورت کا وقت ہو گیا۔ اب کنیا دان ہونا ہی چاہیئے "

بشمبر ناتھ تو بے تابی سے خود ہی سہرا ہلاتا ہوا ہون کنڈ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"لڑکی کو لاؤ۔ لڑکی کو لاؤ "

آوازیں باہر سے اندر کی طرف گئیں۔

ماں نے بھولی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ "آ بھولی۔ تو بڑی قسمت والی ہے۔"

بھولی نظریں جھکائے باہر آئی۔ زیور اور بھاری کپڑوں کے بوجھ سے دبی ہوئی۔ ہون کنڈ کے پاس اسے دولھا کے برابر پٹڑے پر بیٹھا دیا گیا۔

بشمبر ناتھ کے ایک دوست نے کہا "چل بھئی بشمبر۔ کنیا کو ہار پہنا " اس نے ہار پہنانے کو اٹھایا، پاس کھڑی ہوئی ایک عورت نے گھونگھٹ سرکا دیا۔ ہار بشمبر کے جھُری پڑے ہاتھوں ہی میں لرزتا رہا۔

"ٹھہرو " اس نے اپنے دوست سے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ مگر آس پاس والوں نے سن ہی لیا۔ دلہن کے منہ پر گھونگھٹ پھر آگیا۔

ارے اس کے منہ پر تو چیچک کے داغ ہیں " بشمبر نے کہا۔

"تو اب کیا ہو سکتا ہے، تو بھی کونسا جوان پٹھا ہے "

اس کے دوست نے سمجھایا۔

"ارے یہ ایسی تھی تو ہمیں کم سے کم پانچ ہزار مانگنا چاہیئے تھا۔

یہ پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ اب کیا برات واپس لے کر جائیں گے؟"

"نہیں نمبر دار سے کہو پانچ ہزار لائے "

نمبر دار رام لال کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اتنی ذلت اس کی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آج اس کمبخت بھولی کے ہاتھوں اس کی عزت کو یوں لٹنا تھا، اور پھر ایک نہ دو، پورے پانچ ہزار۔ اتنی بڑی رقم وہ کیسے دیدے۔ مشکل سے عمر بھر جوڑ کر رشوتیں لے لے کر چھ سات ہزار روپیہ تو اس نے جمع کئے تھے۔

اس نے بشمبر کے پاؤں میں اپنی پگڑی ڈال دی۔

"میری عزت کا سوال ہے۔ بیٹا۔ دو ہزار دیتا ہوں ابھی "

"نہیں پانچ ہزار۔ ورنہ ہم جاتے ہیں "

"کچھ تو خیال کرو، تو برات واپس لے گیا تو میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔

گاؤں کی آبادی اتنی بڑھی کہ وہاں اسکول کے علاوہ ایک تنبو والا سنیما بھی قائم ہوگیا۔ اور ایک کپاس کو صاف کرنے کا کارخانہ اور اب تو ڈاک گاڑیاں بھی ان کے اسٹیشن پر رکنے لگیں اور تحصیلدار تو کیا اب تو کبھی کبھی کلکٹر صاحب اور ایک بار تو منسٹر بھی وہاں کا دورا کرنے لگے۔

ایک رات کو اپنے پکے نئے مکان کی چھت پر پلنگ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے نمبردار نے بیوی سے کہا: ”تو پھر بشمبر کو ہاں کہہ دوں؟“

”ہاں تو اور کیا۔ اس سے اچھا بر بھلا اس نگوڑی کو کہاں ملے گا۔ اچھی بڑی دکان ہے اپنا مکان ہے۔ آٹھ دس ہزار روپے نقد بھی ہیں۔ پھر بے چارہ جہیز دان کچھ نہیں مانگتا۔

وہ ٹھیک ہے، مگر عمر ذرا زیادہ ہے نا؟“ پہلی بیوی کے بچے بھی بڑے بڑے ہیں۔

تو پھر کیا ہوا؟ چالیس پچاس کی عمر بھی کوئی عمر ہووے ہے کیا۔ اب اس کلموہی کے لئے کوئی راج کمار آئے گا کیا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ بشمبر دوسرے قصبے کا ہے۔ نہیں تو کاہے کو کوئی پیغام دیتا۔ یہ رشتہ نہ ہوا تو پھر عمر بھر کنواری رہے گی اور ہماری چھاتی پر مونگ دلے گی۔

نمبردار نے کہا: ”پھر بھی ڈرتا ہوں نہ جانے لڑکی کیا کہے گی“

”ارے وہ پگلی کیا کہے گی۔ بھیجے میں عقل نہیں۔ منہ میں زبان نہیں۔ وہ تو بے چاری گاتے ہے گاتے۔ لکشمی کو تم نے قصائی کے حوالے کر دیا تھا، وہ کچھ بولی تھی کیا؟“

”تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو“ اور پھر وہ حقہ گڑگڑانے لگا۔ اور بھولی جو ابھی سوئی نہیں تھی اور یہ سب سن رہی تھی۔ بڑی دیر تک آسمان کو تکتی رہی، جہاں لاکھوں ستارے جھلملا کر نہ جانے اس سے کیا کہہ رہے تھے۔

بشمبر ناتھ جس کی دوسرے قصبے میں پنساری کی دکان تھی۔ جہاں پر وہ ہلدی، دھنیا، نمک گھی بیچتا تھا بڑی بھاری برات لے کر آیا۔ نمبردار رام لال کی تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی چوتھی بیٹی کی قسمت یوں چمکے گی۔ رادھا، منگلا، چمپا جو اپنی سسرال سے بھولی کے بیاہ میں شرکت کرنے آئی تھیں برات کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر جل ہی تو گئیں۔

”اس پگلی ہکلی مردار کی یہ قسمت؟“ منگلا نے کہا۔

پھر رادھا نے کہا ”اری اس کے دولہا کو بھی دیکھا ہے۔ مونچھوں میں خضاب لگاتا ہے۔

اور چمپا بولی ”میں نے سنا ہے لنگڑاتا بھی ہے“

”ہاں۔ اور یہ بڑے بڑے تو لڑکے ہیں اس کے“

اور یہ سب سوچ کر ان کو تھوڑی بہت تسلی ہوگئی کہ برات شاندار سہی، مگر بھولی کا دولہا تو لنگڑا ہے بڈھا ہے۔ براتیوں کو ہار پان تقسیم ہو رہے تھے۔ بینڈ باجا ایک فلمی دھن بجا رہا تھا“

یہ کتاب پڑھنا تو تمہیں ایک مہینہ میں آجائے گا، بھولی — پھر تم اس سے بڑی کتاب پڑھوگی۔ پھر اس سے بڑی ..... اور پھر تم سب گاؤں والوں سے زیادہ پڑھ جاؤگی پھر تمہارا کوئی مذاق نہیں اڑائے گا۔ ہر کوئی تمہاری عزت کرے گا۔ اور جو بات بھی تمہارے دل آئے گی تم اس کا اظہار کر سکوگی۔ سمجھیں تم؟ شاباش! اب جاؤ۔ کل سویرے آنا"

بھولی کو ایسا لگا جیسے مندر کے گھنٹے ایک دم بج پڑے ہوں۔ جیسے اسکول کے سامنے اُگے ہوئے کیکر کے پیڑ پر ایک دم سے لال لال پھول نکل آئے ہوں، جیسے وہ اپنی ہکلاہٹ کو دور کر کے وہ سارے گیت گانے لگی ہو جو اس کی بہنیں گایا کرتی تھیں اور جنہیں آج تک وہ نہ گا سکی تھی۔

اس نے سوچا جب میں گھر جاؤں گی اور باپو اور ماں اور چمپا مجھ سے پوچھیں گے کہ اسکول کیسا لگا تو میں انھیں بتا دوں گی کہ اسکول کتنا بڑا ہے اور استانی کتنی اچھی ہے اور انھیں یہ خوبصورت کتاب دکھا دوں گی اور اس میں بنی ہوئی رنگین تصویریں۔ اور ان سے بات کرتے ہوئے میں ایک بار بھی نہیں ہکلاؤں گی۔

مگر جب وہ گھر پہنچی تو اس کے باپ نے کچھ نہیں پوچھا۔

اس کی ماں نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا کہا، ڈانٹ کر "چل یہ کپڑے اتار کر سنبھال کر رکھ گھر میں دھول مٹی میں خراب کرے گی تو پھر خوب ہی درگت بنا دوں گی تیری"

اور چمپا نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ اور وہ اپنی ریشمی شلوار سیتی رہی جو اس کے جہیز کے لئے بن رہی تھی۔

سو بھولی کسی کو کچھ نہ بتا سکی۔ کاش لکشمی ہی ہوتی تو وہ اسے ہی اپنے اسکول اور اپنی استانی اور اپنی کتاب کے بارے میں بتاتی اور کہتی۔ دیکھ لکشمی کسی کو کہنا نہیں مگر میں ایک دن میں سب کی طرح سے فر فر باتیں کر دوں گی۔ استانی جھوٹ تھوڑی بولتی ہے۔

مگر لکشمی تو کب کی قصائی کی چھری تلے آ چکی تھی سو بھولی چپ چاپ اپنے کونے میں بیٹھی رہی اور اس نے اپنی کتاب کو اناج کی کوٹھی میں چھپا دیا مگر اس کا دل دھڑک دھڑک کر اعلان کر رہا تھا۔

"بھولی بولے گی۔ بھولی بولے گی"

اور یوں سات برس گزر گئے۔

بھولی اسکول جاتی رہی۔ اس لئے کہ نمبردار کو اپنی ایک بیٹی کو تو پڑھا کر گاؤں کے لئے مثال قایم کرنی چاہیئے

چمپا کا بیاہ ہو گیا۔ سریندر بی۔ اے کر کے شہر کے ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔

نمبردار نے اپنے کچے مکان پختہ کروا لیا۔

شرم اور غصے سے وہ لال ہو گئی اور دانت کچکچا کر اس نے اپنا نام ادا کرنا چاہا۔

"بھو..... بھو..... بھو....."

اور پھر وہ رونے لگی...... زور زور سے...... ڈھاڑیں مار مار کر یہاں تک کہ ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ جب اسکول ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب لڑکیاں کلاس چھوڑ کر بھاگیں تب بھی بھولی وہیں بیٹھی رہی، سر جھکائے سسکیاں لیتی رہی!

"بھولی!"

تو اسے سب ہی کہتے تھے۔ حقارت سے۔ نفرت سے۔ مذاق سے مگر استانی کی آواز میں ایسی نرمی تھی کہ بھولی کو ایسا لگا جیسے اس کے دل کے زخموں پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ استانی اس کے پاس کھڑی ہے۔

"اٹھو!" استانی نے کہا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب اپنا نام بتاؤ!" بھولی کو اس ڈر سے پسینہ آگیا کہ پھر اسے اپنی ہکلاہٹ کے مارے ذلیل ہونا پڑے گا۔ پھر بھی اس مہربان استانی کی خاطر اس نے کوشش کی۔

بھو..... بھو..... بھو....."

"شاباش! شاباش۔ پورا نام بتاؤ۔"

"بھو..... بھو..... بھولی!" آخر کار نام پورا ہو ہی گیا اور بھولی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بہت بڑا کام کیا ہو۔

"شاباش" استانی نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"جب تمہارے دل سے ڈر نکل جائے گا تو تم اور سب کی طرح بولنے لگوگی!"

بھولی کی آنکھوں نے استانی سے پوچھا: "سچ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ بس تم روز اسکول آیا کرو۔ آؤگی نا؟"

بھولی نے سر ہلا کر "ہاں" کہا۔

"یوں نہیں۔ زبان سے ہاں کہہ کر کہو۔ اگر تم سچ مچ یہاں آنا چاہتی ہو تو ہاں تمہاری زبان سے فوراً نکل آئے گا۔"

"ہ..... ہ..... ہاں!" اور بھولی حیران رہ گئی کہ یہ کیسے ہوا۔

"دیکھا تم نے؟ یہ لو کتاب!"

کتاب رنگین تھی اور اس میں بڑی اچھی اچھی تصویریں تھیں۔ کتّا، بلّی اور بکرا اور گھوڑا اور طوطا اور شیر اور گائے، لکشمی جیسی گائے۔ ساتھ میں اردو کے کچھ لفظ بھی لکھے تھے۔

چھوڑ کر آؤں ؛ تو وہ سمجھی کہ لکشمی کی طرح مجھے بھی کسی قصائی کے حوالے کیا جا رہا ہے اور وہ زمین پر پچھاڑیں کھا کر رونے لگی۔

• اری مری کیوں جا رہی ہے ؛ اسکول ہی تو لے جا رہا ہوں ماسٹرنی کے پاس۔ کسی قصائی کے حوالے تو نہیں کر رہا ؛ نمبردار نے ڈانٹ کر کہا، اور بیوی کو حکم دیا، ذرا اسے کوئی ڈھنگ کے کپڑے تو پہنا دو۔ اسکول میں دوسری بچیاں کیا کہیں گی۔

بھولی کے لئے کبھی نئے کپڑے بنے ہی نہیں تھے۔ چمپا کے جو کپڑے چھوٹے ہو جائیں یا پھٹ جائیں وہی بھولی کو مل جاتے تھے۔ پھر ان کو کبھی نہ دھویا جاتا تھا نہ ان کی مرمت ہوتی۔ میلے چیکٹ ہو جاتے پھٹ پھٹ کر چیتھڑے ہو جاتے تب بھی اس کو دوسرا جوڑا نصیب نہ ہوتا مگر آج ماں نے اسے چمپا کا ایک پرانا مگر اچھا صاف جوڑا پہنانا۔ سر میں کڑوا تیل ڈال کر چوٹی گوندھی تب بھولی کو اطمینان ہوا کہ اسے قصائی کے حوالے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ شاید کسی اچھی جگہ لے جایا جا رہا ہے۔

بھولی جب اسکول پہنچی تو پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ نمبردار تو بڑی استانی کے سپرد کر کے چلا آیا اور بھولی گھبرا گھبرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کئی کمرے تھے اور ہر کمرے میں اس جیسی کتنی ہی لڑکیاں چٹائی پر بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ بڑی استانی نے اسے ایک کمرے کے کونے میں سب سے پیچھے بٹھا دیا۔ ابھی تک بھولی کے یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سکول کیا ہوتا ہے اور وہاں بچے کیوں آتے ہیں۔ مگر اتنی بہت سی بچیوں کو دیکھ کر اسے اطمینان سا ہو گیا۔ اس کی بہنیں تو اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھیں شاید ان لڑکیوں میں سے کوئی اس کی سہیلی بن جائے، جیسے لکشمی اس کی سہیلی تھی۔ اور گائے کو یاد کر کے وہ پھر اداس ہو گئی۔

استانی اور بچیوں کی کچھ غیر متعلق آوازیں کمرے میں گونج رہی تھیں، مگر نہ تو بھولی کے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور نہ ہی اسے ان کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ اسے تو دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں میں دلچسپی تھی۔ ارے واہ واہ کتنی اچھی اچھی رنگین تصویریں ہیں۔ بالکل جیسے سچ مچ کی ہوں۔ لال لال گھوڑا جیسے گھوڑے پر تحصیلدار صاحب بیٹھ کر گاؤں میں آتے تھے۔ اور کالی کالی بکری جیسے اس کے پڑوسی تیلی کی بکری ہے۔ اور لال لال چونچ کا ہرا ہرا طوطا جیسا اس نے آموں کے باغ میں دیکھا تھا۔ اور کالی کالی چتیوں والی گائے۔ بالکل لکشمی جیسی..... دفعتاً بھولی نے دیکھا کہ استانی اس کے پاس کھڑی ہے اور اس سے سوال کر رہی ہے۔ بھو..... بھو..... بھو، اور ہکلاہٹ کے مارے وہ اپنا نام بھی نہ بتا سکی۔

ایک لڑکی بولی " بہن اس کا نام بھولی ہے۔ بھولی " اور ساری کلاس کی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔ اور بھولی کو ایسا لگا جیسے ان کی ہنسی کے طمانچے اس کے گالوں پر پڑ رہے ہیں اور

گاؤں والوں کے سامنے اچھی مثال قائم ہو۔

اس رات نمبردار نے اس معاملے میں بیوی سے صلاح کی: اس نے کہا: پاگل ہوئی ہو لڑکیاں اسکول میں پڑھنے جائیں گی تو بدنام ہو جائیں گی پھر ان کو بیاہیگا کون؟ پھر چمپا کی تو اب سگائی ہوگئی ہے۔ کون جانے اس بات پر وہ لوگ انکار ہی نہ کر دیں“

پھر نمبردار نے اسے سمجھایا: یہ سرکاری معاملہ ہے، تحصیلدار صاحب کو معلوم ہوا تو خفا ہونگے کون جانے مجھے برخاست ہی کر دیں۔ یہ سرکار نہ جانے لڑکیوں کو پڑھانے کے پیچھے کیوں پڑی ہے پھر یہ نمبردار، ذیلدار، پٹیل اور پٹواری کو حکم دیا جاتا ہے کہ دوسرے گاؤں والوں کے لئے مثال قائم کرو۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں“

نمبردار کی بیوی سمجھدار تھی۔ بولی: میں بتاؤں، بھولی کو اسکول میں داخل کر دو۔ ویسے بھی اس بے چاری کو کون بیاہنے والا ہے نہ صورت نہ شکل ہے، نہ بھیجے میں عقل ہی ہے“

نمبردار نے بیوی کی رائے سے اتفاق کیا اور اگلے دن بھولی کو اسکول میں داخل کرانے لے گیا۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اسکول کیا ہوتا ہے۔ جب باپ نے کہا کہ چل میرے ساتھ تو وہ سمجھی کہ اسے گھر سے نکال رہے ہیں۔ جیسے لکشمی کو نکال دیا تھا۔ لکشمی ان کی ایک بوڑھی گائے تھی جس سے بھولی بہت پیار کرتی تھی۔ اس لئے کہ یہ گائے کبھی اس کا مذاق نہیں اڑاتی تھی نہ اس سے اوندھے سیدھے سوال کرتی تھی جن سے بھولی کو اپنی جہالت اور کمتری کا احساس ہو۔ باپ کی طرح سے ڈانٹتی بھی نہیں تھی اور ماں کی طرح اسے کوستی بھی نہیں تھی۔ صرف اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے بھولی کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی کبھی اپنی گرم گرم گلابی زبان سے بچی کے گالوں کو چاٹتی تھی۔ لکشمی بوڑھی ہوگئی تھی اب وہ دودھ نہیں دیتی تھی۔ اب وہ کبھی بچھڑا بھی نہیں دے سکتی تھی بس کھڑی تکا کرتی تھی۔ سو نمبردار نے چپکے سے ایک قصائی کے ہاتھ سے پچیس روپے لے کر لکشمی کو گھر سے نکال دیا تھا اور قصائی لکشمی کو رسی سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ سوائے بھولی کے جو لکشمی کے ڈکرانے کی آواز سن کر گھر سے نکل آئی تھی۔ اس نے قصائی کے ہاتھ سے رسی چھڑانے کی کوشش کی مگر قصائی نے جھٹکا مار کر رسی چھڑا لی اور بھولی دور جا گری وہ چلانا چاہتی تھی میری لکشمی کو مت لے جاؤ۔ میری لکشمی کو مت لے جاؤ۔ مگر غم اور غصے سے اس کی ہکلاہٹ اور بھی بڑھ گئی: اور اس کی زبان سے سوائے ہے...... ہے...... ہے کے اور کچھ نہیں نکلا۔ غریب لکشمی پیچھے مڑ مڑ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بھولی کی طرف دیکھتی رہی مگر قصائی اسے گھسیٹتا ہوا لے گیا اور بھولی وہیں زمین پر پڑی روتی رہی۔

سو جب اس کے باپ نے بھولی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور کہا چل میرے ساتھ تجھے اسکول میں

کیونکہ اسے نائب تحصیلدار کے ہاں بھی جانا تھا جس کی بیوی کو سویرے سے درد ہو رہا تھا اُو
وہاں سے اسے کم سے کم پانچ روپے فیس ملنے کی امید تھی اور اگر اللہ کے کرم سے بیٹا ہوا تو دس
روپے انعام بھی۔ سو اس نے جلدی جلدی نال کاٹ پھر بچی کو نہلایا بھی لیکن منہ میں انگلی ڈال
کر گلے کا سوراخ بڑا کرنا بھول گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اس بچی کے منہ سے کبھی کسی نے اونچی آواز نہیں
سنی اور جب پانچ برس کی عمر میں بولنا شروع کیا تو نہ صرف تتلا کر، بلکہ ہکلا کر اور جب دوسرے
بچوں اور بچیوں نے اس کا مذاق اڑایا اور اس کے ہکلا کر بولنے کی نقل کر کے ہنستے تو اس نے
منہ پر گویا تالا ہی لگا لیا۔ بس کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تو رک رک کر دو چار لفظ بولتی
اور پھر چپ ہو جاتی اور کبھی بات کرتی بھی تو وہ اتنی سیدھی اور بچکانہ ہوتی کہ سننے والے بے اختیار
ہنس پڑتے اور کہتے ——— بڑی بھولی ہے بچاری۔

نمبردار کے سات بچے تھے۔ تین لڑکے اور چار لڑکیاں۔ جن میں سب سے چھوٹی بھولی تھی
گھر میں کھانے پینے کو کافی تھا۔ دودھ، دہی، مکھن کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ سب کی صحت بڑی
اچھی تھی۔ بڑا لڑکا سرپندر چودہ برس کی عمر میں بھی باپ کے برابر لمبا اور صحت مند تھا۔ اس سے
چھوٹی رادھا تیرہ برس کی عمر میں اچھی خاصی خوبصورت عورت لگتی تھی نمبردار نے رادھا کی شادی
بڑی دھوم دھام سے کی۔ لڑکے کا باپ بھی پاس کے گاؤں کا نمبردار تھا۔ اور لڑکا شہر میں میٹرک
پاس کر کے کالج میں داخل ہوا تھا۔ رادھا کی سسرال کی دیکھا دیکھی نمبردار نے اپنے بیٹوں کو بھی
آگے پڑھنے کے لئے شہر میں بھیجدیا۔ اب گھر میں صرف لڑکیاں رہ گئیں۔ منگلا جو بارہ برس کی تھی اور
جس کی شادی کی بات چیت بھی ہو رہی تھی چمپا دس برس کی تھی مگر نمبردار کی بیوی کا ارادہ تھا کہ منگلا کے
ہاتھ پیلے کرتے ہی چمپا کی سگائی بھی کہیں کر دی جاتے۔

مگر رات کو جب کھانے کے بعد آنگن میں نمبردار کھاٹ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا تو اکثر اپنی بیوی
سے کہتا۔ سرپندر کی ماں۔ اور سب بچے تو ٹھکانے لگ جائیں گے، مگر اس کمبخت بھولی کا کیا
ہوگا۔ اس کو کون بیاہے گا؟ وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتی۔
جو بھگوان کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔

سی پلنگڑی پر لیٹی ہوئی پانچ سال کی بچی سوچتی: یہ بیاہ کیا ہوتا ہے؟ اور بھگوان
اور

کہاں ر   کی   گیا اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔ اسی برس
بھی کھل گیا۔ تحصیلدار صاحب اسکول کا افتتاح
ں کا
ں کو۔   داخل کرانا چاہیے تاکہ وہ دوسر

بھولی

اس کا نام تو سلیکھا تھا مگر بچپن ہی سے اس کے گھر والے ہی نہیں سارے گاؤں والے اسے بھولی کہتے تھے۔ ان کے پڑوس کے رہنے والوں کا کہنا تھا کہ نمبردار رام لال کی چوتھی بیٹی سلیکھا جب دس مہینے کی تھی تو گھاٹ پر سے سر کے بل گر پڑی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ زمین کچی مٹی کی تھی اس لئے ننھی جان تو بچ گئی، مگر بھیجے کی کوئی نازک رگ شدید لچک گئی۔ اس کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کی عقل کم ہی رہی۔

مگر برادری کی بڑی بوڑھیوں کا کچھ اور ہی کہنا تھا۔ نمبردار کی چوتھی بیٹی جب پیدا ہوئی تو اتنی خوبصورت تھی کہ بالکل میم کی بچّی معلوم ہوتی تھی۔ گوری چٹی لال لال بھولے بھولے گال — ریشمی کالے بال اور بڑی بڑی آنکھیں جو کاجل لگانے سے اور بھی بڑی بڑی لگتی تھیں۔ سارے گاؤں میں شاید ہی کوئی ہوگا جو اسے دیکھنے نہیں آیا۔ بس ان ہی آنے جانے والوں میں سے کسی ہونسنے والے کی نظر لگ گئی۔ ابھی دو سال کی نہیں ہوئی تھی کہ چیچک نکل آئی۔ وہ تو اللہ کا کرا ہوا کہ آنکھیں بچ گئیں۔ مگر سارے منہ اور بدن پر ہمیشہ کے لئے یہ چیچک کے کالے کالے داغ پڑ گئے اور بخار کی گرمی سے بھیجا کمزور ہو گیا اور زبان ہکلانے لگی۔

کسی کا کہنا یہ بھی تھا کہ سارا قصور اصل میں لاڈو دائی کا تھا۔ اسی کے ہاتھوں گاؤں کا ہر بچہ جنم لیتا تھا۔ پیدا ہوتے بچے کی نال وہی کاٹتی تھی۔ وہی نہلاتی دھلاتی تھی اور وہی بچے کے منہ میں انگلی ڈال کر گلے کے سوراخ کو بڑا کرتی تھی۔ جب ہی تو لاڈو کے ہاتھوں پیدا ہوتے سے بچّے اتنے زور سے روتے تھے کہ سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا تھا کہ کسی کے گھر ایک اور بچّے نے جنم لیا ہے۔ ہاں تو کہنا یہ تھا کہ نمبردار کی چوتھی بیٹی جس وقت پیدا ہوئی لاڈو دائی جلدی میں تھی

تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام جاری رکھیں گی۔ اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلی فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ، کتنے شاداب تھے ان کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنے جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی ان میں اتنی زندگی ہے … …

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا، تو غار طلوعِ آفتاب کی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے۔ نہ مصور، نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟ … … شاید … … کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

"ہاں۔ خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہو۔"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا۔ یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا، اور اسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لئے پہنچنا ضروری تھا۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے، کوئی فرار نہیں تھا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"

اور نرمل نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام ... ... ؟" مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ یہی تھا اجنتا کا پیغام، جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرایا، اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آبِ حیات۔ اکسیر۔ اس قیمتی نسخے کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی، نرمل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

عمل! عمل!! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح پگھلا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔ عمل خود عمل کا انعام ہے ... ...

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، یہ پتھر ضرور پگھل کر، ترش کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہو گا۔ اس کی منزل کمالِ فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، انسان کی فطرت کے پتھر پگھل کر، ترش کر حسن اور خوبصورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو

ہُوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے"

"تو یہ کام کب ختم ہوگا"؟

"کون جانتا ہے؟"

"اس غار کو ... ..."

"پورا ہونے میں دو سو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا غار، اور اس کے بعد تیسرا..."

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟"

"ہوگی ___ جب انسان کی تکمیل ہوگی"

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی، اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مہربانی کر کے مجھے سمجھایئے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے ترشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آتا گیا۔

"بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔ آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بناتے ہیں۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگتراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پُرسکون مسکراہٹ تھی۔ جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا، صرف محبت اور رحم اور عمیق اوراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اُس کے صبر و سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو"۔ اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر

آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوتے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے منڈے ہوتے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لیئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آرہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہوگئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کرکے اس کی سطح ہموار بنارہے تھے تاکہ جب دیوار آکھسڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں۔ اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پر حیرت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس سے نہ رہا گیا اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

معاف کیجیے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔

„کیوں؟"

„اس لیئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے۔ اور یہ ادھورا ہی رہے گا،،

„دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے۔ مگر ان کی تکمیل ہونی چاہیئے"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا

„آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے،،

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر ... ...،،

„میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔

„آپ کا نام؟،، نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

„میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں،،

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصوّر کا نام کھدا

دور ــــ دنیا اور زندگی سے دور ــــ!"

اور بھارتی نے سوچ کر کہا۔

"اجنتا؟"

احمد نرمل کو چھوڑنے اسٹیشن پر آیا۔ گاڑی چلنے لگی تو اس نے کہا۔

"اچھا ہے، چند روز کے لئے تبدیل آب و ہوا کر آؤ۔ مگر اگلے اتوار کو شانتی دل کا جلسہ ہے جس میں چند تجویزیں پیش کرنے والا ہوں، اس میں تمھاری موجودگی ضروری ہے"

اور جب نرمل نے کہا۔

"میں اب شانتی دل کے جلسے میں کبھی نہ جاؤں گا"

تو احمد نے چلتی ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے، نرمل"

"ادھورا کام!"

ہنہ۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور۔ یہ بھی تو اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں۔ کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟"

تمھارا کیا خیال ہے، بھارتی ..."

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا۔ کوئی نہیں تھا۔ نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا۔ اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آ کر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا کیوں کہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی ہے وہ کالی پڑ چکی تھی، شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا..... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو

بھی ہوتی رہی۔ مگر نرمل نے نہ کچھ کہا نہ سنا۔

اس کا دماغ خوفناک خیالات اور مناظر کا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ احمدآباد۔ نواکھالی۔ بہار۔ قتل۔ خون۔ خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر۔ نفرت اور تشدّد۔ تعصب اور نفرت۔ عورتوں کی بے حرمتی۔ بچوں کی لاشیں۔ لاشوں کے پہاڑ۔ ایک خونیں آسمان کی طرف لپکتے ہوتے ہزاروں شعلے… …اور ایک کلدار ہتوڑے کی طرح یہ خیال اس کے دماغ پر چوٹ لگاتا رہا کہ یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ شیواجی پارک شانتی دَل کے ممبر آزاد ہند فوج کے ایک مسلمان سپاہی کو اپنی حفاظت کے لئے رکھنے کو تیار نہیں ہیں… …

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ آزاد ہند فوج کے شاندار تاریخی کارنامے بے کار تھے۔ تمام جنگ آزادی بے کار تھی۔ تمام دیش بھگتوں اور شہیدانِ وطن کی قربانیاں بے کار تھیں تمام قومی نعرے، تمام قومی تحریکیں، تمام قومی لیڈر، ہر شخص بے کار تھا۔ ہر چیز بے کار تھی۔ شیواجی پارک شانتی دل بے کار تھا۔ اس سلسلے میں نرمل کا کام بے کار تھا۔ اس کا بمبئی میں رہنا بے کار تھا۔ اس کی زندگی ہی بے کار تھی …اس لئے کہ ہندو اور مسلمان کے جھگڑے آزادی اور ہندوستان سے زیادہ اہم ثابت ہوتے تھے۔

اسے شانتی دَل کمیٹی کے وہ سب ممبر اس وقت تعصب اور نفرت اور خطرناک جہالت کے دیوتا معلوم ہوئے جو اپنی آتشیں آنکھوں سے اس کو گھور رہے تھے۔ جو اسے بھسم کر لینے کے لئے اس کی طرف بڑھے آرہے تھے وہی دس نہیں بلکہ ہر طرف سے لاکھوں راکھشسوں کے دَل کے دَل اس کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ ان میں چوٹی والے بھی تھے اور داڑھی والے بھی۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی، بنگالی، بہاری، مرہٹہ، گجراتی، پنجابی، پوربی پٹھان اور سب اس کے خون کے پیاسے۔

”بھاگ“

نرمل کے دھڑکتے ہوتے دل نے اسے للکارا

”بھاگ“

اور نرمل نہ صرف جلسے کے ختم ہونے سے پہلے ہی شانتی دل کے دفتر سے بھاگا بلکہ دن بھارتی کے ساتھ بمبئی سے بھی بھاگ آیا۔

”کہاں چلیں؟“ بھارتی نے پوچھا۔

”جہاں یہ قتل و خون نہ ہو، جہاں اخبار نہ ہو، ریڈیو نہ ہو، جہاں ہندو نہ ہوں۔ مسلمان نہ ہوں، جہاں چاقو، چھریاں، برچھے، بھالے، تیزاب، غنڈے، موالی نہ ہوں۔

ممبروں کی رائے منسوخ ہو جائے گی، میں ایسی تجویز کی کبھی کسی حالت میں بھی موافقت نہیں کر سکتا“

نرمل کے الفاظ کی والہانہ شدت نے چند لمحوں کے لئے سب کو خاموش کر دیا، مگر اس خاموشی میں اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہوئی۔ ایسی تجویز ہمارے لئے باعث شرم ہوگی۔ ہم شانتی اور اتحاد کے نام لیوا ہیں۔ مگر ہم خود بدترین فرقہ وارانہ تعصب کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ تجویز پاس ہوئی تو میں اس معاملہ کو پریس اور پبلک کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھوں گا۔

اور احمد مسکراتے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

„شاباش، بچے۔ مگر یہ سب بے کار ہے“

دُبلے مارواڑی نے مخالف کی حیثیت سے کہنا شروع کیا۔

مسٹر نرمل کو نہیں معلوم کہ ہم ہندو کتنے کھترے میں ہیں … …“

گجراتی سیٹھ نے کہا۔

„ہم تو صاف بولیں گے۔ اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے“

پستہ قد سیٹھ نے کہا۔

„ہم استعفیٰ دے کر ہندو مہا سبھا کے شور کھشن دل میں مل جائیں گے۔

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے دوسروں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے ہوتے نرمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

مسٹر نرمل ایک بات بتایئے، یہ ہندو علاقہ ہے۔ اگر یہاں پہرہ دیتے ہوتے اس بیچارے مسلمان سپاہی کو کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟ آپ“ اور یہ کہہ کر اس نے گجراتی سیٹھ اور پستہ قد ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری، گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھا میرا قانونی پینترا ایسے ایسے لونڈے میں نے بہت دیکھے ہیں …“

احمد نے مسکرا کر نرمل کی طرف دیکھا اور نظروں میں کہا۔

„میں نے کہا نہیں تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے … …“

تجویز پاس ہو گئی۔ نرمل بپھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا۔ دعوے دلائل۔ … است۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس تعصب اور جہالت کی دیوار پر سر پٹخنا لاحاصل سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ تجویزیں پاس ہوتی رہیں۔

نف ممبروں اور عہدے داروں میں سخت کلامی

„میں سکریٹری صاحب سے اس معاملہ میں جواب طلب کرتا ہوں کہ کیوں ایک مسلمان کو رکھا گیا "

گجراتی سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

„اگر ایسا ہوگا تو ہم لوگ ایک پیسہ چندہ نہیں دیں گے "

ایک پستہ قد ڈاکٹر نے کہا۔

„میرے حلقے کے لوگ کبھی یہی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان ... "

ڈبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

„یہ ہماری استریوں کی عزت کا سوال ہے "

بوڑھے وکیل نے کہا۔

„میں جواب طلب کرتا ہوں ... ... "

پریسیڈنٹ نے کہا۔

„خاموش۔ خاموش "

سکریٹری نے کہا۔

میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آزاد ہند فوج میں ہندو مسلمان کی تفریق نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر کمیٹی کی رائے یہی ہے تو ہم کسی بہانے سے اس مسلمان سپاہی کو علیحدہ کر سکتے ہیں "

سب نے بیک وقت شور مچایا۔

„ہاں ہاں "۔ فوراً "، „ایک دم "۔ اس کو رکھا ہی کیوں ؟ "۔ صرف احمد خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں احمد کو اطمینان سے مسکراتے دیکھ کر زمل کے صبر کا پیمانہ دفعتاً لبریز ہو گیا اس کے دماغ کے اندر کی کوئی کلی دفعتاً تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

„نہیں ! نہیں !! "۔ وہ غیر معمولی جوش سے چلایا۔ سکریٹری جو جلسے کی روئداد میں یہ الفاظ لکھنے میں مصروف تھا کہ „یہ تجویز بلا مخالفت پاس کی گئی کہ آزاد ہند فوج کے جن سابق سپاہیوں کو حفاظت کے لئے رکھا جاتے، ان میں کوئی مسلمان نہ ہو ... ... " اپنی کرسی سے تقریباً اچھل پڑا اس کے ہاتھ سے قلم گر پڑا اور سفید کاغذ پر جہاں اس تجویز کے الفاظ لکھے گئے تھے وہاں روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑ گیا ... ... "

„نہیں ! نہیں !! نہیں !!! جیسے اس ایک لفظ کے دس بار دہرانے سے باقی دس

"یہ شانتی کا مہاساگر ہے، نرمل"۔ بھارتی کہہ رہی تھی۔ "اگر ہم آٹھ دس دن تک روزیہاں اگر کئی گھنٹے گزارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمھارے بے چین دل کو ضرور شانتی ملے گی۔

اور گائیڈ کہہ رہا تھا۔

"آپ نے سب غار دیکھ لئے ہیں۔ اب ایک باقی رہ گیا ہے۔ مگر اس میں آپ کو دوسرے غاروں کی طرح سنگتراشی اور مصوری کے نادر اور حسین نمونے نہیں ملیں گے۔ چھت، ستون، فرش، ہر چیز نامکمل ہے۔ اس غار کا کام ادھورا رہ گیا ہے ... ..."

"ادھورا کام! وہ ––– نرمل ––– بھی تو بمبئی میں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ بلکہ ادھورے سے بھی کم ––– ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے ہار مان لی تھی۔

شانتی دل کمیٹی کا آخری جلسہ۔

نرمل نے شروع ہی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بجائے معمولی ان پڑھ اور اجڈ دربانوں اور چوکیداروں کے آزاد ہند فوج کے سابق سپاہیوں کو معقول مشاہرے پر حفاظت کے لئے رکھا جاتے کیونکہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک اور بالا تھے۔ ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا اور وہ اپنی پرانی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے مدد کے مستحق تھے شانتی دل کے سکریٹری نے اس جلسے میں بیان کیا کہ پرانے تمام پہرے دار علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کی بجائے چودہ آزاد ہند فوج کے سابق سپاہی رکھ لئے گئے ہیں۔ یہ سن کر نرمل کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اب شانتی دل کا کام صحیح طریقے پر ہوگا۔ مگر ایک لمحے ہی میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

ایک بوڑھے مرہٹہ وکیل نے سوال کیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آزاد ہند فوج کے ان سپاہیوں میں مسلمان بھی ہیں؟"

سکریٹری نے کہا۔

"ہاں، مگر صرف ایک۔"

ایک موٹے گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"میرے حلقے میں اس بات پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔"

ایک دُبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

[illegible]

[illegible] ہے۔"

[illegible] آواز میں کہا۔

”آپ کے نہتے والنٹیر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں؟ ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں۔ اور پھر راز دارانہ لہجے میں۔ ”سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں، کیا سمجھے“

خیر۔ چندہ جمع کیا گیا۔ بیس پہرے دار پچاس پچاس روپے ماہوار پر ملازم رکھے گئے۔ کیمٹی میں مسئلہ درپیش ہوا کہ ان کو کہاں کہاں ڈیوٹی پر لگایا جائے“

”ایک ایک آدمی ہر سڑک کے ناکے پر لگایا جائے۔“

”نہیں۔ یہ حماقت ہوگی۔ حملہ صرف تین طرف سے ہو سکتا ہے، یا ماہم کی طرف سے، یا ورلی کی طرف سے یا سمندر کی طرف سے، صرف ان ناکوں پر پہرہ لگانا چاہیئے۔“

”حملہ؟۔ کس کا حملہ“

”مسلمان اگر حملہ کریں گے تو اور کدھر سے حملہ کریں گے؟“

”پر ان پہرے داروں کا کام کیا ہوگا؟“

”ان سے کہہ دیا جائے کہ جیسے ہی کسی مسلمان غنڈے کو دیکھیں سیٹی بجا دیں تاکہ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو جائیں

”صرف مسلمان غنڈے؟ اور اگر ہندو غنڈے ہوں تو؟“

نرمل نے یہ سوال کیا تو، مگر وہ احمد سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

کیمٹی کے جلسے کے بعد اس نے احمد سے کہا۔

”یہ تمھاری ہی ہمت ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتے ہو مجھے تو یہ سب مہابھاتی معلوم ہوتے ہیں۔

احمد نے کہا۔

”ایسے بیوقوفوں اور جاہلوں کی کمی دونوں طرف نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ ماہم کے مسلمانوں میں کیا کیا افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیواجی پارک میں شانتی دل کے نام سے ہندوؤں کی ایک فوج تیار کی جا رہی ہے۔ جو بہت جلد ماہم کے مسلمانوں پر شب خون مارے گی۔“

چندہ۔ والنٹیر۔ محافظ۔ وردیاں۔ سیٹیاں۔ جلسے۔ رزولیوشن۔ پولس کمشنر کے نام عرضیاں۔ مگر شانتی کا پرچار؟ اتحاد کا پروپیگنڈہ؟ ان کا نام نہیں تو پھر شانتی دل کا مقصد؟ اس دوڑ دھوپ سے فائدہ؟ مسلمان غنڈے ـــــ ہندو غنڈے ـــــ گھروں میں پتھر جمع کر کے رکھو، میں نے تو دس لاٹھیاں چھپا رکھی ہیں۔ میرے ہمسائے کے پاس پستول ہے۔“ شانتی! شانتی!! شانتی!!!

اورامن کے درمیان ۔ وہ اس جنگ میں ایک سپاہی تھا۔ وہ شیطانی تعصبات اور درندگی کے خلاف جہاد میں شریک تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں کوئی کارہائے نمایاں نہ کرسکے مگر کم سے کم اس کو یہ تسلی تو تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے، کہ اس کی زندگی بالکل بے کار، بے معنی اور بے مقصد تو نہیں ہوگئی ہے۔

بھارتی نے کئی بار نرمل سے کہا۔

،،چلو بمبئی سے باہر کہیں چلے چلیں۔ جب فساد ختم ہو جائے گا۔ تب آجائیں گے۔

آگرہ، دہلی، کشمیر، اجنتا، ایلورہ، میسور، سیلون نہ جانے کہاں کہاں جانے کا لالچ دلایا، مگر نرمل کو ایسے وقت بمبئی چھوڑ کر باہر جانا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بزدلی معلوم ہوئی۔ بھارتی نے لاکھ سمجھایا کہ اس جیسے حساس آرٹسٹ کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا، اس کی خداداد ذہانت کی تحقیر تھی۔ مگر وہ نہ مانا۔ اور سوائے دفتر کے اوقات کے سارے دن اور رات کا بیشتر حصہ شانتی دل کے کام میں صرف کرتا رہا۔

شانتی دل کا کام؛ نرمل سمجھا تھا کہ اس کا کام واقعی شانتی کا پرچار ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ شانتی دل کے ممبر گھر گھر جائیں گے اور لوگوں کو امن اور شانتی سے رہنے کی تلقین کریں گے آپس کی فرقہ وارانہ منافرت کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

شہر میں خود ان کے علاقے میں ہر دم ہر قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ماہم کے مسلمان شیواجی پارک کے ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شیواجی پارک کے ہندو ماہم کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ہندو دودھ والے دودھ میں زہر ملا کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں، مسلمان ترکاری والے بینگنوں اور موسمبیوں میں زہر کے انجکشن دے کر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ایرانی ہوٹلوں کی چائے مت پیو، اس میں زہر ہے۔ ہندو حلوائی کی مٹھائی مت کھاؤ۔ اس میں زہر ہے جھوٹ، جھوٹ، جھوٹ، اور تعصب اور نفرت کا ایک طوفان جس میں تمام شہر ڈوبتا جا رہا تھا۔ نرمل اور اس کے دوست احمد کو امید تھی کہ شانتی دل کا پہلا کام ہوگا اس خونی سیلاب کو روکنا۔ مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

شانتی دل کا پہلا کام۔ چندہ جمع کرنا... ... احمد کے ساتھ نرمل ہر کسی کے ہاں گیا۔ گنتی کے جو چند مسلمان تھے انھوں نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

یہ شانتی دل کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں... ...ہم نے بھی اپنی حفاظت کے لئے پٹھان رکھ لئے ہیں... ...،،

بعض ہندوں نے کہا۔

ہوئی پڑی تھیں۔ جیسے فصل کٹنے کے وقت کسی کسان نے گیہوں کی بالیں کاٹ کر کھیت میں چھوڑ دی ہوں ... ... جیسے مذبح خانے میں ستائیس بکروں کی کھال اتار کر ایک قطار میں لگا رکھا ہو.... جیسے ... ... جیسے ستائیس انسانی لاشیں بکھری ہوئی ہوں!

نرمل اخبار کے لئے رپورٹ لینے اسپتال گیا تھا اور وہاں اسے پتہ چل گیا کہ کس کمرے میں فساد کے مقتولین کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور کورونر کے فیصلے کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک بار ایک لاش میڈیکل کالج کے سرجری وارڈ میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ تب بھی تین وقت اس سے کھانا نہ کھایا گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی مردہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں مگر یہاں ایک لاش نہیں ستائیس لاشیں رکھی تھیں۔ ۔ بوڑھے۔ جوان۔ بچے۔ سوکھے ہوتے جسم۔ کسی کی کمر میں گھاؤ۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی۔ کسی کی گردن سے سر جدا۔ دھڑ کے قریب رکھا ہوا۔ کسی کا بھیجا پھٹے ہوتے سر میں سے باہر ابلتا ہوا۔ ان میں سے کون ہندو تھا؟ اور کون مسلمان؟ موت کی برادری میں سب ایک تھے۔ قاتل کی چھری نے سب کو برابر برابر لٹا دیا تھا۔ یہ ٹھنڈا پتھریلا فرش۔ یہ تھا ان کا پاکستان اور ان کا ہندوستان۔ یہ بیکار موت۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ یہ سناٹا۔ یہ بے چارگی۔ —— یہ تھی ان کی آزادی۔ یہ تھا ان کا اسلام اور یہ تھا ان کا دیدک دھرم —— جے جے مہادیو —— اللہ اکبر!

نرمل عملی سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ علاوہ اخبار کے کام کے جو وہ پیٹ کی خاطر کرتا تھا وہ عمل کے میدان کا دھنی نہیں تھا۔ اس کی دنیا خیالات اور محسوسات کی دنیا تھی۔ پھر بھی فسادات شروع ہونے کے تیسرے دن ہی وہ اپنے محلے کے شانتی دل میں شامل ہو گیا تھا اور شاید اس لئے کہ اس کا تعلق ایک اہم روزنامہ اخبار سے تھا۔ اور شانتی دل ہو یا سیوا سماج ہو یا خدام وطن، ہر پبلک جماعت کو پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کمیٹی کا ممبر بھی چن لیا گیا تھا نرمل کا دوست اور ہمسایہ احمد جو ایک دوسرے اخبار میں سب اڈیٹر تھا۔ وہ بھی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ تمام شیواجی پارک کے علاقے میں وہی صرف اکیلا مسلمان تھا جو شانتی دل میں شامل ہوا تھا اور ایسی کمیٹیاں سرکاری منظوری نہیں حاصل کر سکتیں جب تک ان میں سب فرقوں کے نمائندے موجود نہ ہوں۔

چند روز تک نرمل شانتی دل کی تنظیم کے کام میں مستغرق رہا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ فساد کے اثر سے اس پر جو ایک مہلک جمود اور گھٹے گھٹے غم اور بے بسی کی حالت طاری ہو گئی تھی وہ اب جاتی رہے گی۔ شانتی دل میں شامل ہو کر اس کو وہی وجد آفریں مسرت حاصل ہوئی جو ایک سپاہی کو طبل جنگ سن کر ہوتی ہے۔ یہ جنگ تاریکی اور روشنی کے درمیان تھی۔ غارتگری

دودھ اور خون پر بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

سینڈھرسٹ روڈ والی عورتوں اور بھنڈی بازار والی عورتوں کے خونی قہقہے مل کر نرمل کے لاشعور پر ایک مہیب گونج بن کر چھائے ہوتے تھے۔ وہی گونج اسے اب تک اجنتا کے ان غاروں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ دھندلی پھیکی رنگ کی تصویروں میں اسے ہر دیوی ہر اپسرا، ہر راج نرتکی، ہر عورت کے چہرے پر ایک شیطانی خوشی اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک نظر آئی۔ ادُ نرمل کا دل ایک عمیق نفرت سے بھر گیا۔

„میں ہر عورت سے نفرت کرتا ہوں“۔ وہ سوچ رہا تھا۔ „ہر عورت سے یہاں تک کہ بھارتی سے بھی ــــ بھارتی ــــ جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس سے مدت سے وہ بھی محبت کرتا تھا بھارتی جو نرمل کو اور اس کی حساس طبیعت کو اپنی دولت کی پناہ میں رکھنا چاہتی تھی۔ جو بمبئی اور اس کے کشت وخوں کے ماحول سے نرمل کو تقریباً زبردستی بھگا کر اجنتا لے آئی تھی۔ محبت۔ نفرت نفرت۔ محبت۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔ ہم عاشق و معشوق ہیں۔ ہم دوست اور ساتھی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں منسلک ہیں، مگر ہم ایک دوسرے نفرت کرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے کی کمر میں چھرا گھونپتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں ...

„ دیکھئے۔ یہ لاشیں دیکھئے۔ سر الگ اور دھڑ الگ“

گائیڈ اپنی رُوں رُوں کئے جا رہا تھا۔ بولتے بولتے اس کو پسینہ آ گیا تھا مگر اس کی آواز نہ تھکتی تھی ــــ اور بھارتی ــــ نازک، نفاست پسند، حساس نرم دل بھارتی ــــ غار کی دیوار پر تصویر ہی میں لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

„اس ظالم راجہ نے سب کو قتل کرا دیا ہے سر کٹوا کر لاشیں اس گڈھے میں پھنکوا دی ہیں چیلوں گدھوں کے کھانے کے لئے ... “

اور نرمل کے دماغ میں یہ غیر متعلق خیال رینگتا ہوا چلا آیا کہ دراصل راجہ ظالم نہیں تھا بلکہ شاید اسے گدھوں، چیلوں کا بڑا خیال تھا۔ ان کو خوراک بہم پہنچانے کے لئے اس نے ان سب لوگوں کو مروا کر ان کی لاشیں یہاں ڈلوائی تھیں۔ اس کے ظلم میں کم سے کم مردار خور جانوروں کا تو بھلا تھا ...

لاشیں! ...

ستائیس ٹھنڈی، مسخ شدہ کالی اور نیلی لاشیں، جو ٹھنڈے پتھر کے فرش پر اس طرح بکھری

حنیف کا کمرہ کنارے پر تھا۔ ایک کھڑکی میں سے بڑی سڑک نظر آتی تھی، دوسری ایک گل
میں کھلتی تھی۔ سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کوئی جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھا۔ نرمل نے دیکھ
کہ ایک پوربی "دودھ والا بھیا" جس کی لمبی چوٹی دور دور سے پکار کر کہتی ہے کہ "میں ہندو ہوں
کندھے پر بہنگی جس میں دودھ کی گڑویاں رکھی ہوئی ہیں۔ سراسیمہ نظروں سے ادھر اُدھر آگے پیچھے دیکھ
ہوا چلا آرہا ہے۔ اور اسی چرنی روڈ والے واقعہ کی طرح نرمل کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ چلا کر دو
والے بھیا" کو خطرے سے آگاہ کر دے۔ مگر اس بار پھر الفاظ اس کی زبان پر جم کر رہ گئے اور چشم زد
میں تین ہٹے کٹے تہمد بند جوانوں نے اس دبلے پتلے کالے پوربی کو گھیر لیا۔

"کہاں جاتا ہے بے کافر کے بچے؟"

دودھ والے بھیا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید اسے ان تینوں کی
آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ وہ واپس مڑا۔ اُدھر بھی غنیم کا ایک گروہ کھڑا ہوا اُسکی طرف قاتلان
نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ہرن کی طرح جو ہر طرف شکاریوں سے گھر گیا ہو۔ اس نے ایک لمحے
کے لئے مایوس آنکھوں سے اِدھر ادھر دیکھا اور پھر دفعتاً وہ اس گلی کی طرف بھاگا۔ اور اس کے
تعاقب میں پانچ شکاری کتے ــــ!

نرمل بھاگ کر گلی والی کھڑکی کی طرف گیا۔ مگر ابھی وہ ادھر پہنچ نہ پایا تھا کہ دودھ والے
بھیا کے خود اپنی بہنگی میں الجھ کر گرنے کی آواز آئی۔ پیتل کی گڑویاں ایک جھنکار کے ساتھ سڑک پ
اوندھ گئیں اور ان کا دودھ ایک سفید نہر بن کر بہہ نکلا۔ جب نرمل نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اس
سفید دودھ میں پوربی کا سُرخ خون مل چکا تھا۔

"بھاگ کر جاتا تھا سالا"

اور پھر نرمل نے برابر کے کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سنی۔

"اری او گل بانو۔ دیکھ تو سہی۔ ایک کافر ہماری گلی میں مارا گیا ہے" ... ...جیسے کوئی کہ
رہا ہو۔ "اری او گل بانو! مبارک ہو، ہماری گلی والوں نے آج کتنی بہادری کا کام کیا ہے!" ..

... اور پھر تین چار جوان، ادھیڑ، بوڑھی عورتوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں۔

"اری اس کی چٹیا تو دیکھ"

"اچھا ہوا۔ یہ سب پوربیئے دودھ میں برابر کا پانی ملاتے ہیں۔ اب سزا ملی ہے"

"گرگام میں جو مسلمان مارے ہیں ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے۔

اور پھر ان ہی میں سے کوئی عورت اندر گئی۔ اور گھر بھر کا کوڑا، ترکاری کے چھلکے، انڈوں کے
خول، گوشت کے چھیچھڑے اور ہڈیاں گلی میں لوٹ دیا۔ عین وہاں جہاں مکھیوں نے پوربی بھیا کے

جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

نرمل کے بہت سے دوست مسلمان تھے مگر فساد کے دنوں میں وہ ان کے محلوں میں نہیں جاسکتا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی رپورٹر اور دوست حنیف کو سخت بخار اور سرسام ہوگیا ہے۔ نرمل سے نہ رہا گیا اور بھنڈی بازار پہنچ ہی گیا۔ جہاں ایک چال میں حنیف اکیلا رہتا تھا۔

کرافورڈ مارکیٹ پر سوائے نرمل کے تمام ہندو بس سے اتر گئے۔ وہ خود کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کی وضع قطع سے یہ ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے بعض تو اسے پارسی ہی سمجھتے تھے مگر پھر بھی جوں جوں بس بمبئی کے "پاکستانی" علاقے میں جا رہی تھی اس کا دل خوف اور پریشانی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے ایسا معلوم کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا "غنڈہ نما" مسلمان نوجوان اس کے دل کی دھڑکن سن کر سمجھ جائے گا کہ وہ ہندو ہے اور اپنی جاکٹ میں سے چھرا نکال کر اس کی کمر میں گھونپ دے گا۔ اسی طرح جیسے چرنی روڈ پر اس دُبلے پتلے نوجوان کو ایک ہندو غنڈے نے "مشٹیک" سے مار ڈالا تھا۔ اور دفعتاً نہ جانے کیوں اس کی کمر کی ریڑھ کی ہڈی کے پاس کھجلی سی محسوس ہونے لگی اور ایک خیالی چاقو کا تیز پھل اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتا گیا۔

باٹلی والا اسپتال کے پاس وہ بس سے اتر کر پٹری پڑی چلا تو اسے چاروں طرف سے قاتل ہی قاتل نظر آئے۔ وہ چھابڑی والا جو کیلے اور موسمبیاں بیچ رہا تھا نہ جانے وہ کس وقت اپنا ترکاری کاٹنے کا چاقو ایک ہندو کی کمر میں پیوست کر دے۔ وہ خوفناک لال داڑھی والا پٹھان تو ضرور ایک "کافر بچے" کی تلاش میں ہوگا۔ پشت سے پتھریلی سڑک پر کھٹ کھٹ قدم قریب آتے ہوتے سنائی دیئے۔ نرمل نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس برقعہ میں کوئی "غنڈہ" ہی چھپا ہوا ہو۔ اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا حنیف کی چال کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

حنیف سرسامی کیفیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ نرمل کو اس کے پاس شام تک ٹھہرنا پڑا۔ جب حنیف کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی اور اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا، اسی وقت ایک سپاہی بھونپوں میں پکارتا ہوا وہاں سے گزرا کہ شام کے پانچ بجے سے کئی علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا ہے کوئی گھر سے نہ نکلے کیوں کہ گشتی فوجیوں کو سر راہ چلنے والوں پر گولی چلانے کے احکامات دیدیئے گئے ہیں۔ نرمل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس منٹ تھے اتنی دیر میں اس کا شیواجی پارک پہنچنا ناممکن تھا۔ چاروناچار اس نے رات حنیف کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

بکار ہے یہ ایک زبردست جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے، فریب ہے ... ”

گائیڈ نرمل کے خوفناک خیالات کی رو سے بے خبر اپنی رواں رواں کیے جا رہا تھا۔

"یہ دیکھئے مہاتما بدھ گھوڑے پر چڑھے بازاریں سے گزر رہے ہیں ان کے چہرے پر کتنی شانتی ہے ــــــ اور دیکھئے یہ عورتیں اپنے گھروں پر سے ان کو کتنی معتقدانہ نگاہوں دیکھ رہی ہیں۔

اور بھارتی کہہ رہی تھی۔

"نرمل دیکھو، ان عورتوں کے چہرے پر کتنی حسین وجدانیت طاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی ورتوں کی اصلی رُوح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت اور ان کی ممتا کو کچھ اجنتا کے آرٹسٹ ی سمجھے ہیں ... ... "

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت، ان کی ممتا!

نرمل کا دل چاہا کہ قہقہہ مار کر اتنے زور سے ہنسے کہ غاروں کی پتھریلی دیواریں لرز اٹھیں، پٹانیں تھرا جائیں، یہ غاروں کا سلسلہ اس کے نعرۂ حقارت سے گونج اٹھے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!

جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ دھوکا۔ خود فریبی۔

نرمل نہ کمیونسٹ تھا اور نہ کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتا۔ مگر ایک دن وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پارٹی سکریٹری پورن چندر جوشی کا بیان لینے گیا تھا کہ یکایک سڑک کی طرف سے کچھ نور کی آواز آئی اور سب کھڑکیوں کی طرف بھاگے۔ جھانک کر دیکھا تو ایک بوڑھا سفید داڑھی ٖالا بوری مسلمان اپنے خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ اور ساتھ کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی نچلی منزل کی دہلیز پر مرہٹہ عورتوں کا ایک گروہ کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دلچسپ اور مزے دار تماشا ہو رہا ہو۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی رُوح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

ایک ریڈ کراس کی موٹر آئی، اور بوڑھے بوری مسلمان کی لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ اور سامنے والے مکان میں سے ایک مرہٹہ عورت بالٹی ہاتھ میں لٹکائے نکلی اور جہاں بوڑھے کا خون گرا تھا وہاں نہایت اطمینان سے پانی بہا کر سڑک کو دھو گئی اور کئی روز نرمل کے کانوں میں اُن عورتوں کے قہقہے ایک خوفناک شور بن کر گونجتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس بوڑھے کی سفید داڑھی جو خود کے خون سے رنگین ہو گئی تھی، ایک بھیانک بگولہ بن کر پھڑپھڑاتی رہی۔ اور اسے ایسے معلوم ہوا کہ تمام ہندوستان کی عورتیں کسی ایسے خوفناک اور خونیں مذاق پر ہنس رہی ہیں

لاریوں میں گشت کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن ایک گورے سارجنٹ نے نرمل سے کہا۔

„تم کانگرسی پاکستان نہیں چاہتے، پھر بھی اس وقت بمبئی میں پاکستان قائم ہے یا نہیں؟"

اگلے دن ایک انگریز ٹامی نے نرمل اور اس کے ساتھی رپورٹروں سے کہا۔

„تم لوگ تو کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگاتے تھے نا؟ ہم سے کہتے تھے نکل جاؤ ہندوستان چھوڑ دو۔ اب ہم چھوڑنے کو تیار ہیں تو کیوں ہماری خوشامد کرتے ہیں کیوں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو؟ ہماری حفاظت کا مطالبہ کرتے ہو؟ ہندو کہتے ہیں ہمیں مسلمانوں سے بچاؤ، مسلمان کہتے ہیں، ہمیں ہندوؤں سے بچاؤ، پر دونوں ہماری حفاظت، ہماری توپوں اور بندوقوں کے محتاج ہیں۔ دونوں کہتے ہیں DONT QUIT INDIA اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہندوستان کی آزادی کا محل اڑاڑا دھم گر پڑا ہو۔ جیسے پچھلے سو برس کی تمام قومی روایتیں ایک لمحے میں مٹی میں مل گئی ہوں ...

... ترک موالات اور تحریک خلافت، سودیشی اور بائیکاٹ، جلیان والا باغ کی قربانی، گاندھی جی اور علی برادران، بھگت سنگھ، ستیاگرہ اور سول نافرمانی ... ... تمام نعرے اور قومی گیت، ہندستان کا اتحاد اور ہندوستان کی عزت اور آبرو ... ... آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوّری ... ... ہر چیز مٹی میں مل گئی ہو۔

„مٹی میں مل کر بھی اس کندن کی چمک نہیں گئی" گائیڈ بک رہا تھا۔

„اجنتا، ہندستان کے آرٹ اور ادب، موسیقی اور شاعری اور مصوری کا لافانی شاہکار ہے" بھارتی کہہ رہی تھی۔

مگر نرمل کو اس اندھیرے غار میں بجلی کی پیلی پیلی روشنی کے گھیرے میں بھی سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ حسن نہ آرٹ، نہ معنی، نہ مقصد۔ بجائے احساس حسن کے اس کا دل ایک عمیق غصّے۔ ایک بے پناہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چلا اٹھتا۔

یہ سب کیوں؟ ... ... یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت۔ کیوں؟ اور کس لئے؟ ... ... یہ پہاڑ کی گود سے تراشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری —— کیوں؟ اور کس لئے؟ ... ... بے کار ہیں یہ سب۔ یہ ساری محنت بے کار تھی۔ دنیا کے لاکھوں برس کے ارتقا میں ایک لغو اور مضحکہ خیز لمحہ ... ... بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے ... ... اجنتا سے ہندستان نے نہ کچھ سیکھا ہے اور نہ سیکھے گا۔ یہ غار دنیا سے اصلیت سے سچائی سے فرار کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اجنتا نہ صرف

وہ کہتی۔ نہ جانے کیا دیکھتی رہتیں۔

"میں جانتی ہوں نرمل تمہارے حساس دماغ کو کتنا گہرا گھاؤ لگا ہے، مگر بھگوان کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، اور اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرو۔"

وہ جواب دیتا

"ہاں بھول ہی جانا چاہیئے"، اور وہ سوچتا، "کون کون سے واقعات بھلانے کی کوشش کروں؟"

نرمل کمار قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل اور دماغ لے کر آیا تھا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں، مضامین، انشائیے لطیف اور افسانے ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ امیر باپ کی بیٹی بھارتی اس کی ادبی قابلیت کی قدرداں اور مداح تھی، اس کا بس چلتا تو نرمل کے لئے کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوبصورت بنگلہ بنوا دیتی، جہاں وہ سکون سے اپنے تخلیقی کام میں مصروف رہتا۔ مگر وہ تو ایک روزانہ اخبار میں رپورٹر تھا۔ بھارتی اکثر کہتی کہ اس جیسے ادیب کیلئے جرنلزم اختیار کرنا سراسر ظلم تھا۔

نرمل کہتا موجودہ ہندوستان میں ادبی تخلیق صرف دماغی تعیش ہے اور لکھنے والے کے لئے اخبار نویسی ہی پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹر کی حیثیت سے وہ زندگی کے ڈرامائی عناصر سے دوچار رہتا۔ عدالت کے مقدموں، تھانے کوتوالی کی وارداتوں مزدوروں کی ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں میں اس کو انسانی سیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا اور یہی مشاہدات اس کے تخلیقی سانچے میں ڈھل کر ایسے مضامین، افسانے، اور نظمیں بن جاتے تھے جن میں زندگی کی سچائی زندگی کی تڑپ اور زندگی کی روح نظر آتی تھی۔

رپورٹر کی حیثیت سے نرمل کو فساد کے زمانے میں بھی سارے شہر میں گھومنا پڑتا تھا۔ سینڈہرسٹ روڈ، بھنڈی بازار، پائیدھونی، بائیکلہ، پریل، دادر، سارا شہر میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر محاذ پر خون اور قتل کے واقعات ہو رہے تھے۔ یہاں ایک مسلمان ڈبل روٹی والا مارا گیا۔ وہاں ایک ہندو دودھ والے کو کسی مسلمان نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ یہاں ایک پٹھان کا خون ہوا۔ وہاں ایک پوربی بھیا قتل ہوا۔ یہاں ایک دس برس کے بچے کو کسی نے ذبح کر دیا۔ وہاں ایک گیارہ برس کے بچے نے ایک راہ چلتے آدمی کی پسلیوں میں چاقو بھونک دیا۔

سارا شہر "ہندو بمبئی" اور "مسلمان بمبئی" میں منقسم ہو گیا۔ کسی ہندو کی جرأت نہ تھی کہ بھنڈی بازار میں قدم دھر سکے۔ کسی مسلمان کی ہمت نہ تھی کہ پائیدھونی سے گزر سکے۔ پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان قائم ہو گئے تھے۔ نرمل اور دوسرے رپورٹروں کو اکثر پولس یا فوج کے ساتھ

خون!

”خون خرابے، فساد دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل؟“

بھارتی نے نرمی سے، پریم سے نرمل کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ ایک لہر نے اسے خونی سمندر کے باہر کنارے پر لا پھینکا۔

”کیا۔ کیا کہا تم نے بھارتی؟“

”میں کہہ رہی تھی کہ اجنتا کے ان خاموش پرسکون غاروں میں ہم بمبئی کلکتے کے خون خرابے سے کتنی دور معلوم ہوتے ہیں۔ کئی ہزار برس دور، یہاں تم ضرور ان خوفناک نظاروں کو بھول سکو گے جو تم نے بمبئی میں دیکھے ہیں۔۔۔“

بچاری بھارتی! حسین اور حسن پرست بھارتی؟ اس کا دل پریم سے کتنا بھرپور تھا اور اس کا دماغ سمجھ بوجھ سے کتنا خالی، اسے نرمل سے واقعی محبت تھی اور وہ اسے ایک منٹ کیلئے بھی دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جس دن فساد شروع ہوا اس سے اگلے دن ہی وہ جان گئی کہ نرمل کا نازک اور حساس دماغ اس خون خرابے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چرنی روڈ کے خون کے بعد جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا نرمل نے تین دن کھانا نہ کھایا اور نہ ہی وہ سو سکا۔ اس کو چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ اس نے کسی کو اس کی وجہ نہ بتائی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا بھی تو اس نے ٹال دیا۔ پر، بھارتی سے وہ ہر بات کہہ دیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر نرمل نے اس خونیں واقعہ کی تمام ہولناک تفصیل اس کو سنا دی۔

”اس دبلے پتلے نوجوان کی صورت اب میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے، بھارتی اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون کے سمندر میں ڈوب رہا ہوں، اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔“

اور گھونگر والے بالوں میں اپنی ملائم انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بھارتی نے کہا۔

”بیچارہ نرمل“

اپنی محبت، اپنی باتوں، سینما گراموفون، ریڈیو، کس کس طرح اس نے اپنے دوست کے دل سے اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ناکامیاب رہی۔ نرمل کی شگفتگی اس کی مشہور ظرافت، اس کی حاضر جوابی سرے سے غائب ہو گئی تھی۔ وہ جب کبھی بھی بھارتی سے ملنے آتا تو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اس کی وحشت بھری آنکھیں ٹکٹکی باندھے فضا میں

"سالے کی ہمت تو دیکھو!" ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گردہ میں سے ایک آدمی نے کہا اور گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کا ہاتھ دھاری دار قمیص کے نیچے اپنی میلی دھوتی کی تہوں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

بے فکر دبلا نوجوان اب وسنت کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ اس کے ململ کے کرتے میں سے اس کی ہڈیاں نظر آرہی ہیں۔ سانولا رنگ، چھوٹا سا قد، مگر اچھا ذہین چہرہ۔ کوئی کلرک یا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں نرمل کا جی چاہا، چلا کر کہے "میاں بھائی ذرا سنبھل کر آگے جانا۔ بڑا خراب وقت ہے" پر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اور چشم زدن میں اس نے ایک چمکیلی چھری کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔

چھری دستے تک دبلے پتلے نوجوان کی کمر میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ ایک بار بے اختیار اٹھے شاید بچاؤ کرنے کے لئے، مگر اگلے لمحے میں وہ چکرا کر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے ایک کراہتی ہوئی آواز نکلی جو فریاد بھی تھی اور آخری ہچکی بھی۔

"ہائے بھگوان"

اور ہوٹل کے مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

"ارے یہ تو ہندو ہے ہندو"

"نہیں رے سالا بن رہا ہے"

"پاجامہ پہنے ہندو کیسے ہو سکتا ہے؟"

"سالے کا پاجامہ کھول کر ختنہ دیکھو"

چھری ابھی تک نوجوان کی کمر میں گڑی ہوئی تھی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی آدمیوں نے بڑھ کر سسکتی ہوئی لاش کو پلٹ دیا اور ایک نے کمربند کی ڈوری کو کھینچ کر گرہ کھولی۔

نرمل کی آنکھیں شرم سے بند ہو گئیں، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غلاظت کے ڈھیر میں اس کا منہ رگڑ دیا ہو۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل لاش کو پھر الٹ کر زخم میں سے اپنی چھری باہر کھینچ رہا تھا۔

"یہ تو مشٹیک ہو گیا"

اس نے کہا۔ اور اپنی میلی دھوتی میں سے ایک کترن پھاڑ کر اس سے چھری کا خون پونچھنے لگا۔ چھری جب زخم سے باہر نکلی تو نرمل نے دیکھا کہ زخم سے سیاہی مائل گاڑھا گاڑھا خون بہہ نکلا اور مقتول نوجوان کے کپڑوں کو رنگتا ہوا سڑک پر پھیل گیا۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

یکم ستمبر — شام کو حسب معمول وہ اپنا کام ختم کر کے گرگام اپنے دوست وسنت کے دفتر گیا تھا کہ دونوں ساتھ ہی ٹرین سے دادر جائیں گے کہ خبر آئی کہ شہر میں ہندو مسلم کا فساد ہو گیا ہے۔ کام چھوڑ کر ہر کوئی اس مضمون پر رائے زنی کرنے لگا۔

"تم دیکھنا یہ فساد چند گھنٹے میں دب جائے گا۔ اس بار گورنمنٹ نے پوری تیاریاں کر رکھی ہیں ... ..."

"پر آج کیسے ہو گیا؟ — مسلم لیگ کالے جھنڈوں کا مظاہرہ تو کل کرنیوالی ہے ... ..."

"یہ کلکتہ کی خبروں کا اثر ہے ..."

"سنا ہے کئی ہزار چھرے پکڑے گئے ہیں ..."

"سنا ہے گول پیٹھا پر پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر کو ایک مسلمان پرانے جوتوں کا ہار پہنا رہا تھا ... ..."

"سنا ہے بھنڈی بازار میں مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو مار ڈالا ..."

"پر تم فکر نہ کرو، اب کے ہندو چپکے بیٹھنے والے نہیں ہیں ..."

اتنے میں امبولینس کار کی گھنٹی کی آواز آئی اور سب کھڑکی کی طرف بھاگے سامنے ہرکشن داس اسپتال کے دروازے میں زخمیوں کی موٹر داخل ہو رہی تھی۔ ایک گھٹے ہوئے جسم کے راہ گیر نے جو دھوتی اور میلی دھاری دار قمیص اور کالی مرہٹہ ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسپتال کے دربان سے پوچھا۔

"یہ کون تھے؟ ہندو یا مسلمان؟"

دربان نے جو موٹر میں جھانک چکا تھا جواب دیا۔

"ایک مسلمان، دو ہندو"

اور فوراً کونے کے ہندو ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی

ساری چرنی روڈ پر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہوٹل کے سب دروازے بند تھے۔ صرف بیچ والے لوہے کے جنگلے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ٹرام دیر ہوئی بند ہو چکی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ ہاں اوپر کی منزلوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب تناؤ تھا جیسے تنا ہوا ڈھول چوٹ پڑنے کا منتظر ہو"

یکایک سینڈہرسٹ روڈ کے چوراہے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہر شخص کی نگاہیں آواز کی سمت پھر گئیں۔ ایک دبلا سا نوجوان کرتا پاجامہ پہنے آ رہا تھا۔ بالکل بے فکر جیسے شہر میں فساد ہوا ہی نہیں تھا۔

جیلے ... ... اس کی نگاہیں دیوار پر بنائی ہوئی تصویروں پر ضرور تھیں۔ مگر اسے سوائے دھندلے رنگین دھبوں کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا ... ... اس کے کان گائیڈ کی رٹی ہوئی تقریر کو سن رہے تھے، پر اب تک وہ صرف آواز تھی۔ بے معنی۔ دھیما دھیما شور۔ چرخے یا کولھو یا رہٹ کی روں روں کی طرح ... ... بھارتی جب بولتی تو نرمل کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں پر کوئی غیر متعلق اور قطعی غیر ضروری چوٹ پڑی ہے ... ... جیسے گرمی کی دوپہر میں تانبے کی طرح تپتا ہوا آسمان ایک اڑتی ہوئی چیل کی ہیبت ناک چیخ سے گونج اٹھے ... ...

نہ جانے وہ کس نمبر کے غار میں تھے۔ نہ جانے وہ کس تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے ... ...

گائیڈ کی روں روں جاری تھی ... ... یہ دیکھئے ایک پچھلے جنم میں سنیاسی کے روپ میں مہاتما بدھ اپدیش دے رہے ہیں۔ بنارس کے راجہ کی یہ رنگی مہاتما بدھ کے اپدیش سنتی ہے ... ... راجہ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ خود جاکر سنیاسی سے سوال جواب کرتا ہے ... ... تم کون ہو اور کیا اپدیش دے رہے ہو ... ... وہ کہتے ہیں میں شانتی اور سچائی کا ذکر کر رہا ہوں ... ... راجہ اپنے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ وہ سنیاسی کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان تلوار سے کاٹ ڈالے۔ پر ہر بار مہاتما بدھ نے یہی کہا کہ شانتی اور سچائی تو میرے دل میں ہے۔ ناک، کان، ہاتھ، پاؤں میں نہیں ہے ... ... یہ دیکھئے ان کے زخموں سے خون ... ... ”

خون !

گائیڈ کی بے معنی، لامتناہی روں روں میں سے اس ایک الفاظ نے نرمل کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ایک چوٹ لگائی۔

خون !

اجنتا کے غاروں کی پتھریلی دیواریں یک لخت فضا میں تحلیل ہو گئیں ــــ اب وہاں نہ مجسمے تھے، نہ تصویریں نہ ستون ــــ نہ گائیڈ اور نہ بھارتی ــــ نہ سرسبز پہاڑیاں، نہ وہ سریلے شور کے ساتھ بہنے والی ندی ــــ نہ آرٹ اور نہ تاریخ ــــ نہ دھرم اور نہ مذہب ــــ نہ مہاتما بدھ اور نہ بنارس کا ظالم راجہ ... ...

خون !

خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر۔ اور ان خونیں لہروں پر بہتا ہوا نرمل پھر بمبئی واپس پہنچ گیا۔ وہی خونی بمبئی جس سے بھاگ کر اس نے تین سو میل پرے اور ڈیڑھ ہزار برس پرانے غاروں میں پناہ لی تھی ... ...

اَجَنتا

"اجنتا ہندوستان کے آرٹ کی معراج ہے، دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے ..... بڑے بڑے انگریز اور امریکن یہاں آکر دم بخود رہ جاتے ہیں ... ... یہ غار ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہیں۔ ان کو کھودنے، تراشنے، ان میں مجسمے اور تصویریں بنانے میں کم سے کم آٹھ سو برس کا عرصہ لگا ہوگا... ... مہاتما بدھ کے اس مجسمے کو دیکھیے ... ..."

سرکاری گائیڈ کی منجھی ہوئی آواز غار کی اونچی پتھریلی چھت سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ اور روپیہ ڈیڑھ روپیہ روزانہ بخشش، کے عوض وہ اپنا طوطے کی طرح رٹا ہوا سبق دن میں نہ جانے کتنی بار دہراتا تھا نرمل کو اس کی آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے رہٹ چل رہا ہو یا چرخہ یا کولھو۔ روں، روں، روں، روں ... ایک بے معنی، بے روح آواز کا لامتناہی سلسلہ جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

بھارتی ــــ جو آرٹ کی پرستار بھی تھی اور خود آرٹ کا ایک نادر نمونہ بھی ــــ گائیڈ کے الفاظ پر سر دھن رہی تھی۔ ہزاروں برس پرانے آرٹ کے اس اتھاہ سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتی تھی۔ ہر تصویر، ہر مجسمے، ہر ستون، ہر محراب، ہر پھول اور پتی کو دیکھ کر اس کے منہ سے تعریف کا چشمہ بے اختیار پھوٹ نکلتا تھا ــــ "اوہ نرمل یہ دیکھو ... ... اوہ نرمل وہ دیکھو ... ... مہاتما بدھ کے چہرے پر کتنا سکون اور شانت اکسپریشن ہے ... ... اس اپسرا کے بالوں کا سنگھار تو دیکھو ... ... ہاؤ سویٹ ... ... کتنا سندر ... ... ہاؤ ونڈرفل ... ..."

نرمل خاموش تھا۔ وہ نہ گائیڈ کی روں روں سن رہا تھا اور نہ بھارتی کے پُرجوش تعریفی

وہاں کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑی ہے اور..... اور......؟

"اور ؟" میں نے پوچھا۔

میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔

اس شام کو جب میں اسے چھوڑنے سٹیشن پر گیا اور ہم ٹکٹ خریدنے لگے تو بابو نے حسب معمول پوچھا "سنگل یا ریٹرن"۔ تو برجو نے جلدی سے کہا "سنگل" اور پھر پلیٹ فارم پر پہنچ کر مجھ سے بولا۔ یہ میرا آخری سفر ہے۔ اس پر مجھے واپسی کے ٹکٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔

ٹرین روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک عجیب معجزہ دیکھا۔ وہ جھریوں دار چہرے اور کھچڑی بالوں والا بوڑھا اب بوڑھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے گال ایک عجیب مسرت اور جوش سے تمتما رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی چمک رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک کردار بن آگیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے وہ اپنا وہی پچیس برس والا برجو لگا۔

میں نے کہا "برجو لکشمی بھابی کو میرا پرنام ضرور کہنا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہم تمہارے رقیب نہیں ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ وہ نئے نویلے دولہا کی طرح شرما رہا ہے۔

بے کار تمہاری جیب میں پڑا رہا؟"

یہی تو مشکل ہے، میرے دوست۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ زندگی کے سفر میں ریٹرن ٹکٹ نہیں ملتا۔ جہاں سے ہم چلے ہیں اور جن مقاموں سے گزرے ہیں ہزار کوشش کرنے پر بھی ہم وہاں لوٹ کر نہیں جا سکتے۔

تو اب کیا ارادہ ہے؟ میں نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

برجو نے کہا میں نے موہنا کو لندن کا گھر دے دیا ہے۔ اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھ دی ہے۔ اس قیمت پر وہ مجھے طلاق دینے پر راضی ہوئی ہے۔

"تو کیا وہ ـــــ موہنا ـــــ ہمیشہ سے ایسی تھی؟"

"نہیں۔ تب ہی تو پچیس برس نباہ کرنے کی کوشش کی میں نے"

پھر ایسی کیسے ہو گئی؟"

کچھ دیر تک برجو خاموش رہا۔ اس نے نیا سگار جلایا۔ آہستہ آہستہ اس نے کئی کش لئے۔ پھر وہ بولا۔ گناہگار تو میں ہی ہوں۔ میں اسے وہ کچھ نہ دے سکا جسے وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ کوشش کرنے کے باوجود میں اس سے محبت نہ کر سکا۔

تو کیا اسے لکشمی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا؟"

"شادی کے سال بھر بعد معلوم ہو گیا تھا۔ اس وقت میری پوسٹنگ فرینکفرٹ میں تھی۔ ایک رات میں کلب سے بہت شراب پی کر لوٹا تھا۔ جب میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لئے گیا تو چاندنی میں دیکھا کہ سفید کپڑے پہنے لکشمی میرے پلنگ پر لیٹی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بہت پیار کیا۔ اس نے کہا برجو تم رو رہے ہو؟ کیا ہوا؟ میں نے کہا۔ وعدہ کرو اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاؤ گی۔ لکشمی لیکن وہ لکشمی نہیں تھی۔ اور اس رات کے بعد سے موہنا بھی وہ نہ رہی۔ کچھ اور ہی ہو گئی اس نے میرے ساتھ شراب پینا شروع کی۔ پھر دوسروں کے ساتھ۔ اس کے بعد جو ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے۔ مگر میں اب بھی اس کو دوش نہیں دیتا۔ اپنی تباہی اور اس کی تباہی دونوں کا ذمہ دار میں ہوں"

اور لکشمی"

اس کی زندگی بھی میری وجہ سے تباہ ہو گئی۔ جب میرا سہارا چھٹ گیا تو اسے اپنی ماں کے پاس جانا پڑا۔ وہ سب کرنا پڑا جس سے صرف میں اسے بچا سکتا تھا۔ بنارس سے دہلی کے چاوڑی بازار میں آئی۔ وہاں سے کلکتہ کے سوناگاچی میں۔ وہاں سے بمبئی کے فارس روڈ پر۔

اب سنا ہے کہ وہ بوڑھی اور بیمار، اس دھندے کے لئے بے کار ہو کر بنارس لوٹ گئی ہے

موہنا۔ اور میں نے اس حسین چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی جو میں نے لکھنؤ کے مے فیئر سینما میں دیکھا تھا۔ اور پچیس برس کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ کاجل کا حاشیہ لگی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب آگ چمک رہی تھی۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن اسی آگ میں برجو کی زندگی جھلس جائے گی۔ "اور لکشمی؟" میں نے پوچھا۔ "لکشمی کا کیا ہوا؟" "آخری بار جب ہم لکھنؤ میں ملے تھے مجھے یاد پڑتا ہے تم تین دن کا واپسی کا ٹکٹ لے کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ اپنے ماں باپ کو اس شادی کی اطلاع دینے؟"

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ جیب سے ایک پرانا بٹوا نکالا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ۔ اس کاغذ کی تہوں میں سے ایک ریلوے ٹکٹ کا آدھا حصّہ نکالا جو برسوں کے بعد اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اس پر چھپے ہوتے سب حرف غائب ہو گئے تھے۔ صرف اس کے سائز سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی یہ ریٹرن ٹکٹ کا واپسی والا آدھا حصّہ رہا ہوگا۔

اب میں کچھ کچھ سمجھا کہ کیا ہوا ہوگا۔

"تو جب تم گھر پہنچے تو کنور صاحب اور کنور رانی کو قائل نہ کر سکے؟ تمہارے ماتا پتا نے تمہیں جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی؟"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔

"انھوں نے تمہیں لکھنؤ واپس جانے سے بھی روک دیا؟"

اس کے سر کی جنبش نے اثبات میں جواب دیا۔

"انھوں نے زبردستی تمہاری شادی اپنے جاگیردار دوست کی بیٹی موہنا سے طے کر دی؟ انھوں نے تمہیں انگلستان بھیجنے کا لالچ دیا۔ انھوں نے تمہیں ڈرایا کہ اگر تم نے طوائف کی بیٹی سے شادی کر کے سماج میں طوفان برپا کیا تو تمہیں نہ صرف آئی سی ایس سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ کوئی بھی معقول نوکری نہ مل سکے گی۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ فلموں میں بھی۔ زندگی میں بھی۔ اور اُن دنوں میں تو اور بھی کچھ ہوتا تھا۔ سماجی انقلاب کے بارے میں تقریر کرنا اپنی زندگی میں انقلاب لانے سے زیادہ آسان تب بھی تھا اور اب بھی ہے۔"

اپنی اسی کمزوری کا خمیازہ آج تک میں بھگت رہا ہوں۔ میں جدید و اس کی کمزوری پر ہنستا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسی باتیں کر کے اپنے آپکو سزا دینا چاہتا ہے۔

"اور سنو ریٹرن ٹکٹ کی تین دن کی مدّت گزر گئی اور تم لکھنؤ واپس نہ آئے اور واپسی کا حصّہ

نئی زندگی بنا سکوں۔ لیکن وہ نہ مانی۔ "بولی، تم نے میری زندگی تباہ کی ہے اب تم مجھ سے اتنی آسانی سے چھٹکارا نہ پاؤ گے"

"پھر؟" میں نے نرمی سے کہا۔

پھر میں ان دونوں کو لے کر انگلستان چلا گیا۔ ہندوستان میں اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ پنشن بیچ کر جتنا روپیہ وصول ہوا اس سے میں نے لندن میں مکان خرید لیا۔ ایک حصّے میں ہم خود رہتے تھے اور باقی میں ہندوستانی اور افریقین طالب علم کرایہ دے کر رہتے تھے بس یہی ہمارے گزارے کی صورت تھی۔

"پھر؟"

پھر وہی پرانی کہانی دہرائی جاتی رہی۔ اب مجھ میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ میں اس بدکار سے کچھ باز پُرس بھی کر سکتا۔ رات کو جب تک "پیاؤ" بند نہ ہوتا میں وہاں بیٹھا شراب پیتا رہتا تھا اور وہ نوجوان طالب علم کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتی تھی۔ دس سال میں تین اور بچّے ہو گئے۔ ایک بالکل کالا۔ ایک سانولا۔ ایک گورا۔

مجھے اپنے دوست کی حالت پر رحم بھی آ رہا تھا اور غصّہ بھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول ہی پڑا۔ "اور تم نامردوں کی طرح سب دیکھتے رہے۔ اور تم سے یہ نہ ہوا کہ دو جوتے رسید کرتے اور نکال باہر کرتے اس چھنال کو۔ میں نے چوبیس برس ہوتے تم سے کہا تھا۔ بر جو رنڈی کی بیٹی سے سوائے بے وفائی کے تم اور کچھ نہ پاؤ گے"

"رنڈی کی بیٹی؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں ہاں رنڈی کی بیٹی لکشمی!" میں نے نفرت سے بھرپور لہجے میں وہ نام لے ہی ڈالا جو اتنی دیر سے ہم دونوں کے درمیان ایک پہیلی بنا ہوا تھا جس کو بوجھنے کی ہمت نہ مجھ میں تھی نہ اس میں۔

"لکشمی؟" اس نے ایسے لہجے میں دہرایا جیسے عمر میں پہلی بار یہ نام سنا ہو۔ پھر وہ بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستا رہا، ہنستا رہا۔ ایک قہقہے کے بعد دوسرا قہقہہ، اسے ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ لیکن اس ہنسی میں ایک کھوکھلی سی آواز ہی آواز تھی کوئی مسرت نہ تھی۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

"تو تم سمجھ رہے ہو کہ میں اب تک تم سے لکشمی کا ذکر کر رہا ہوں؟"

"تو اور کیا؟" میں نے کہا "اسی سے تو تم نے شادی کی تھی نا؟"

"کاش ایسا ہی کیا ہوتا۔ دوست" اس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سی سانس بھر کر کہا۔ "مگر جس سے میری شادی ہوئی وہ طوائف کی بیٹی لکشمی نہیں تھی ـــــ ایک جاگیردار کی بیٹی موہنا تھی۔

پھر میں نے کہا۔ کیوں بھئی اکیلے ہی آئے ہو۔ بھابی ساتھ نہیں ہیں کیا؟"

اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا "میں نے طلاق لے لی ہے"

لیکن اب کم سے کم اس کی پریشانی کی وجہ تو معلوم ہوگئی۔ اتنے برسوں کے شدید عشق کے بعد اگر طلاق کی نوبت آئی ہے تو اس حالت پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے تھا۔

میں نے کہا۔ "بڑا افسوس ہے برجو لیکن ہوا کیا جو طلاق لینی پڑی؟ اس عمر میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

"میاں بیوی!" اس نے دونوں لفظوں کو کسی کڑوی دوا کی طرح تھوکا۔ "پہلے دن ہی سے ہماری شادی ایک جھوٹ تھی۔ ایک بھیانک غلطی تھی۔ چوبیس برس تک میں نے اس غلطی سے نباہ کیا۔ اس جھوٹ کو سچ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں کامیاب نہ ہوا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ میرے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی وہ بے چارہ مجھ سے کوئی صلاح مشورہ کرنے کے لئے نہیں اپنے دل کا بخار نکالنے کیلئے آیا تھا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے ایک سگار جلایا اور منہ سے دھوئیں کا ایک بادل اڑاتا ہوا بولا"

تم سوچ رہے ہو ناکہ میں اتنے برس کہاں غائب رہا۔ شادی کے فوراً بعد ہی میں بیوی کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر انگلستان چلا گیا۔ آئی سی ایس کا امتحان دیا اور بدقسمتی سے پاس ہوگیا۔

"تو تم آئی سی ایس میں تھے۔ اور ہمیں کبھی پتہ ہی نہ چلا؟"

میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تم لوگ ان دنوں سرکاری نوکریوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے۔ ستیاگرہ کر کے جیل جا رہے تھے میں کس منہ سے تم لوگوں کے سامنے آتا۔ اس لئے میں نے جان بوجھ کر ایسے ایسے مقام چنے جہاں کسی پرانے دوست سے ملاقات نہ ہو۔ پہلے کئی سال فرینٹر میں رہا پھر آسام میں۔ پھر کورگ میں وہیں ہمارا پہلا لڑکا پیدا ہوا......"

کتنی ہی دیر وہ دھوئیں کے بادلوں میں نہ جانے کیسی کیسی تصویریں بناتا اور بگاڑتا رہا۔

پھر بولا — مگر وہ لڑکا ہمارا نہیں تھا۔ وہ اس کا لڑکا تھا۔ جو میرے ایک چپراسی سے پیدا ہوا تھا جب مجھے یہ معلوم ہوا تو تم سمجھ سکتے ہو کہ میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چند مہینے تک تو میں بالکل پاگل ہوگیا۔ شراب تو میں پہلے بھی پیتا تھا لیکن اب میں اپنی ذلّت کو ڈبونے کے لئے اندھا دھند پینا شروع کر دیا۔ جب وہسکی سے کام نہ چلا تو کوکین کھانے لگا۔ تین مہینے پاگل خانے میں علاج کرایا۔ اور جب علاج کر کے حواس پر کسی قدر قابو پایا اور باہر نکلا تو نوکری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ذلیل ہو کر نکالے جانے سے یہی بہتر تھا کہ میں خود ہی بیماری کا بہانہ کر کے وقت سے پہلے پنشن کی درخواست دے دوں۔ میں نے اس کی منت کی کہ مجھے طلاق دے دو اور بچہ لے جاؤ۔ میری ساری پنشن لے لو۔ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنی

اس بار گھنٹی بھی تو وہ ٹیلیفون کی نہیں تھی، دروازے کی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ایک ڈھیلی سی ملگجی سی بش شرٹ اور پتلون پہنے ایک بوڑھا سا آدمی کھڑا موٹے موٹے شیشوں کے عینک سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا پورٹ فولیو تھا۔ جیسا انشورنس ایجنٹ رکھتے ہیں۔ عین اسی وقت جب میں اور برجو پچیس برس بعد ملنے والے تھے یہ بوڑھا انشورنس ایجنٹ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔

کیا چاہئے؟" میں نے قدرے درشتی سے پوچھا۔

جھریوں دار گہرے سانولے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا، کیوں بھول گئے؟"

برجو! اگلے لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔

میں بہت بدل گیا ہوں گا؟"۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ تم نے بھی نہیں پہچانا۔

یہ واقعہ تھا کہ پچیس برس پہلے کے برجو اور اس بوڑھے میں کوئی دور کی بھی مشابہت نہ تھی میں نے سوچا ضرور بے چارہ سخت بیمار رہا ہوگا۔ تبھی تو اس کے چہرے اور بازوؤں پر کھال اسطرح لٹکی ہوئی ہے جیسے اس کے ڈھیلے کپڑے۔ میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ پچیس برس میں ہم سب ہی بدل گئے ہیں۔ مجھے ہی دیکھو چندیا بالکل صاف ہوگئی ہے۔

اس نے کہا۔ میں نے تمہارا نام ٹیلیفون ڈائرکٹری میں تلاش کیا۔ امید تو نہ تھی تم ملوگے۔ سنا ہے اکثر ہندوستان سے باہر رہتے ہو۔

ٹیلیفون کے ذکر پر میں نے کہا" میں تو فون پر تمہاری آواز سن کر سمجھا تھا کوئی انگریز یا امریکن ہے جس سے میں کہیں سفر میں ملا ہوں گا۔"

"اوہ میرا ACCENT ایکسنٹ؟ میں بھی تو کتنے ہی برس انگلستان میں رہا ہوں۔ ویسے ہی بات کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔"

نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہے اور اسی بات کو چھپانا بھی چاہتا ہے۔

کئی قسم کے خیالات اور خدشے میرے دماغ میں آتے

شاید اس کی نوکری چھٹ گئی ہے۔ بیکار ہے۔ شاید مدد مانگنے آیا ہے۔ شاید اس کو شراب کی لت پڑ گئی ہے تب ہی بہکا بہکا سا لگتا ہے اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی ہیں۔

شاید اس نے کوئی جرم کیا ہے۔ اس لئے اس کی آنکھیں بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہیں۔

کچھ سیکنڈ تک ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں اپنے ماضی کی تلاش کرتے رہے۔

دوستی اور محبت کی چھاؤں میں پناہ دیتے ہیں

اس کے بعد میرا کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا تھا۔ تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟

اس نے کہا تھا۔ کل میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ اپنے ماں باپ کو اس فیصلے کی اطلاع دینے۔ ماتا جی بیمار ہیں اس لیئے خط لکھ کر ان کو ایک دم SHOK دینے کے بجائے خود جا کر انھیں زبانی سمجھانا چاہتا ہوں اور اگر وہ لوگ راضی نہ ہوتے تو؟

تو ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر یہ شادی ہوگی۔ اور اس کے کہنے کے انداز میں اتنی قطعیت تھی کہ میں خاموش ہو گیا۔

اگلے دن ہم اکھٹے ہی اسٹیشن پر گئے۔ پہلے اس کی گاڑی جاتی تھی اس کے بعد میری۔ ٹکٹ کھڑکی پر جا کر جب اس نے کہا ”ایک فرسٹ کلاس شام نگر“ تو بابو نے پوچھا ”سنگل یا ریٹرن“

”ریٹرن“ اس نے بڑے زور سے کہا۔ ہمیشہ واپسی کا ٹکٹ ہی لینا چاہیئے۔

لکشمی بھی اسے چھوڑنے اسٹیشن پر آئی تھی۔ جب گارڈ نے سیٹی دی اور جھنڈی ہلائی اور برجو اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوا تو لکشمی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

”اری پگلی۔ گھبراؤ نہیں“ برجو نے چلتے چلتے چلا کر کہا۔ ”میں تو پرسوں ہی لوٹ آؤں گا۔ یہ دیکھ تین دن کا ریٹرن ٹکٹ۔“

ریل چل پڑی تھی۔ اور ریل میں برجو تھا۔ برجو کے ہاتھ میں ایک ہرا واپسی کا ٹکٹ تھا۔ پھر ریل آگے جا کے اپنے دھوئیں کے بادل میں کھو گئی۔ اور اب نہ ریل تھی نہ برجو اور نہ وہ واپسی کا ٹکٹ اور اب پلیٹ فارم پر صرف لکشمی تھی۔ لکشمی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ان آنسوؤں میں پریتم سے بچھڑنے کا غم بھی تھا اور اس سے جلد پھر ملنے کی آرزو اور امید بھی تھی۔

میں علی گڑھ واپس چلا آیا۔ امتحان کی تیاریوں میں لگ گیا۔ چند ہفتے میں نے برجو کے خط کا انتظار کیا۔ مگر کوئی خط نہ آیا۔ میں نے سوچا نئی نئی شادی ہوئی ہے شاید ہنی مون پر کہیں گئے ہوں۔ پھر امتحان کے چکر میں سب کچھ بھلانا پڑا۔ امتحان ختم ہوا تو مجھے نوکری کے سلسلے میں بمبئی آنا پڑا۔ نئے نئے کام کا ایسا چکر پڑا کہ علی گڑھ، لکھنؤ، برجو، لکشمی سب پرانی یادیں بن کر کھو گئے۔ ۱۹۴۲ء کا سیاسی ہنگامہ آیا۔ ۱۹۴۶ء میں فساد اور خون خرابے ہوتے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ میں کئی بار دنیا کے سفر کو گیا۔ زندگی میں کتنی ہی خوشیاں اور کتنے ہی غم آئے اور بگولوں کی طرح گزر گئے۔ کتنی ہی کامیابیوں اور ان سے بھی زیادہ پریشانیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر بھی برجو اور لکشمی کی یاد ایک سوالیہ نشان بن کر میرے دل کے ایک کونے میں دبکی رہی اور اس صبح جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، وہ سوالیہ نشان دن دہاڑے ایک بھوت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

میں نے کہا: ہم مسافروں سے کیا پردہ۔ ہم تمہارے رقیب نہیں ہیں یار۔"

"تو پھر آج شام کو چار بجے مے فیر ریستوران میں چائے پیو اور اس سے ملو۔

"کون۔ موہنا؟"

نہیں موہنا تو بور ہے۔ اگرچہ میرے ماتا پتا اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے لیکن جس سے میں تمہیں ملانا چاہتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے۔"

چار بجے مے فیر میں داخل ہوا تو ایک کونے کی میز پر برجو کے پاس سفید ساڑی میں ملبوس ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ میں بالکل قریب پہنچ گیا تب بھی اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔

تم ان سے مل چکی ہو؟" برجو نے کہا اور سفید ساڑی والی لڑکی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

وہ لکشمی تھی!

نمستے!" اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

نمستے!" میں نے نہایت بد دلی سے جواب دیا اور کرسی پر بیٹھ کر بینڈ کی دھن سننے لگا۔

اس شام کو گومتی کے کنارے گھومتے ہوئے گھنٹوں میں اور برجو اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔

میں نے کہا، برجو تم پاگل ہو گئے ہو کہ موہنا جے پال سنگھ اور آشا سکسینہ اور کرونا بنرجی اور سرلا ماتھر جیسی خوبصورت پڑھی لکھی بڑے خاندانوں کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس طوائف سے شادی کر رہے ہو۔

لکشمی طوائف نہیں!" اس نے غصّے سے کہا۔"

"طوائف نہ سہی طوائف زادی سہی، مگر تم نے اس میں کیا دیکھا ہے جو ساری دنیا کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اسے پسند کیا ہے؟"

وجہ تو ایک ہی ہے، میرے دوست۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میری خاطر اپنے گھر والوں کو، اپنے پیشے کو اپنے ماضی کو چھوڑ کر چلی آئی ہے۔ اگلے مہینے ہم شادی کرنے والے ہیں۔

اور تم سمجھتے ہو کہ تمہارے گھر والے تمہیں اس حماقت کی اجازت دے دیں گے؟

مجھے ان کی اجازت نہیں چاہئے۔ زندگی کے ایسے فیصلوں کے لئے کسی کی اجازت نہیں چاہئے۔ ماں باپ کی بھی نہیں، دوستوں کی بھی نہیں۔

شکریہ، میں نے بڑی تلخی سے کہا تھا۔ تو پھر مجھے یہ سب کیوں سنا رہے ہو؟"

چلتے چلتے رک کر اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ تمہاری اجازت نہیں چاہئے، تمہاری محبت چاہئے۔ دوست جج بن کر اپنے دوستوں کے اعمال کی جانچ پڑتال نہیں کرتے ان کو اپنی

اس نے مجھے پورے لکھنؤ کی سیر کرائی۔ اور اس بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکیوں میں کتنا مقبول ہے۔

ہم یونیورسٹی یونین کے کیفے میں چائے پی رہے تھے کہ کرونا بنرجی مل گئی اور کہنے لگی۔ دیکھو مسٹر برجیندر کو مارا مارے بنگالی کالج کے پروگرام میں زرور آنا۔ ہم گرو دیو کا ناٹک رکتو کر د بی کر رہے ہیں۔"

اور جب برجو نے کہا، کرونا میرا آنا تو مشکل ہے۔ یہ میرے دوست علی گڑھ سے آتے ہوتے ہیں۔ ان کو لکھنؤ کی سیر کرا رہا ہوں"، تو وہ بولی "تو اپنے فرینڈ کو بھی لے آئیے نا پلیز" اور اُس کی جیمنی رائے کی تصویر جیسی بنگالی آنکھوں میں پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔

وہاں سے مجھے وہ لائبریری دکھانے لے گیا تو سرلا ماتھر سے ملاقات ہو گئی جو برجو کو کوی سمیلن میں مدعو کرنے کے لیے تلاش کر رہی تھی۔ وہ بولی برجیندر جی! یہ میں نے ایک نئی کویتا لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر بتائیے گا کیسی ہے میں کوی سمیلن میں بھی پڑھنے والی ہوں۔ جب وہ چلی گئی تو برجو نے کویتا مجھے دکھائی۔ عنوان تھا، میرے سپنے" اور دو ہی سطریں سن کر میں جان گیا کہ اس بیچاری کے سارے سپنوں کا مرکز برجو ہی تھا۔

شام کو ٹینس کلب میں آشا سکسینہ سے ملاقات ہوئی جن کا اصرار تھا کہ برجو ٹینس ٹورنامنٹ میں مکسڈ ڈبلز کے لیے ان کا پارٹنر بن جاتے اور جس انداز سے وہ اسے "پارٹنر پارٹنر"، کہہ کر بلا رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں برجو کو زندگی بھر کا "پارٹنر"، بنانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔

مے فیئر ریستوران میں چائے پینے گئے تو وہاں ایک نہایت خوبصورت اور اسمارٹ لڑکی "ہیلو برجو" کہہ کر دوڑی اور جب برجو نے اس کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا وہ ہے موہنا جپال سنگھ میں نے دیکھا اس کی کاجل لگی آنکھوں میں برجو کو دیکھتے ہی ایک عجیب سی آگ چمک اٹھی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے ان بھوکی، سلگتی ہوئی آنکھوں سے ڈر سا لگا۔

اگلے دن میں نے برجو سے پوچھا۔ ارے یار تم بڑے خوش قسمت ہو کہ یہ سب لڑکیاں تم پر مرتی ہیں۔ مگر اب تک یہ نہ پتہ چلا کہ تم کس سے دلچسپی لیتے ہو۔ یا سب سے ہی فلرٹ کرتے ہو؟۔

وہ بولا، میں کس میں دلچسپی لیتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے اور اس سے میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں۔

میں نے کہا۔ اگر ان سب حسین اور اسمارٹ لڑکیوں کو چھوڑ کر تم نے کوئی اور پسند کی ہے تو وہ واقعی کوئی خاص چیز ہوگی۔ ہمیں بھی ملاؤ۔

اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ خاص چیز تو ہے وہ۔ اسی لیے میں نے اسے پردے میں رکھ چھوڑا ہے۔

اس گوشت میں زہر ہے تو

برجو نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

مجانتا ہوں۔ مگر کسی کا دل دکھانے سے زہر کھالینا بہتر ہے

"چلو گوند ہم چلتے ہیں" میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا ایک عزیز دوست گندی نالی میں گر پڑا ہے اور وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا۔

"اچھا تو پھر اگلے سال لکھنؤ کی ڈبیٹ میں ملیں گے" برجو نے مجھ سے صلح کرنے کے لئے آواز ی مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ برجو کا جو خیالی مجسمہ میں نے اپنے من میں بنایا تھا اس لمحے میں چکنا چور ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سماجی انقلاب پر تقریر کرنے والا برجو، مہاتما بدھ کے پوتر گ پر چلنے والا برجو ایک معمولی رنڈی باز نکلے گا۔

غصے سے بھرا میں زینے سے اتر ہی رہا تھا کہ آواز آئی۔ "سنئے" مڑ کر دیکھا تو للکشمی تھی۔ اس کا ہ تمتمایا ہوا تھا اور اس کے لبوں کے کنارے کانپ رہے تھے۔

"میں نے آپ کے دوست کو روک لیا" وہ بولی "اس کے لئے میں آپ سے شما مانگتی ہوں"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور مڑ کر جانے لگا۔ اس پر اس کی آواز میں تیر کی سی تیزی تھی۔ "انے سے پہلے یہ سنتے جائیے کہ میں انگریزی سمجھتی ہوں اگر میں زہریلا گوشت ہوں تو کبھی یہ بھی سوچئے گا میرے جیون میں یہ وِس کس نے گھولا ہے۔

میں کوئی جواب نہ دے سکا اور وہاں سے چلا آیا۔

اگلے برس جب میں لکھنؤ آل انڈیا ڈبیٹ کے لئے گیا تو میں اس واقعہ کو تقریباً بھول چکا تھا۔ ونیورسٹی کے طالب علموں کا کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے جانا یا وہاں رات بھر کے لئے بھی ٹھہر جانا وئی ایسا غیر معمولی سانحہ نہیں کہ اس پر برسوں سوچ بچار کی جائے۔ برجو کا رویہ اس وقت مجھے ضرور بُرا لگا تھا۔ مگر بعد میں میں نے یہ سوچ کر اسے معاف کر دیا تھا کہ جوانی میں ایک آدھ بار کس کے پیر نہیں لڑکھڑاتے۔

وہ اسٹیشن پر مجھے لینے آیا تھا اور اگلے تین دن تک تقریباً وہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہا۔ وہ بی اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکا تھا اور اب ایم اے میں پڑھ رہا تھا کہنے لگا "میرے ماں باپ تو چاہتے ہیں میں آئی، سی، ایس کے مقابلے میں شریک ہوں۔ لیکن میں سرکاری نوکری کرنا نہیں چاہتا

میں نے پوچھا "تب کیا کرو گے؟"

بولا "ایم اے کر کے کسی چھوٹے موٹے کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا۔ یا ایل ایل بی کر کے وکالت کروں گا۔ ورنہ تمہاری طرح میں بھی جرنلزم کے میدان میں آکودوں گا۔

نہیں ——— ارے ایک بار لکشمی کو دیکھ بھی لو گے تو نہ جانے لکھنؤ کی کتنی رلیں نکل جائیں گی۔"

مگر برجو نہیں مانا۔ تمھاری لکشمی بائی تم بنارس والوں کو مبارک ——— اور سچی بات یہ ہے کہ کوٹھے والیوں کا گانا سننے میں اپنے کو کوئی دلچسپی نہیں۔"

اور مجھے کہنے کا موقع مل گیا . . . "کیوں سماج سُدھارک جی ویشیا کے گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا . . . ؟"

برجو کو کہنا ہی پڑا . . . "ڈر تو مجھے شیطان کے گھر جاتے ہوئے بھی نہیں لگتا . . ." اور سو ہم لوگ تانگہ لے کر لکشمی کے کوٹھے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اتنے برسوں کے بعد بھی لکشمی کی صورت کو میں نہ بھولا تھا۔

چھوٹا سا بوٹا سا قد، گدرایا ہوا جسم، گوری تو نہیں مگر سُنہری رنگت، گھنے لمبے بال جن کو دو چوٹیوں میں گوندھا ہوا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بوجھل لمبی پلکیں۔ لال رنگے ہونٹ جن پر ایک عجیب سی اُداس سی مسکراہٹ سی کھیل رہی تھی۔ چھوٹی سی مگر بڑی خوبصورت سی ناک جس میں ہیرا جڑی ایک چھوٹی سی نتھنی پڑی ہوئی تھی۔ گوند نے میرے کان میں کہا . . . "اس نتھنی کو اتارنے کے لیے ایک جاگیردار صاحب پچاس ہزار تک پیشکش کر چکے ہیں . . ."

مجرا شروع ہوا۔ ہمیں ماننا پڑا لکشمی جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی سریلی اس کی آواز ہے۔ ٹھمری کے بعد دادرا اور دادرا کے بعد غزل ——— گوند کی فرمائش پر ایک آدھ فلمی گیت بھی ہوا۔ محفل میں کتنے ہی لوگ تھے جو بھوکی نظروں سے لکشمی کو گھور رہے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ خود لکشمی کی نگاہیں برجو کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔

آہستہ آہستہ محفل بکھرتی گئی۔ اپنی اپنی جیبیں خالی کر کے لوگ اُٹھتے گئے۔ پھر صرف ہم لوگ رہ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہا . . . "میری گاڑی کا تو وقت ہو گیا۔ چلو بھئی گوند . . ."

گوند میرے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن جب برجو نے اُٹھنا چاہا تو لکشمی نے اپنا مہندی لگا چھوٹا سا نرم سا ہاتھ اس کے سخت ٹینس کھیلنے والے ہاتھ پر رکھ دیا . . . "آپ کو ہماری قسم کنور صاحب لکھنؤ کی گاڑی میں تو ابھی بہت دیر ہے . . ."

برجو نے حیران ہو کر پہلے میری طرف دیکھا پھر گوند کی طرف۔ اور پھر لکشمی کی طرف جس کا ہاتھ اب تک اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ہمارے ساتھ اُٹھنا بھی چاہتا ہے اور لکشمی کو مایوس کرنا بھی نہیں چاہتا۔

میں نے انگریزی میں کہا۔ شام کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے THIS MLAT IS POISOND

”—— اگر دھرم اور مذہب کے خیال ہی سے میں بیزار نہ ہو گیا ہوتا تو ضرور بدھ مت اختیار کر لیتا ——“

جانتے ہو مہاتما بدھ کا دیہانت کیسے ہوا؟ اس نے میوزیم میں مہاتما بدھ کی شانت اور مسکراتی ہوئی مورتی کے سامنے کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا —— ” وہ ایک غریب اچھوت کے ہاں بھیک مانگنے گئے اور اس بیچارے کے پاس گھر میں صرف سڑا ہوا سؤر کا گوشت تھا۔ وہی اس نے جھولی میں ڈال دیا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ گوشت سڑ کر زہریلا ہو چکا تھا انھوں نے اسے کھا لیا جان دے دی مگر کسی غریب اچھوت کا دل نہیں توڑا ——“

پھر جب ہم یہی باتیں سوچتے ہوئے تانگے میں شہر واپس ہو رہے تھے ہم نے دیواروں پر دیوداس فلم کے اشتہار لگے دیکھے تھے اور برجو نے کہا تھا —— ” اور ایک بھائی دیوداس تھے کہ پاروتی کو تو منجدھار میں چھوڑا ہی تھا چندرا کا دل بھی توڑ دیا۔ اور شراب کے سمندر میں ڈوب گئے۔ مگر سماج نے انسانوں کے درمیان جو کھائیاں کھود رکھی ہیں ان کو پار نہ کر سکے۔“

میں نے کہا تھا —— ” دیوداس کوئی فرضی فلمی ہیرو نہیں تھا۔ شرت بابو نے ایک معمولی انسان کا کردار دکھایا ہے جو سماج کے مقابلے میں ہماری تمھاری طرح کمزور تھا۔“

اور اس نے ہنس کر کہا تھا —— ” تمھاری طرح کمزور ہو گا۔ اگر یہ صورتِ حال مجھے پیش آئی تو میں کمزور ثابت نہیں ہوں گا ——“

اس رات ہم لوگ بنارس سے رخصت ہو رہے تھے لیکن ہماری ٹرینیں آدھی رات کے بعد روانہ ہونے والی تھیں۔ میری ٹرین ڈیڑھ بجے اور برجو کی ٹرین پونے تین بجے۔ ڈبیٹ کیلئے اور جتنے طالب علم مختلف یونیورسٹیوں سے آئے تھے وہ سب جا چکے تھے۔ صرف میں اور برجو رہ گئے تھے اور ہماری دیکھ بھال کرنے کے لیے بنارس یونیورسٹی کا ایک ایم اے کا طالب علم تھا گوند سکسینہ۔

کھانے کے بعد ہم باتیں کر رہے تھے کہ گوند نے کہا —— ” ریل میں تو ابھی کئی گھنٹے ہیں چلیے آپ لوگوں کو گانا سنوا دیں ——“

میں نے اس وقت تک بھی کسی طوائف کا گانا نہیں سنا تھا، مگر بنارس کی گانے والیوں کی بڑی تعریف سنی تھی کہ پکے گانے، دادرا اور ٹھمری میں ان کا جواب نہیں۔ سو میں نے کہا ” یہ اچھا خیال ہے چلو برجو ——“

مگر اس نے کہا —— ” چھوڑو جی، اچھے خاصے یہاں گپ شپ کر رہے ہیں وہاں کوئی کالی موٹی بھدّی بائی جی پان کھا کھا کے پکا گانا سنائیں گی اور ہمیں بور کریں گی ——“

اس پر گوند بولا۔۔ ” تم لکھنؤ والے سمجھتے ہو کہ لکھنؤ کے چوک کے باہر حسن کہیں ہے ہی

اور اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ وہ واقعی میری تعریف کر رہا ہے یا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ میرے دوست ایک بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گے. . ." اور اس پر سارے ہال میں اتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ اس کی لہروں میں میرے تمام زوردار دلائل بہہ گئے۔

اسے ڈبیٹ میں اوّل انعام ملا ——— مجھے دوسرا۔ ——— وہ تین دن علی گڑھ ٹھہرا۔ پہلے دن وہ مسٹر برجیندر کمار سنگھ تھا۔ دوسرے دن صرف "برجو" رہ گیا۔ جب دلوں اور دماغوں کی ہم آہنگی ہو تو غیریت کے فاصلے کتنی جلدی دور ہو جاتے ہیں۔

اسٹیشن پر جب میں اسے چھوڑنے گیا تو میں نے اس سے پوچھا تھا. . . "برجو یہ بات کہ سماجی انقلاب سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری ہے۔ تم نے ایسی ہی ڈبیٹ کی خاطر اتنے زور و شور سے کہی یا تم واقعی اس میں اعتقاد رکھتے ہو؟

پچیس چھبیس برس کے بعد بھی اس کا جواب میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے کہا تھا:
"سنو! ملکوں اور قوموں کی آزادی ضروری ہے لیکن اتنی مشکل نہیں۔ سماجی انقلاب جو ہمارے دماغوں کو صدیوں کے تعصبات اور وہموں سے آزاد کرے وہ مشکل کام ہے، اور جب تک ہمارے دماغ آزاد نہیں ہوں گے ہمارے ملک کی سیاسی آزادی غیر مکمل رہے گی۔"

پھر اس نے اور بڑی پتے کی باتیں کہی تھیں۔ فرض کرو ہندوستان آزاد ہو گیا اور ہمارے تمہارے دماغ مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تعصب اور نفرت کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوئے تو ذرا سوچو کیا ہوگا۔ اتنے برسوں کی تعلیم اور سماج سدھار کی باتیں کرنے کے بعد بھی ہم پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اپنے ذہنوں کو پوری طرح ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کر لیا ہے؟ تم مسلمانوں میں کتنے ہیں جو سچ مچ شیخ، مغل، پٹھان، جلاہے کمہار کو برابر سمجھتے ہیں؟"

میں نے اس سے پوچھا تھا. . . "اور برجو تم. . . ؟ کیا تمہارا دل اور دماغ ان بندھنوں سے آزاد ہے؟ کیا تم بڑے خاندان کے راجپوت ہو کر ایک اچھوت لڑکی سے بیاہ کر سکتے ہو؟ یا کسی طوائف زادی کو اپنی پتنی بنا سکتے ہو؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا. . . "اگر مجھے اس سے محبت ہو تو ضرور کر سکتا ہوں۔ اور وقت آیا تو کر کے دکھا دوں گا۔"

اور پھر اس کی ٹرین آ گئی اور وہ لکھنؤ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ہم ایک اور آل انڈیا ڈبیٹ کے سلسلے میں بنارس میں ملے تھے۔ اور سارناتھ کے کھنڈروں میں ساتھ گھومے تھے اور برجو نے مجھے مہاتما بدھ کے حالاتِ زندگی سنائے تھے اور کہا تھا:

واقعی وہ کتنا قابلِ رشک نوجوان تھا۔

پہلی بار جب میری ملاقات اس سے ہوئی تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی آل انڈیا ڈبیٹ میں حصّہ لینے لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے آیا تھا۔

چھبتیس برس بعد بھی مجھے اس سے وہ پہلی ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔ میں اپنی یونیورسٹی یونین کی طرف سے آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے اسٹیشن گیا۔ اس ٹرین سے لکھنؤ، الہ آباد، بنارس کان پور کے کالجوں کے ڈبیٹر آئے تھے۔ کل ملا کر وہ سب شاید بارہ یا چودہ تھے لیکن ان سب میں ایک سب سے نمایاں تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ قدآور تھا اور بند گلے اور پوری آستینوں کے سوئٹر میں اس کا کسرتی بدن اپالو کے بُت کی طرح گٹھا ہوا اور سڈول تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اور جب میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس کے شیک ہینڈ میں بڑا خلوص تھا اور گرم جوشی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں سے مِل کر اسے واقعی بڑی خوشی ہوئی ہے اسی ایک پل ہی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں بڑے پُرانے دوست ہوں۔ اور برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

پھر آل انڈیا ڈبیٹ ہوئی۔ موضوعِ زیرِ بحث یہ تھا کہ :

"سماجی انقلاب کے بغیر سیاسی آزادی کافی نہیں ہے"

میں اس موضوع کے خلاف بولا اپنی تقریر میں میں نے سامراج کے خلاف اور قومی آزادی کی تحریک کی حمایت میں نہایت جذباتی تقریر کی اور ان لوگوں کو خوب لتاڑا جو جنگ آزادی کی قربانیوں، اور خطروں سے بچنے کے لیے سماج سدھار کے گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ میری تقریر ختم ہوئی تو خوب زور کی تالیاں بجیں اور میں نے یہی سمجھا کہ میں نے میدان مار لیا ہے۔

میرے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے برجیندر کمار سنگھ کا نام پکارا گیا۔ اب وہ سفید فلالین کی پتلون پر بند گلے کا سیاہ جودھپوری کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لباس میں وہ بڑا ہی بج رہا تھا۔ ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ اوپر گیلری میں جہاں چِکوں کے پیچھے گرلز کالج کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں، دلچسپی کی ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی اور چکوں کے بیچ میں سے سیاہ خوبصورت آنکھیں اور رنگین آنچل جھلملانے لگے۔

"مسٹر پریذیڈنٹ" اس نے نہایت شستہ انگریزی لہجہ میں تقریر شروع کی۔ مجھ سے پہلے میرے دوست نے جب اپنی تقریر ختم کی تو سب نے پُرجوش تالیاں بجائیں۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں۔ وہ تقریر واقعی لاجواب تھی۔ میرے خیال میں بہترین تقریر کے لیے انعام میرے اس دوست ہی کو ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ اتنے کمزور دلائل کو اتنی خوبصورتی ادا اتنے زور و شور سے پیش کرنا واقعی بڑا کارنامہ ہے۔

"کوئی چالیس پینتالیس منٹ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ملوں گا۔"

اگلے پینتالیس منٹ تک پچیس برس پرانی تصویریں میرے دماغ میں اُبھرتی رہیں۔

برجو۔

برجیندر۔

برجیندر کمار سنگھ۔

کنور برجیندر کمار سنگھ۔

برجو۔

ہمارا یار برجو۔

برجو دی بیوٹی فُل۔

برجو دی پریسنٹ۔

برجو جو خوبصورت تھا، قدآور تھا، ذہین تھا، ٹینس کا چیمپئن تھا۔ اور یونین میں بہترین مقرر تھا۔

برجو جس کے پیچھے درجنوں لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ہائی کورٹ کے جج جسٹس سرمیش سکسینہ کی بیٹی آشا سکسینہ جو آئی، ٹی کالج میں پڑھتی تھی۔

ڈاکٹر ستیش بنرجی کی لڑکی کرونا جس کی خوبصورت آنکھیں جیمنی رائے کی کسی تصویر سے چُرائی ہوئی لگتی تھیں۔

پروفیسر حامد علی کی چھوٹی بہن، ثریا ماجد علی جس نے کرامت حسین گرلز اسکول کا پردہ دار ماحول چھوڑ کر یونیورسٹی میں اسی سال داخلہ لیا تھا اور جو ہر ڈبیٹ اور ڈرامے میں یونین ہال میں سب سے آگے بیٹھتی تھی تاکہ برجو کو دل بھر کر دیکھ سکے۔

سرلا ماتھر جو ہندی میں ایم۔ اے کر رہی تھی اور کویتا لکھتی تھی اور جس کی ہر کویتا میں برجو کا روپ جھلکتا تھا۔

موہنا جسپال سنگھ جو نہایت خوبصورت تھی اور ایک چھوٹے موٹے جاگیردار کی بیٹی تھی اور جس نے صرف برجو کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

سلویا ٹامسن جو اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی تھی اور ریلوے کلب کے ہر ڈانس میں برجو کو دعوت دینے خود اس کے ہاسٹل جاتی تھی۔ حالانکہ وہاں لڑکیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

برجو ——

انگریز بول رہا ہے۔

پھر اس نے انگریزی میں پوچھا۔

”کیا میں خواجہ احمد عباس سے بات کر سکتا ہوں؟“

میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا —— ”میں عباس ہی بول رہا ہوں۔ کہیے، کون صاحب بول رہے ہیں؟“

دفعتاً فون کے دوسرے سرے پر انگریزی ہندوستانی میں بدل گئی مگر لہجہ ولایتی رہا۔ جیسے کوئی انگلستان سے پڑھ کر دس برس بعد حال ہی میں لوٹا ہو۔ کیوں بھائی میری آواز پہچان سکتے ہو؟

میں تکلفاً جھوٹ بولا —— ”آواز تو آپ کی جانی بوجھی معلوم ہوتی ہے لیکن معاف کیجیے گا۔“

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ بڑے بے تکلف انداز میں مگر لہجہ وہی ولایتی رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انگریزی فوج کا کرنیل ہندوستانی بول رہا ہو —— ”چھوڑو یار۔ تم میری آواز پورے پچیس برس بعد سن رہے ہو۔ آخری بار ہم لکھنؤ میں ملے تھے۔ انیس سو چھتیس میں۔“

نہ جانے کیسے میرے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ میں نے کہا ”برجیندر کمار سنگھ؟ برجو؟“

ادھر سے آواز۔ ”رائٹ برجو۔“

برجو، میں نے خوشی سے چلّا کر کہا —— کہو بھئی اتنے دن کہاں رہے، کیا کرتے رہے؟ آج کل کیا کرتے ہو؟“

ٹیلیفون پر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری طرف جواب دینے سے پہلے اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی ہو۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز بالکل ہی بدلی ہوئی تھی جیسے ایک دم کسی گہری فکر میں ڈوب گئی ہو۔ ”یہ سب ایک لمبی کہانی ہے۔ کیا میں تم سے ابھی ملنے آسکتا ہوں؟“

میں نے کہا۔ ”میں تو شہر سے بہت دور جوہو میں رہتا ہوں۔ مگر ہر روز دوپہر کو میں شہر آتا ہی ہوں۔ ایسا کیوں نہ کریں کسی ریستوران میں اکٹھے لنچ کھائیں۔ اب یہاں بمبئی میں بھی تمھارے لکھنؤ کی طرح ایک مے فیر (MAYFAIR) ریستوران کھل گیا ہے۔

”مے فیر؟“ اس نے ریستوران کا نام ایسے دہرایا۔ جیسے دفعتاً کسی نے اس کی چٹکی لے لی ہو۔ ”نہیں نہیں۔ میں تم سے کسی ریستوران میں نہیں ملنا چاہتا۔ وہاں بہت لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ہم اطمینان سے باتیں نہیں کر سکیں گے۔“

”اچھا“ —— میں نے کہا —— ”تو تم یہاں ہی آجاؤ۔ میں تمھارا انتظار کروں گا۔ کتنے بجے آؤ گے؟“

”جتنی دیر ٹیکسی کو چرچ گیٹ سے جوہو پہنچنے میں ٹائم لگے گا۔“

مَیں کہتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی چُنی بھائی ہے نہ کیم چھو۔

مگر وہ کہتا ہے —— "چنی بھائی۔ ٹاٹا ڈلیر ڈام رہ جا رہا ہے۔"

میں کہتا ہوں —— "جانے دو۔"

وہ گجراتی میں گالی دے کر کہتا ہے —— کیسے جانے دیں —— برٹش الیکٹرک کے سودے میں پہلے ہی گھاٹا کھا چکے ہیں۔" میں سمجھاتا ہوں کہ دیکھو بھائی میں چنی بھائی نہیں ہوں۔"

"اوہ!" —— ادھر سے آواز آتی ہے جیسے ایک دم ٹائر میں سے ہوا نکل گئی ہو —— "تم چینی بھائی نھتی چھو۔"

مَیں پوچھتا ہوں۔ "آپ کو کون نمبر چاہیئے۔"

وہ کہتا ہے۔ "ایٹ —— سیون —— ایٹ۔ ——سِکس —— سِکس ——۔"

مَیں کہتا ہوں —— "یہ تو ایٹ سِکس۔ ایٹ سیون، سیون ہے۔"

وہ کہتا ہے، ڈانٹ کر۔ "تو پہلے ہی کیوں نہیں بولتے رونگ نمبر ہے۔"

مَیں کہتا ہوں۔ "اچھا بھئی میرا ہی دوش ہے۔ اب شما کرو۔"

اور فون رکھ دیتا ہوں۔ اور نیند کو واپس بُلانے کے لیے بھیڑیں گننا شروع کر دیتا ہوں۔

اور پھر صبح اُٹھ کر تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا سِلسلہ ہی شروع ہو جاتا ہے۔

"آپ مجھے نہیں جانتے۔ آپ کے پُرانے وطن پانی پت کے قریب جو قصبہ ہے رلیوا ڑی وہاں سے آیا ہوں، فلم کمپنی میں ہیرو بننے . . ."

"مجھے آپ سے اپائنٹ منٹ چاہیئے۔ اپنی کہانیاں سُنانا چاہتا ہوں۔"

"اگلی اتوار کو ہماری انجمن کا سالانہ جلسہ اور مشاعرہ ہے آپ کو آنا ہی پڑے گا —— آپ کے نام کا اعلان پہلے ہی کر چکے ہیں . . ."

"پرچہ پریس میں رُکا پڑا ہے۔ صرف آپ کے مضمون کے انتظار میں . . ."

"دیکھیے۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ لیکن کیا آپ مجھے کرپا کر کے راجکپور کا ایڈریس دے سکتے ہیں؟"

کل سویرے کی بات ہے کہ یہی سِلسلہ چل رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ —— مَیں نے ہمت کر کے فون اُٹھایا۔

"ہیلو" —— مَیں نے کہا۔ حالانکہ ٹیلی فون کی ڈائرکٹری حکم دیتی ہے کہ "ہیلو" مت کہو۔

"ہیلو" دوسری طرف سے بڑے ہی یورپین انداز کی آواز آئی۔ مَیں سمجھا کوئی امریکن یا

واپسی کا ٹکٹ

انسان نے انسان کو ایذا پہنچانے کے لیے جو مختلف آلے اور طریقے اختیار کیے ہیں اُن میں سب سے زیادہ خطرناک ہے ٹیلی فون۔ "سانپ کے کاٹے کا منتر تو ہو سکتا ہے مگر ٹیلیفون کے مارے کو تو پانی بھی نہیں ملتا۔" مجھے تو رات بھر اس کمبخت کے ڈر سے نیند نہیں آتی کہ صبح سویرے نہ جانے کس کی منحوس آواز سنائی دے گی۔ دو ڈھائی بجے آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کی گھنٹیاں اور گھنٹے گھڑیال بیک وقت بجنے شروع ہو گئے۔ مندروں کے پیتل کے بڑے بڑے گھنٹے، پولیس کے تھانے کا گھڑیال، دروازے کی بجلی والی گھنٹیاں، سائیکلوں کی ٹرنگ ٹرنگ، فائر انجنوں کی کلینگ کلینگ۔ اور جب آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اس غیر وقت رات کو کس کا فون آیا ہے؟ ضرور ٹرنک کال ہو گی۔ پل بھر میں نہ جانے کتنے وہم دل دھڑکاتے ہیں۔ ایک دوست مدراس میں بیمار ہے۔ ایک رشتہ دار لندن اور بمبئی کے درمیان ہوائی جہاز میں ہے۔ بھتیجے کا میٹرک کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

میں فون اُٹھا کر کہتا ہوں۔ "ہلو"

دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے ——— "چمنی بھائی، کیم چھو؟"

	روپے	آنے	پائی
ویٹر کو انعام	۳	۸	۰
پھول اور چوٹی میں لگانے کا گجرا آشا کے لیے	۰	۸	۰
پھول والے کو بخشش	۰	۸	۰
منہوبے کے پان	۰	۸	۰
پان والے کو بخشش	۰	۸	۰
ٹیکسی آشا کے گھر تک	۲	۴	۰
ٹیکسی والے کو بخشش	۰	۱۲	۰
آشا کے نام خط، ڈاک سے	۰	۲	
سونے کی دوا، پوری بوتل	۲	۱۲	۰
بھکاری کو بخشش	۰	۱	۰
خرچ	۲۷	۱۵	۰
باقی	۰	۰	۰
کُل جمع	۲۷	۵	۰

	روپے	آنے	پائی
چائے	۰	۱	۰
بیڑی بنڈل	۰	۲	۰
ٹیلی فون آشا کو	۰	۲	۰
دو ٹکٹ سنیما - انارکلی	۲	۱۰	۰
چنے مونگ پھلی	۰	۴	۰
دو اسپیشل چائے	۰	۸	۰
ٹرام ٹکٹ	۰	۴	۰
بالوں میں لگانے کا گجرا	۰	۴	۰
رات کا کھانا	۰	۶	۰
باقی	۲۵	۱۰	۶
کُل جمع	۱۰۰	۰	۰

۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۶ء

آمدنی

اخباروں، ماہناموں اور کتابوں کی قیمت ردّی والے سے	۳	۷	۰
قیمت کرسی، میز اور پلنگ (چور بازار میں سیکنڈ ہینڈ فرنیچر کی دوکان سے)	۱۱	۸	۰
پُرانے کپڑوں کی بکری	۱۳	۰	۰
کُل جمع	۲۷	۱۵	۰

خرچ

ٹیلی فون آشا کو	۰	۲	۰
دو ٹکٹ سنیما - انارکلی	۴	۸	۰
ٹیکسی اپولو بندر تک	۲	۸	۰
ڈنر (دو کے لیے)	۱۰	۸	۰

	روپے	آنے	پائی
ریل کا ٹکٹ	۵	۴	۰
دوپہر کا کھانا	۰	۱۰	۰
چائے	۰	۶	۰
سیکنڈ ہینڈ کتابیں (رات کی رانی، چاندنی)	۱	۴	۰
دو ٹکٹ سنیما (انارکلی)	۲	۱۰	۰
دو کوکا کولا	۰	۸	۰
بس کا کرایہ	۰	۸	۰
سگریٹ (چارمینار)	۰	۳	۰
باقی	۹۱	۹	۰
کُل جمع	۱۰۵	۰	۰

۲۴؍ اکتوبر ۱۹۴۶ء

آمدنی

شیر خاں پٹھان سے نیا اُدھار	۱۰۰	۰	۰

خرچ

پٹھان کو ماہوار سُود پیشگی پورے قرض پر	۴۰	۰	۰
ماں کے نام پر منی آرڈر	۲۵	۰	۰
منی آرڈر فیس	۰	۶	۰
اخبار ٹائمز آف انڈیا	۰	۲	۹
رائٹنگ پیڈ اور لفافے	۰	۱۲	۰
ٹکٹ ڈاک (نوکری کے لیے بیس درخواستوں پر)	۲	۸	۰
ناشتہ اور دوپہر کا کھانا	۰	۸	۰
بس، امپلائمنٹ ایکسچینج تک	۰	۴	۰
ٹرام امپلائمنٹ ایکسچینج سے واپسی پر	۰	۲	۰
لینڈنگ لائبریری سے کتاب کا کرایہ (مجھے خرید لو)	۰	۳	۰

	روپے	آنے	پائی
کتابیں (اندھا پریم، جوانی کی رات، حسینوں کی پریاں)	۴	۱۰	.
ٹیلی فون (آشا کو)	.	۲	.
دو ٹکٹ سینما (انارکلی)	۲	۱۰	.
آئس کریم	۱	۸	.
ہوٹل کے بیرے کو انعام	.	۴	.
ٹیکسی گرانٹ روڈ سے ملبار ہل تک	۱	۱۲	.
ڈنر (دو کے لیے)	۴	۸	.
پھول اور چوٹی میں لگانے کا گجرا آشا کے لیے	-	۸	.
ٹیکسی ملبار ہل سے آشا کے گھر تک	۳	۸	.
بس کا کرایہ	.	۸	.
سیاہی کی بوتل	.	۱۲	.
کیلنڈر	.	۶	.
باقی	۱۴	۱۲	.
جملہ	۸۵	.	.

۳ر جون سنہ ۱۹۴۶ء

آمدنی

	روپے	آنے	پائی
دفتر سے نوٹس کے مہینے کی تنخواہ	۱۰۵	..	.

خرچ

	روپے	آنے	پائی
کمرے کا کرایہ	۲۵	.	.
بجلی اور تیل	۳	۸	.
دھوبی چودہ کپڑے	۱	۱۲	.
پٹھان کے قرض کا سود	۳۰	.	.
اخبار والا	۱۰	۱۲	.
ٹرام کا کرایہ	.	۲	.

	روپے	آنے	پائی
امپلائمنٹ ایکسچینج سے امریکن آئل کمپنی کے دفتر تک ٹیکسی	۱	۲	۰
چپراسی کو بخشش	۱	۰	۰
ہیڈ کلرک کو بھینٹ	۱۰	۰	۰
سگریٹ پیکٹ کیپسٹن	۰	۱۰	۰
ناولٹی سنیما تک بس کا کرایہ	۰	۳	۰
سنیما کا ٹکٹ (انارکلی)	۱	۵	۰
انٹرول میں آئس کریم (دو)	۱	۸	۰
دو بس ٹکٹ ریل تک	۰	۸	۰
پھول اور چوٹی میں لگانے کا گجرا	۰	۸	۰
رات کا کھانا	۱	۴	۰
باقی	۶	۰	۰
جملہ	۲۰۹	۴	۰

پہلی مارچ ۱۹۴۶ء

آمدنی

	روپے	آنے	پائی
دفتر سے بیس دن کی تنخواہ	۸۵	۰۰	۰

خرچ

	روپے	آنے	پائی
کمرے کا کرایہ	۲۵	۰	۰
بجلی اور نل	۳	۸	۰
ریل کا پاس	۵	۴	۰
دھوبی پچیس کپڑے	۳	۲	۰
اخبار والا (اسکرین، ٹائمز، امایا، فلم فیئر)	۷	۲	۰
حجام: بال کٹائی، شیو، شیمپو اور فیس مساج	۱	۱۲	۰
حجام کو انعام	۰	۴	۰
پوری بھاجی	۰	۸	۰

	روپے	آنے	پائی
ریل کا ٹکٹ، لکھنؤ سے بمبئی انٹر کلاس	۵۵	.	.
قلی	.	۸	.
ریلوے بک اسٹال سے کتابیں (فلمی پریوں کی کہانیاں، دردِ دل، پریم دیوانی)			
راستے میں پڑھنے کے لیے ہفتہ وار پرچے :- (اسکرین، فلم فیئر، مایا، مستانہ جوگی، منوہر کہانیاں، اردن)	۱۰	۱۰	.
چائے اور کیک	۲	.	.
سگریٹ کا ڈبہ (گولڈ فلیک)	.	۱۰	.
جھانسی میں رات کا کھانا اپنے اور ساتھ سفر کرنے والی لڑکی کے لیے	۳	۲	.
باقی	۳	۱۲	.
	۱۷٦	۴	.
جملہ	۵۰۰		

۴ر فروری ۱۹۴۶ء

آمدنی

گھر سے آئے ہوئے روپیوں میں سے باقی	۹	۴	.
شیر خان پٹھان سے قرض	۲۰۰	-	.
کُل مج	۲۰۹	۴	.

خرچ

شیر خاں پٹھان کو مہینے بھر کا سود پیشگی	۳۰	.	.
ہوٹل کا باقی کرایہ	۲۵	.	.
[illegible]	۱۰۰	.	.
[illegible]	۴۰	.	.
[illegible]	.	۴	.

اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اُٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بُخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو ذیلدار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا ——— "ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے۔ آج تمھیں کون کھانا دے گا ———" چندا بابلیں کمرے میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

"بے چارہ پاگل ہو گیا ہے" کالو زمین دار نے سر ہلا کر کہا۔ "صبح کو شفاخانہ والوں کو پتہ دے دیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی پر چارا بابلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

تھی۔ بکریوں کا دودھ دھو کر پیا اور حقہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اُتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا، ایک گھڑونچی لاکر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دیکھا دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

"اری آنکھ پھوڑے گی ـــ" اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا۔ اور گھڑونچی پر سے اُتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا، لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آجاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اُڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آرہا تھا کہ چند بچے سڑک پر کنڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا ـــ "ارے میں کوئی مارتا تھوڑا ہی ہوں ـــ" آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

اندر آکر کواڑ بند کیے اور چراغ جلا کر اُجالا کیا۔ حسبِ معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کر کے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دیے ـــ "ارے او بندو۔ ارے او نورو" پکارا مگر وہ نہ نکلے۔ گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دیے سہمے بیٹھے تھے۔ عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا۔ اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کر کے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں مگر اس نے پروا نہ کی

آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا نتھو، دوسرے کو چھدو۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا ——— ”کیوں بے نتھو، تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورے کرے گا۔ اور ابے چھدو تیری بھی شامت آئی ہے کیا؟“ اور پھر ان غریبوں کی شامت آ ہی جاتی سوت کی رسّی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو وہاں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اُتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک ہے، بیوی کو ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بے ہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کے بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بے چارے کیا کر سکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو ادھ موئی ہو گئی تھی۔ چالیس برس کی عمر میں ساٹھ سال کی معلوم ہوتی تھی۔ بچے جب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا ——— ”ہلاس پور کی طرف جاؤ ذرا نورو کو لیتے آنا ——— “ بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہو گیا ——— ”میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ تو کبھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔“

بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا اور بھائی کے پاس رہنے لگا۔ رحیم خاں کو غصہ اُتارنے کے لیے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا۔ اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایہ کی عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لیے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لیے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لیے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلافِ معمول خاموشی سے بات سُنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دُم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا چولہے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پیے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ

ابابیل

اُس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اُس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اُس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن رامو لُہار کے بچے نے اس کے بیل کی دُم میں کانٹے باندھ دیئے تھے تو مارتے مارتے اس کو اَدھ مُوا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہولہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کم بخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچّوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا ——— ”ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچّوں کو مارتا ہے ———“ بس اُس غریب کی وہ دُرگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیئے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اُس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے

بڑی حد تک خواجہ احمد عباس نے ہمیشہ قائم رکھا ہے۔ ایک زمانے میں قصے بھی بے حد مقبول تھے۔ لوگ اُن کی سادگیٔ بیان اور مقصدیت پر کبھی معترض نہیں ہوتے تھے۔ قدیم قصوں کے ذخائر ہمارے یہاں کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ انتظار حسین تو کتھا سرت ساگر کو آج بھی ادبیات، علم اور فلسفے کی ایک بڑی کتاب مانتے ہیں لیکن جدید تنقید نے تخلیقی کام کرنے والوں کے فکر و نظر کا مرحلہ وار جائزہ لینے کے بجائے ایک محاکماتی طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ انھوں نے خاردار تاروں کی حد بندیاں بھی قائم کر لی ہیں، جن کے پار جانے والوں کو گولی تک مار دینے سے نہیں چوکتے لیکن خواجہ احمد عباس نے ایسی انفرادی یا ادبی تنقیدوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے معترضین کے کہنے کے مطابق خود بھی اپنے آپ کو پروپیگنڈہ نگار کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے اُن کی جھلاہٹ سے زیادہ ایک قابل اعتماد خود اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا اس پر عمل بھی کیا۔ اس لیے عمل کیا کہ وہ لکھے ہوئے لفظ کی اہمیت سے واقف تھے۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ پوری طرح کومٹڈ (COMMITTED) بھی رہے۔

یہ سطور لکھنے سے پہلے میں نے ان کی کئی کہانیوں کو سامنے رکھ لیا تھا۔۔۔ خاص طور پر "ابابیل" "رُوپہلے آنے پائی" "واپسی کا ٹکٹ" "آئینہ خانے میں" "بھولی" "اجنتا" "دیوالی کے تین دیئے" "بنارس کا ٹھگ"، ماں کا دل، بارہ گھنٹے، شکر اللہ کا وغیرہ۔ میں چاہتا تھا کہ اُن کی لکھی ہوئی تین سو سے زائد کہانیوں میں سے درجن ڈیڑھ درجن کہانیوں پر اظہار خیال کروں گا۔ لیکن عباس صاحب پر قلم اٹھاتے ہی اُن کی شخصیت کے کئی دوسرے پہلو ایک کے بعد ایک سامنے آتے چلے گئے اور اصل کام پس پشت پڑ گیا لیکن اتنا اطمینان ہے کہ اگر میں اُن کے مجموعی رویے کو پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو ان کے اچھے اور بہت اچھے افسانے اپنا ڈائیلاگ خود ہی پڑھنے والوں سے کر لیں گے۔ تخلیق اور قاری کا رشتہ اس رشتے سے زیادہ مقدم اور مضبوط ہوتا ہے جو کسی فنکار کی شہرت کے ہالے کی بنا پر استوار ہو جائے۔ میں اسی اول الذکر رشتے کی اہمیت پر زور دوں گا کیونکہ ازل سے اب تک یہی ہوتا آیا ہے کہ کہانی زندہ رہ گئی ہے لیکن کہانی کار صفحۂ ہستی سے گم ہوتا چلا گیا ہے۔

رام لعل (لکھنؤ)

بڑے جلسہ میں سنایا تو اردو مخالف کچھ ہندی کے اہم ادیب واک آؤٹ کر گئے جن کے ساتھ سجاد ظہیر اور میں نے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اس جلسہ میں اُردو کے بارے میں کوئی پروپیگنڈہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ان دنوں لکھنؤ میں اُردو کا اشو لے کر بڑا ایجیٹیشن چل رہا تھا۔ اُردو محافظ دستہ والے اسمبلی کے سامنے بھوک ہڑتال کیے ہوئے تھے۔ ہندی کے حامیوں نے اخبارات میں اُردو کے خلاف بیانات کی بھرمار کر رکھی تھی اور جس جلسہ کا انعقاد میری کنوینر شپ میں کیا گیا تھا اس کا مقصد یوپی و بہار کی خشک سالی کے لیے فنڈ جمع کرنا تھا۔ اس جلسے کی مجلس استقبالیہ میں ہندی کے بڑے بڑے ادیبوں کو شریک کیا گیا تھا اور اس میں شرکت کرنے کے لئے بمبئی، الہ آباد اور حیدر آباد سے کرشن چندر، ساحر لدھیانوی، فراق، مخدوم محی الدین وغیرہ بطور خاص آئے تھے۔ عباس صاحب کی کہانی بعنوان ”اُردو“ کے نتائج کے پیش نظر سجاد ظہیر صاحب نے مجھ سے کہا— یہ کہانی وہ دہلی اور لکھنؤ کے درمیان کار میں بیٹھے بیٹھے لکھتے آئے تھے جسے وہ ہمیں سنا بھی نہیں سکے تھے۔

خواجہ احمد عباس کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ وہ کیمونسٹ تھے۔ میرے خیال میں وہ اس ترقی پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو نہ کبھی کیمونسٹ بنے نہ کیمونسٹ مخالف۔ ان کے افسانے، فلموں کے لیے لکھی گئی کہانیاں اور صحافتی نوٹس جو عرصۂ دراز تک بلٹز ویکلی (انگریزی، ہندی اور اُردو) کے آخری صفحے پر چھپتے رہتے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ نہرو وادی سوشلسٹ تھے۔ عوام کے معیارِ زندگی کو اُوپر اُٹھانے کے حامی تھے۔ قومی یکجہتی کے بہت زبردست مبلغ تھے اور لسانی یکجہتی کے لئے کسی بھی ہندوستانی زبان سے رتی بھر بیزاری برداشت نہیں کر سکتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ پکے قوم پرست اور محبِ وطن تھے۔ انھوں نے یوں تو ہر ذرائع ابلاغ عامہ سے کام لیا اور اپنا جھنڈا گاڑا لیکن افسانہ نگاری ہی اُن کا فطری میدان تھا۔ انھوں نے عرصۂ پچاس سال میں بیشمار کہانیاں لکھیں۔ اُن کی کہانیوں کے کئی مجموعے اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہوئے۔ جب کوئی ادیب و دانشور اتنے سارے میدانوں میں بیک وقت گھوڑے دوڑاتا ہے تو وہ مشہور تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی صحیح قدر و قیمت کو تعین کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک خاص سبب قاری کا اپنا تعصب بھی ہے کیونکہ وہ اپنے پسندیدہ ادیب کو اپنے ہی بنائے ہوئے فریم کے اندر دیکھنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر عباس صاحب بلٹز کے آخری صفحے کے کالم نگار تھے تو اُن کے بعض مداحوں کو ان کے افسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ اُن کی فلموں میں رس لے سکتے تھے۔ اسی طرح جو قاری ان کے افسانوں کا مداح ہے، اس نے خواجہ احمد عباس کی کالم نگاری یا فلم نگاری کو ہمیشہ دوسرے درجے کی چیز سمجھا ہے۔ بعض قارئین نے تو اُن پر پروپگنڈسٹ ہونے کا بھی الزام عاید کیا کیونکہ اُن کا طرز بیان بے حد سادا موضوع کا انتخاب یک طرفہ اور لب و لہجہ کچھ زیادہ ہی لاؤڈ (LOUD) تھا۔

اُردو افسانہ نگاری نے جس قصہ گوئی اور مقصدیت کے بطن سے جنم لیا ہے۔ اس کی روایت کو کافی

انقلابی کی کہانی تھی۔ جو برسوں بعد جیل سے چھوٹ کر آتا ہے اور ایک دوست کے گھر شب بھر کے لیے قیام کرتا ہے۔ جب سے وہ قید ہوا تھا عورت کی قربت سے محروم رہا تھا۔ اس کے گھر میں ایک خاتون کی موجودگی اس کے اندر ایک ہیجان سا برپا کردیتی ہے اور وہ رات بھر کمرے میں بڑی بے چینی سے ٹہلتا رہتا ہے۔ اس کے اندرونی اضطراب سے وہ خاتون بھی باخبر ہے اور بالآخر ایک قربانی کے جذبہ کے تحت اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیتی ہے۔ رسالہ "ادبی دنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد نے کمیونسٹوں کے اس انفرادی نظریہ پر بہت سخت تنقید کی تھی۔

"سردار جی" کہانی میں سکھوں کے خلاف سماجی تعصبات کی نفی کے لئے ایک انوکھا پلاٹ وضع کیا گیا تھا۔ آزادی کے فسادات میں سکھوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ ایک ہندوستانی تعلیم گاہ کے کچھ مسلمان لڑکے اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے آپس میں سکھوں کے بارے میں عام طور پر مشہور لطیفوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ ان کے نشانے کی زد میں مغربی پنجاب سے آیا ہوا ایک بزرگ سکھ بھی ہے۔ لیکن کہانی کے خاتمہ پر جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی جان بچائی ہے تو اُن کے اندر کا سارا زہر ختم ہوجاتا ہے۔

جب یہ افسانہ اُردو میں چھپا تو کسی سکھ نے اس کا نوٹس نہیں لیا لیکن جب یہ الٰہ آباد کے ہندی رسالہ "مایا" میں چھاپا گیا تو سکھوں نے بڑا واویلا مچایا۔ بات عدالتی کارروائی تک جا پہنچی جس کی پیروی کے لئے خواجہ احمد عباس لکھنؤ تک آئے تو انھیں اس وقت کی گورنر مسز سروجنی نائیڈو نے بلا بھیجا جو خود بھی انگریزی کی ایک بین الاقوامی شہرت کی شاعرہ تھیں۔ انھوں نے عباس صاحب کو ایسی کہانی لکھنے پر سخت سست کہا۔ انہی کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہوا اور عباس صاحب نے اس کہانی کا اصل عنوان "سردار جی" بدل کر "میری موت" رکھ دیا تھا جو اس کے موضوع کے اعتبار سے زیادہ مناسب اور SUGGESTIVE تھا۔

خواجہ صاحب اچانک کسی تخلیقی لمحے کی گرفت میں آجاتے تو نازک ترین موضوع کو بھی ضبط تحریر میں لائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں قریبی دوستوں تک سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی بھی ایسی ہی کیفیت میں بار بار مبتلا ہوتے رہے تھے۔ عباس صاحب نے ۱۹۶۷ء میں سفر کے دوران کار میں بیٹھے بیٹھے ایک کہانی لکھی ـــ "اُردو"۔ جس میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد ایک بے سہارا فاحشہ لڑکی کا قصہ بیان کیا جسے نہ پاکستان اپنے یہاں پناہ دینے کے لیے تیار ہوتا ہے نہ ہندوستان۔ وہ بیچاری کئی ماہ کی کشمکش سے بالکل چور ہو کر ایک دن ہند و پاک سرحد پر بے دم ہو کر گر ٹ ے۔ دونوں طرف کے فوجی جب اس کا نام دریافت کرتے ہیں تو اس کے ہونٹوں سے آخری الفاظ

"اُردو ش ۱۰۰"

کا المیہ بیان کیا گیا ہے لیکن اُسے جب انھوں نے لکھنؤ کے ایک

احمد عباس، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، سہیل عظیم آبادی، مرزا ادیب، شیر محمد اختر، اختر حسین رائے پوری، غلام عباس، ابوالفضل صدیقی اور کئی دوسرے تھے۔ اتنی بات بتانے کا مقصد یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے سامنے یہ حقیقت بھی آ جائے کہ میرا تعلق ہم عصر اردو افسانے کے مطالعے سے ۱۹۳۸ء کے بعد سے قائم ہوتا ہے۔ چونکہ میں نے ابھی خود لکھنے کا آغاز نہیں کیا تھا اور میرے پیش رو لکھنے والوں کی تخلیقات ہی میری رہنما بن رہی تھیں۔ اس لیے قدرتی طور پر ان سب یا اُن میں سے بیشتر کے ساتھ میری جذباتی وابستگی پیدا ہو جانا بھی اغلب تھا۔ سینما یا دوسری تفریحات سے پیسے بچا بچا کر ادبی رسالے اور کتابیں خرید لانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ بھی درج کرنا چاہتا ہوں۔

اُن دنوں لاہور میں میرا قیام قلعہ گوجر سنگھ کے ایک کمرے کے مکان میں تھا جس میں میرے ساتھ ایک اور لڑکا بھی رہتا تھا جو مکان کا آدھا کرایہ دو روپے ادا کیا کرتا تھا۔ میرے لوکل گارجین ملک وزیر چند کو فلاش کھیلنے کا بڑا شوق تھا اور وہ کبھی کبھار اپنے ہم مشربوں کو میرے کمرے میں ہی لے آتے اور جوئے کی محفل گھنٹوں جمائے رہتے تھے۔

ایک روز میں بھی بالکل اچانک اس میں شریک ہو گیا۔ اگرچہ میں نے جُوا کبھی نہیں کھیلا تھا لیکن تاش کھیلنا جانتا تھا۔ اُس دن اتفاق سے میرے پاس جو پتے آئے ان میں بادشاہ بیگم اور غلام تھے۔ میں نے چونی چونی کر کے دو چار داؤں لگائے اور جب دیکھا کہ سامنے کافی ریزگاری جمع ہو گئی ہے تو شو کرنے کے لیے کہہ دیا۔ ظاہر ہے بازی میرے ہاتھ ہی لگی لیکن میں نے سارے پیسے سمیٹ کر خود کو فوراً الگ بھی کر لیا۔ ریزگاری گنی تو کل ملا کر ایک روپیہ چودہ آنے تھے لیکن میں خوش تھا کہ سرکلر روڈ پر جا کر خواجہ احمد عباس کی نو نئی کہانیوں کا مجموعہ خرید سکتا تھا جس کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے تھی۔ یہ میرا پہلا اور آخری جُوا تھا۔

آزادی کے بعد خواجہ احمد عباس کا ایک افسانہ "میجر رفیق مارا گیا" میری خاص توجہ کا مرکز بن گیا، اس لیے کہ کشمیر کے محاذ پر ہوئی پہلی ہند و پاک جنگ کے بارے میں کسی ہندوستانی مسلمان مصنف کی پہلی ادبی تحریر تھی جو دو قومی نظریے کے مقابلے میں ایک سیکولر نقطۂ نظر کو پیش کرتی تھی۔ میجر رفیق ہندوستانی افواج کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا جو افسانوی سطح پر تو ایک تخلیقی کردار تھا لیکن اس نے ہندوستانی سیاسیات کو واضح کر دیا تھا کہ قومیں صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں بنیں بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی شناخت قائم کرتی ہیں۔ اردو ادب میں آزادی کے بعد سیکولر نظریات پر مبنی پہلا افسانہ تھا جو خواجہ احمد عباس نے تحریر کیا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو افسانہ کسی آزمائش کے بغیر ہمیشہ سے سیکولر رہا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ہمیشہ تمام انسان ہی کے احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق کسی بھی فرقے یا مذہب سے رہا ہو۔ اس نے پڑھنے والوں کو ہمیشہ متاثر کیا ہے۔

کچھ عرصہ بعد ان کی دو کہانیوں کا بہت چرچا ہوا۔ "بارہ گھنٹے" اور "سردار جی"۔ یوں تو "بارہ گھنٹے" ایک

۱۴۵
۱۵۵
۱۷۱
۱۸۵
۱۹۵

۱۹ء
پتھر کی سیج پر ایک ہزار راتیں ۲۱۵

عرضِ مرتب

۔ کہتے ہیں، پریم چند کے زمانہ میں بھی افسانہ نگاروں کی خاصی بھیڑ تھی۔ میرے سامنے اس دور کے رسالے نہیں ہیں۔ محققین نے بھی اس سلسلہ میں کوئی ترتیبِ فہرست سازی نہیں کی ہے۔ کی ہو تو وہ میری نظروں سے نہیں گزری۔ نقادوں نے اپنے مضامین میں جو نام اکثر لئے ہیں، ان میں ڈپٹی نذیر احمد، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، ل۔ احمد۔ اکبرآبادی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سدرشن وغیرہ شامل ہیں۔ میں نے ان سب کو نہیں پڑھا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں الف آم، ب بلی، ت توتا، ٹ ٹوپی وغیرہ سے ذرا آگے نکل کر ٹھہر گئے دونوں جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا جیسی نظموں کے سحر میں گرفتار تھا۔ جب کرائے پر نثری کتابیں لاکر پڑھنے کا خیال ہوا تو حاتم طائی کی آسان کہانیاں، الہ دین کا چراغ، عمر عیار کی عیاریاں اور کچھ جاسوسی ناول اور پریم چند، ایم اسلم راشد الخیری۔ کے ساتھ ساتھ ٹیگور اور سرت چندر چٹرجی کی بنگالی کہانیوں کے مجموعے میرے ہاتھ لگے۔ اور اس کے فوراً بعد جب میں ہائی اسکول پاس کرکے اپنے ضلعی ماحول سے نکلا اور لاہور جا پہنچا تو مجھے ادبی دنیا، ادبِ لطیف، شاہکار، ساقی وغیرہ رسائل پڑھنے کا چسکا لگ گیا۔

چسکا کوئی بھی ہو برا ہوتا ہے لیکن جسے لگ جاتا ہے وہ اُسے اچھا ہی سمجھتا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ جدید ہائی کہانیاں لکھنے والوں کی ایک بھیڑ دیکھی جن کی تحریریں ماہ بہ ماہ سامنے آجاتی تھیں۔ ان میں حیات اللہ انصاری، فضل محمود، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، خواجہ

ماں کا دل ۱۴۵
آج کے لیلیٰ مجنوں ۱۵۵
دل ہی تو ہے ۱۷۱
بارہ گھنٹے ۱۸۵
الف لیلہ ۱۹۸۰ء ۱۹۵
یعنی پتھر کی سیج پر ایک ہزار راتیں
شکر اللہ کا ۲۱۵

ترتیب

عرضِ مرتب ـــــــــــ ۷

ابابیل ۱۲
روپے آنے پائی ۱۶
واپسی کا ٹکٹ ۲۳
اجنتا ۴۱
بھولی ۶۴
آئینہ خانے میں ۷۴
دیوالی کے تین دیے ۸۳
بنارس کا ٹھگ ۹۲
میری موت ۱۰۸
سلمہ اور سمندر ۱۱۹

(جملہ حقوق بحقِ مرتب محفوظ)

قیمت : پچھتر روپے ۷۵/-
نقشِ اوّل : ۱۹۸۸ء
تعداد : ایک ہزار
طباعت . لکشمی پریس، نئی دہلی ۲

ناشر : نریندر ناتھ سوز
سیمانت پرکاشن
۹۲۲ کوچہ روہیلا، تراہا بہرام
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

KHWAJA AHMED ABBAS KE MUNTKHIB AFSANE

Compiled By · RAM LALL
SELECTED STORIES Rs. 75.00
1987

SEEMANT FRAKASHAN
922, KUCHA ROHELLA KHAN
DARYAGANJ, NEW DELHI-110002

خواجہ احمد عبّاس

کے

مُنتخب افسانے

مُرتبہ

رام لعل

سیمانت پرکاشن
دریا گنج، نئی دھلی ۱۱۰۰۰۲

خَواجَہ اَحمَد عَبّاس کے مُنتَخَب اَفسانے

مُرَتبہ . رَام لَعل